ویانا بین الاقوامی مسیحی و اسلامی گول میز مذاکرات 4

زیرادارات

اندریاس بشتیہ – طاہر محمود

تعلیم برائے مساوات

ناانصافی اور عدم رواداری کا سدباب

اس سلسلہ کی دیگر مطبوعات

امن برائے انسانیت: اصول، مسائل، تناظرات مستقبل
(مقالات ومباحث بین الاقوامی مسیحی، اسلامی کانفرنس اول، آسٹریا، ۱۹۹۳ء) لاہور، ۱۹۹۷ء

ایک دنیا سب کے لیے: سیاسی، سماجی وثقافتی تعدد کی بنیادیں
(مقالات ومباحث بین الاقوامی مسیحی واسلامی کانفرنس دوئم، آسٹریا، ۱۹۹۷ء) لاہور ۲۰۰۳ء

اشارات وقت کا شعور: عیسائیوں اور مسلمانوں کے لیے عصری چیلنج
(مقالات ومباحث: ویانا مسیحی واسلامی گول میز مذاکرات اول، آسٹریا، ۲۰۰۰ء) نئی دہلی، ۲۰۰۴ء

غیر رواداری اور تشدد: اظہارات، وجوہات، نظریات
(مقالات ومباحث: ویانا مسیحی واسلامی گول میز مذاکرات دوئم، آسٹریا، ۲۰۰۲ء) نئی دہلی، ۲۰۰۴ء

غربت اور ناانصافی: عالمی معاشرے میں شدید بحران کے اشارات
(مقالات ومباحث: ویانا مسیحی واسلامی گول میز مذاکرات سوئم، آسٹریا، ۲۰۰۴ء) نئی دہلی، ۲۰۰۶ء

مدیران : اندریاس بشتیہ – طاہر محمود

تعلیم برائے مساوات

ناانصافی اور عدم رواداری کا سدباب

اردو ترجمہ زیر نگرانی
پروفیسر خواجہ عبدالمنتقم

ویانا بین الاقوامی مسیحی واسلامی گول میز مذاکرات چہارم
29 جون تا 2 جولائی 2006ء (موڈلنگ)

یہ کتاب پہلے جرمن، انگریزی اور عربی میں شائع ہو چکی ہے

جملہ حقوق محفوظ©2008 پروفیسر طاہر محمود

اردو ترجمہ شائع کردہ:

ایم۔آر۔ پبلی کیشنز

3871، چوتھی منزل، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی۔۲

1645، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔۲

Cell: 9810784549, 9211532140 E-mail: abdus26@hotmail.com

طباعت: نیو انڈیا آفسیٹ پریس، دہلی

مشمولات

	پیش لفظ	پروفیسر طاہر محمود	7
۱۔	ناخواندگی اور بنیادی تعلیم تک رسائی سوالات و مداخلات	صالحہ ایس محمود	10
۲۔	یورپی یونین کے اسکولوں میں مذہبی اقدار میں ارتباط سوالات و مداخلات	رچرڈ پوٹز	30
۳۔	مذہبی کتابوں اور جدید قوانین میں تعلیم کا حق سوالات و مداخلات	طاہر محمود	49
۴۔	عیسائیت اور اسلام میں تبلیغ اور تعلیم: ایک قدیم تصور سوالات و مداخلات	جارج خضر	74
۵۔	تعلیم اور ذکور و اناث سوالات و مداخلات	عائشہ بیلا ربی	94
۶۔	وسطی ایشیا میں مذہبی تعلیم سوالات و مداخلات	گوگا ابراروش خیدیاطوف	137

۷۔ مذہبی تعلیم اور تشخص سوالات و مداخلات	محمد مجتہد شبستری	152
۸۔ انصاف کی تعلیم کا حصول سوالات و مداخلات	انگیبورگ گیبریل	164
۹۔ انسانی حقوق کی تعلیم سوالات و مداخلات	ارمگارڈ ماربو	186
۱۰۔ مذہبی کثرت الوجود کے تناظر میں تعلیم سوالات و مداخلات	عادل تھیوڈورخوری	214
۱۱۔ بنیاد پرستی پر قابو پانے کے لئے تعلیم سوالات و مداخلات	ناصرہ اقبال	238
۱۲۔ گول میز کانفرنس کے شرکاء		262

پیش لفظ

نئی صدی کے آغاز سے ہی دنیا کے حالات اور آئندہ رونما ہونے والے واقعات نے ''ویانا بین الاقوامی مسیحی و اسلامی گول میز مذاکرات'' کو جلا بخشی ہے۔ مستقبل میں انسانی برادری کو درپیش آنے والے چار بڑے مسائل - عدم رواداری، تشدد، غربت اور ناانصافی- کی شناخت کر لینے کے بعد ہم نے اپنے چوتھے اجلاس میں ''تعلیم برائے مساوات: ناانصافی اور عدم رواداری کا سدباب'' موضوع کو زیر بحث لانے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ عالمی پیمانے پر بڑی سماجی ناانصافی کا جواب تعلیم ہی ہوگا، خصوصی طور پر آج کی دنیا میں پائی جانے والی جنسی تفریق کے تناظر میں۔

لہٰذا گول میز کے تمام شرکاء نے اپنے انفرادی نظریات اور مختلف تجربات کی روشنی میں تعلیمی میدان کے اہم مسائل کا جواب دینے کی کوشش کی۔ اس وسیع پروگرام نے ان تمام امور کا احاطہ کیا جو ہماری مشترکہ حساسیت کے جذبے کو فروغ دینے کی کوشش کے لیے اور ساتھ ہی مشترکہ چیلنجز کا سامنا کرنے کی فضا قائم کرنے کے لیے خاص اہمیت کے حامل تھے تاکہ امن اور انصاف کے پرچم تلے ایک نئے عالمی نظام کی راہ ہموار کی جا سکے۔ وہ تمام اہم امور کو جن موضوعات کے تحت زیر بحث لایا گیا وہ ہیں مذہبی کثرت الوجود کے تناظر میں تعلیم، مذہبی کتابوں اور جدید قوانین میں تعلیم کا حق، ناخواندگی اور بنیادی تعلیم تک رسائی، تعلیم اور ذکور و اناث، مذہبی تعلیم اور تشخص، عیسائیت اور اسلام میں تبلیغ اور تعلیم، یورپی یونین کے اسکولوں میں مذہبی اقدار میں ارتباط، وسطی ایشیا میں مذہبی تعلیم، انصاف کی تعلیم کا حصول، انسانی حقوق کی تعلیم، اور بنیاد پرستی سے نجات حاصل کرنے کی تعلیم۔ ان تمام موضوعات پر تفصیلی بحث ہوئی، بہت سی تجاویز اور جدید نظریات سامنے آئے اور وہ نتائج اخذ کئے گئے جن کی بنیاد پر حالات کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

ایک پرعزم قدم مزید آگے بڑھانے کے لیے اس بار گول میز کانفرنس کے شرکاء کو اس بات کی

دعوت دی گئی کہ وہ اپنے ملک کے طلبا کو بھی ساتھ لائیں تا کہ اگلی نسل صحیح وقت پر کماحقہٗ وہ کام انجام دے سکے جو ہم ویانا کے مشترکہ مذاکرات کے ذریعے کئی برسوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ یونیورسٹی آف ویانا نے بھی ہمارے اس خیال کی پذیرائی کی اور جزوی طور پر اس کی حمایت آسٹریا کی وزارت برائے سائنس اور تحقیق نے بھی کی اور 'وِسیروٹا سمر اسکول 2006' عنوان کے تحت حتمی طور پر ایک رہنما منصوبہ تیار کیا گیا۔ یونیورسٹی آف ویانا میں وائس ریکٹر ڈاکٹر آرتھر مینگر کے ذریعے وسیروٹا پروفیسران اور طلبا کے لیے ایک استقبالیہ کا انتظام کیا گیا۔ لہٰذا اس یونیورسٹی کی دیکھ ریکھ میں آئندہ برسوں میں ہماری مشترکہ گفتگو کی پیش قدمی کو جاری رکھنے کے لیے دروازے کھول دیے گئے۔

اس نئی صدی کے آغاز میں ہم جس چیز کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور جو کہ نا قابل تبدیل انداز میں اور نا قابل مزاحمت طور پر مسلسل جاری ہے، وہ ہے اس کرۂ ارض پر رہنے والے بے شمار افراد کے لیے زندہ رہنے کے مشترکہ مقام کی طرف گامزن ایک نامعلوم عالمی منظرنامہ، جس کی شناخت عام طور پر 'عالم کاری' (globalization) جیسی پرکشش اصطلاح کے ذریعے کی جاتی ہے۔ یہ یقینی بنانے کے لیے کہ مختلف علاقوں میں انسان کلچر اور مفاد کے تئیں تکنیکی اور جسمانی طور پر ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں جو کہ امن وسلامتی اور خوش حالی کی صورت میں ہی ممکن ہوتا ہے، ہمیں فوری طور پر ایسی ذہنیت کی ضرورت ہے جو تمام ممالک اور کرۂ ارض کے تمام لوگوں کے دل و دماغ میں مثبت تبدیلی لائے۔ ذہنی قربت کے بغیر، یعنی باہمی احترام اور سمجھ بوجھ، امداد وتعاون کے بغیر جسمانی قربت بے انتہا کشیدگی اور جھگڑے فساد کی شکل میں سامنے آئے گی جس کی وجہ سے عالمی پیمانے پر تنازعات پیدا ہوں گے۔ بالفاظ دیگر، عالم کاری کے عمل کو انسان کے حق میں بہتر بنانے کے لیے ہمیں تمام چیزوں سے اوپر اٹھ کر ایک ایسے مذاکرہ کی ضرورت ہے جو حصہ داری پر مبنی ہو، یعنی عالمی پیمانے پر مذاکرات کا ایک ایسا عمل جو تہذیبوں اور مذاہب، افراد و گروہ، متعدد سماجی اور مفاداتی طبقات وغیرہ کے درمیان ہر سطح پر ہو، جس کے بغیر باہمی قربت کی امید کرنا ایک خواب و خیال ہوگا۔ اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہمیں باہمی گفت وشنید کا ایک ایسا ماحول بنانا ہوگا جو گفت وشنید کو محض دانشوری اور تعلیم

کا ایک عمل نہ ثابت کرتا ہو بلکہ جو مستقبل میں انسانوں کے وجود کے لیے اہمیت کا حامل ہو۔

گول میز کانفرنس کے اس چوتھے اجلاس میں ہم ایک بار پھر اس دنیا میں امید کی ایک شمع روشن کرنا چاہتے ہیں جہاں اب بھی ایک دوسرے پر متعدد الزامات لگائے جاتے ہیں، ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کو پریشان کرتا ہے، اور ان تاریخی واقعات کو بنیاد بنا کر جو کہ ہمارے ذہنوں میں اب بھی محفوظ ہیں ایک دوسرے کے ساتھ شمشیر بکف رہتے ہیں۔ ہم اپنے ماضی کی کڑوی باتوں کو بھلانے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ہی ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری یہی دعا ہے کہ یہ اجلاس اور اس میں ہونے والے ہمارے باہمی مذاکرات مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے سماجی انصاف، اخلاقی اقدار، امن وسلامتی اور تمام افراد کی آزادی کے مقاصد کو حاصل کرنے کی مشترکہ کوشش ثابت ہو۔

چوتھے وسیروٹا اجلاس اور اس کے ساتھ ہونے والے 'سمر اسکول 2006' کو منعقد کرنے میں پوری طرح تعاون فراہم کرنے کے لیے ہم آسٹریا کی سائنس اور تحقیق کی فیڈرل وزارت کے شکرگزار ہیں۔ اس کے علاوہ ہم سینٹ گیبریل انسٹی ٹیوٹ کی پیٹرا گیرل، گرٹروڈ گروبر اور بریگیٹ سون برگر پر مشتمل تجربہ کار اور پوری طرح قابل اعتبار ٹیم جس نے ہمارے اس اجلاس کو کامیاب بنانے اور اس کی روداد کو شائع کرنے میں اپنا پورا تعاون دیا، کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

اندریاس بشتنیہ – طاہر محمود

نئی دہلی، اکتوبر 2007

ناخواندگی اور بنیادی تعلیم تک رسائی

صالحہ ایس محمود

اقراء باسم ربك الذی خلق

ترجمہ: پڑھو اپنے رب کا نام لے کر جس نے پیدا کیا انسان کو۔

ابتدائیہ

''اقراء'' یعنی پڑھو۔ وہ پہلی وحی ہے جو حضور اکرم ﷺ پر حضرت جبریل کے ذریعہ نازل ہوئی تھی اور جس سے خواندگی کی اولیت کا قیاس ہوتا ہے۔ پڑھنا لکھنا ایک ایسا بنیادی ہنر ہے جسے اسلام میں وقیع تر تسلیم کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ہر فرد و بشر پر تعلیم کے حصول کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ ایک مشہور حدیث نبوی ہے کہ علم حاصل کرو خواہ چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ یہاں چین سے مراد دور دراز علاقہ ہے۔ اسلام میں تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ کسی گناہ کا کفارہ کسی شخص کو پڑھنا لکھنا سکھا کر بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جب جنگی قیدیوں کو اس طور پر رہا کروایا گیا کہ وہ دوسروں کو تعلیم دیں گے اور پڑھنا لکھنا سکھائیں گے۔ مختصراً اسلام میں جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، لکھنے پڑھنے کو ایک وقیع تر ہنر مانا گیا ہے اور ہر شخص کو اس کا مکلّف بنایا گیا ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا سیکھے، افہام و تفہیم کا مادہ پیدا کرے، تشریح و تعبیر کا شعور پیدا کرے اور جب بھی ممکن ہو تعلیم و تعلم کی ترویج کرے۔

1. تعلیم اور انسانی حقوق

عجیب اتفاق ہے کہ اقوام متحدہ نے ظہورِ اسلام کے چودہ سو سال بعد 1948 میں انسانی

حقوق کے عالمگیر اعلامیہ کو منظور کر کے اس اعلامیے میں ایک ایسی دفعہ شامل کی جس کی رو سے بنیادی تعلیم کو ہر شخص کا بنیادی حق مانا گیا در ایں صورت ہر معاشرے پر یہ لازم ہے کہ وہ اس با ت کو لازم بنائے کہ لوگوں کو مفت اور لازمی طور پر ابتدائی اور بنیادی سطح پر تعلیم کے مواقع حاصل ہوں اور وہ کم از کم اتنی تعلیم حاصل کر سکیں کہ وہ ایک دوسرے سے اپنی بات کہہ سکیں اور ملکی معیشت و سول سوسائٹی میں مؤثر طریقے سے حصہ لے سکیں۔

1998 سے اقوام متحدہ کا انسانی حقوق سے متعلق کمیشن ہر سال متذکرہ بالا اعلامیے کی تمام دفعات پر کس حد تک عمل کیا جا رہا ہے اس ضمن میں ہر سال ایک رپورٹ شائع کرتا ہے اس میں تعلیم کے حق سے متعلق دفعہ کی تعمیل بھی شامل ہے۔ یہاں جمیل سالمی کے اس مضمون کا حوالہ دینا بے محل نہ ہوگا جس کا عنوان 'تشدد' جمہوریت اور تعلیم ایک تجرباتی فریم ورک ہے'' اور جس میں انہوں نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے ''رپورٹ میں لازمی اور مفت تعلیم سے متعلق ملکی خواتین پر تو نظر مرکوز کی گئی ہے لیکن ان پر کسی حد تک عمل درآمد کیا جا رہا ہے اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مساوی مواقع فراہم ہونے کی بات محض جنسی مساوات کے حوالے سے کہی گئی ہے جبکہ سماجی، معاشی، نسلی، لسانی اور مذہبی نقطہ نظر سے بھی اس کا تجزیہ کیا جانا چاہیے تھا۔ بہر حال کچھ بھی ہو موجودہ صورت حال یہ ہے کہ یونیسیف کے مطابق 6 سے 11 سال کی عمر کے ایک سو تیس ملین بچوں میں سے 60٪ فیصدی بچے جو تا ہنوز اسکول کی چار دیواری سے باہر ہیں محض لڑکیاں ہیں اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ ان اسکولوں میں لڑکیوں کی کارکردگی لڑکوں کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔

اقوام متحدہ کے موجودہ چارٹر کے مطابق مملکتوں کا نہ صرف یہ فرض ہے کہ وہ عالمی پیمانے پر مفت تعلیم دیں بلکہ ان کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ بلا تفریق ایسا کریں۔ سالمی نے اس بات کو یقینی بنانے کے لئے تعلیم میں تفریق کے خلاف یونیسکو کی اس کنونشن کا حوالہ دیا ہے جس میں بغیر کسی علاقائی، نسلی، مذہبی، یا جنسی امتیاز کے ساتھ تعلیمی مواقع فراہم کرنے کے اصول کو

یقینی بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی منشور برائے شہری اور سیاسی حقوق میں بھی ''والدین کی آزادی کے احترام اور ان کے اپنے عقائد کے مطابق بچوں کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم کو یقینی بنانے کی بھی ضمانت دی گئی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ ایسی بہت سی جمہوری سوسائیٹیوں میں جہاں سیکولرزم کرکا بول بالا ہے والدین کے اس قسم کے جذبات کا ''احترام'' نہیں کیا جاتا''۔

2. ہزارے کے ترقیاتی اہداف کے حصول میں تعلیم کی اہمیت

2000 میں اقوام متحدہ کے رکن ممالک کی ہزارسالہ چوٹی کانفرنس میں جو ہزارسالہ قرار داد منظور کی گئی تھی اس میں ہزارے کے آٹھ ترقیاتی اہداف مقرر کیے گئے تھے اور یہ اعلان کیا گیا تھا کہ انہیں 2015 تک پورا کرلیا جائیگا۔ یہ اہداف مندرجہ ذیل ہیں۔

ہدف 1۔ شدید غربت اور فاقہ کشی کا خاتمہ

اگرچہ عالمی پیمانے پر غربت کا گراف نیچے آیا ہے لیکن تاریخ کے کسی بھی دور میں صحرائے اعظم افریقہ کے نواحی ممالک میں غرباء کی تعداد کبھی اتنی نہیں تھی جتنی آج ہے۔

ہدف 2۔ سب کے لئے ابتدائی و بنیادی تعلیم

جبکہ صحرائے اعظم افریقہ کے نواحی ممالک، ایشیا اور Oceania میں کچھ اور علاقوں میں پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ تو ہوا ہے لیکن تکمیل ہدف ابھی دور کی بات ہے۔

ہدف 3۔ جنسی مساوات کا فروغ اور خواتین کو با اختیار بنانا۔

تعلیم کے میدان میں تو جنسی نقطہ نظر سے فاصلہ کم ہوتا جارہا ہے لیکن معاشی اعتبار سے خواتین کو با اختیار بنانے کے معاملے میں حصول مساوات کی رفتار قدرے سست ہے۔ تاہم تعلیم میں اضافہ کے ساتھ ساتھ خواتین با اختیار ہوتی چلی جائیں گی۔

حدف 4۔ بچوں کی شرح اموات میں کمی لانا

ہر سال گیارہ ملین بچے ایسی بیماریوں کا شکار ہوکر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں جن

کا تدارک یا علاج ممکن ہوتا ہے لیکن والدین کی لاعلمی اور جہالت، خصوصاً ماؤں کی، کے باعث ان اعداد و شمار میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔

ہدف 5۔ ماؤں کے لیے بہتر طبی سہولیات

ہر سال تقریباً نصف ملین خواتین دوران حمل وزچگی موت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان میں پڑھی لکھی ماؤں کی تعداد کافی کم ہوتی ہے۔ لہذا اس ضمن میں بہتر صورتحال کو یقینی بنانے کے لیے خواتین کی تعلیم کی طرف مزید توجہ کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی اور اپنے خاندان کی بہتر دیکھ بھال کرسکیں۔

ہدف 6۔ ایچ آئی وی ایڈز، ملیریا اور دیگر بیماریوں کے خلاف جنگ۔

خصوصاً صحرائے اعظم افریقہ کے نواحی افریقی ممالک اور دیگر ممالک میں ان بیماریوں سے ہونے والی اموات کو تدارکی اقدامات کے ذریعہ روکا جاسکتا ہے اور وہ بھی خاص کر ان آبادیوں میں جہاں تعلیم کی سطح اور خواندگی کی شرح بہتر ہے کیونکہ انہیں تعلیم کے ذریعہ مؤثر تدارکی اقدامات اور صحت کی دیکھ بھال سے باسانی آگاہ کرایا جاسکتا ہے۔

ہدف 7۔ ماحولیاتی پائیداری کو یقینی بنانا

خواندہ و تعلیم یافتہ آبادیوں میں پائیدار ترقی و فروغ کی ایسی تکنیک اور طریقہ اختیار کرنا جو بقائے انسانی کے لیے اشد ضروری ہے۔

ہدف 8۔ ترقی کے لیے عالمی شراکت کا فروغ

اس ہدف کو پورا کرنا بھی ممکن ہے جب شرکاء یعنی ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک ایک دوسرے کے مسائل کو ٹھیک طور پر سمجھیں اور ان کے حل کا صدق دلی سے اعادہ کریں۔ ایسی شراکت کو عملی جامہ پہنانے کے معاملہ میں بہتر تعلیم ایک مضبوط ہتھیار ثابت ہوسکے گی۔

اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کوفی عنان نے ان اہداف کو عالمی رہنماؤں کے ذریعہ امن، تحفظ، ترقی، انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں سے متعلق سنگل پیکیج کی شکل میں کیا گیا ایک وعدہ

کہا ہے''۔اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی فرمایا''ہم غیر محفوظ ہونے کی صورت میں ترقی کا فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور بغیر ترقی کے خود کو محفوظ بھی نہیں رکھ سکتے اور اگر ہم انسانی حقوق کا احترام نہیں کرتے تو ہم ان میں سے کسی ایک کا بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔جب تک ہم تمام امور کی طرف توجہ نہیں دینگے تب تک ہمیں کسی ایک امر کی بابت کامیابی حاصل کرنا بھی ممکن نہ ہوگا۔''

یہ اہداف مثبت اور امید افزا ہیں چونکہ ان میں عوام کا خیال رکھا گیا ہے،عمل درآمدگی کے لیے وقت مقرر کیا گیا ہے اور اس بات کو بھی یقینی بنایا گیا ہے کہ اس عمل درآمدگی کا صحیح جائزہ لیا جا سکے۔اس کے علاوہ انکی بنیاد ایک ایسی عالمی شراکت پر ہے جس میں زیادہ اور کم ترقی یافتہ ممالک شریک ہیں،اس کے علاوہ انہیں حکومتوں سول سوسائٹی اور ترقیاتی اداروں کی حمایت بھی حاصل ہے،اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام اہداف تعلیم سے متعلق ہدف سے براہ راست جڑے ہوئے ہیں۔یہ تعلیم ہی ہے جو غربت سے چھٹکارا دلا سکتی ہے،جس سے خواندگی اور جنسی مساوات کو فروغ حاصل ہوتا ہے،اور پڑھی لکھی عورت زیادہ سے زیادہ با اختیار ہوتی چلی جاتی ہے۔اور اسی طرح دیگر اہداف کا حصول بھی،جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔تعلیم سے براہ راست جڑا ہوا ہے۔تعلیم یافتہ لوگ ماحولیاتی پائیداری کو یقینی بنانے کے لیے ضروری معلومات سے بہتر بار آور ہیں اور وہ ترقی کے لیے عالمی شراکت سے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے کی بہتر صلاحیت رکھتے ہیں۔لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت محض ایک بہتر تصور ہی نہیں بلکہ آج کے اس دور انحطاط میں معلومات حاصل کرنے،تبادلہ خیالات کرنے اور یہاں تک کہ اپنے جان و مال اور اپنے وجود کے تحفظ کے لیے بھی اشد ضروری ہے۔بغیر تعلیم کے کون کسطرح اپنے کام کاج،صحت،غذا وغیرہ سے متعلق معلومات حاصل کر سکے گا اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے اس دور میں سائنوں اور لیبلوں کو کس طرح پہچان سکے گا، معاہدوں اور اقرار ناموں وغیرہ کی شرائط وضوابط کو کس طرح سمجھ سکے گا اور ان کے متن کی تعبیر و تشریح کر سکے گا۔

4 تعلیم: علاج وذریعہ

غربت سے نجات حاصل کرنے کے لیے 2002 میں منعقد دیانہ بین الاقوامی مسیحی و اسلامی گول میز مذاکرات۔2 کے افتتاحی سیشن میں جس کا موضوع تھا غیر رواداری اور تشدد: اظہارات،وجوہات،نظریات،میں نے اپنے قلم بند خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ غریبی تشدد کی وہ سنگین شکل ہے جس کا انسان خود ذمہ دار ہے اور اس نے ایسا کر کے انسانیت کو شدید زد پہنچائی ہے،دنیا میں ایک بلین سے زیادہ لوگ شدید غربت کا شکار ہیں اور تقریباً ایک بلین لوگ بھوکے سوتے ہیں،دنیا کی آبادی میں خواتین اور لڑکیاں آدھے سے زیادہ ہیں جبکہ اطفال نرینہ کی تعداد چوتھائی کے برابر ہے۔اس طرح دنیا کی تین چوتھائی آبادی غربت اور اقتصادی انتشار کا شکار ہے۔ایسی صورت حال ہمیں ہر معاشرے میں دیکھنے کو ملتی ہے،خواہ وہ زیادہ ترقی یافتہ ہو یا کم ترقی یافتہ۔یہ علاقائی غربت محض لوگوں کی کاہلی کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ پیسے والوں کی حرص ولالچ کا نتیجہ ہے۔یہ صرف قدرتی آفات جیسے زلزلہ،سیلاب،قحط،خشک سالی اور تبدیلی آب وہوا کا ہی نتیجہ نہیں بلکہ یہ انسان کے اس رخ بیجا کا نتیجہ ہے جس کی حرص ولالچ کے باعث مالدار اور مالدار ہوتا جا رہا ہے اور غریب،غریب تر۔لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے غربت کا یہ پہیہ مستقل گھوم رہا ہے اور اس نے نسل در نسل پیہم رفتگی کے باعث ایک مستقل شکل اختیار کر لی ہے۔

ترقی کی جانب گامزن

ارتھ ٹرینڈس کی ''صحت کے لیے آر ایکس:تعلیم'' کے عنوان والی رپورٹ میں یہ کہا گیا ہے کہ بہتر تعلیم یافتہ اور صحت مند لوگ معاشرتی واقتصادی ترقی کی سطح کو اوپر لے جانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

تحقیق اس بات کی گواہ ہے کہ مزدور طبقے کی اوسط تعلیم میں اگر ایک سال بھی اضافہ کر دیا

جائے تو جی.ڈی. پی نو فیصدی بڑھ جاتی ہے۔ ورلڈ بینک کے مطابق انسانی وسائل زیادہ تر اقوام کی دولت کا سب سے اہم حصہ ہے۔

تحقیق سے اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ اگر بنیادی معاشرتی خدمات بشمول خواندگی وابتدائی تعلیم میں سرمایہ کاری کی جائے تو انسانی ترقی اور شرح نمو میں زیادہ اضافہ ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہی رقم اعلی تعلیم یا اعلی سطحی طبی سہولیات پر خرچ کی جائے۔ یو.این.ڈی.پی.کی ایک رپورٹ میں یہ تخمینہ دیا گیا ہے کہ تمام ترقی پذیر ممالک میں واپسی کی معاشرتی در پرائمری اسکولنگ کے لیے چوبیس فیصدی ہے۔ سکنڈری اسکولنگ کے لیے پندرہ فیصدی اور سکنڈری تعلیم سے اعلی سطحی تعلیم کے لیے بارہ فیصدی۔

1998 کی ارتھ ٹرینڈس رپورٹ میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ بہت سے ماہرین معاشیات کا یہ کہنا ہے کہ ایشین ٹائیگرس کو جو اقتصادی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں اس کا سہرا ان حکومتوں کی اس پالیسی کو جاتا ہے، جس کے تحت حکومتوں نے ابتدائی تعلیم کے لیے فنڈ فراہم کیے جو ترقی کی بنیاد بنی، اس نے پاکستان اور جمہوریہ کوریا کی مثالیں یہ کہکر دی ہیں کہ 1960 میں ان دونوں ممالک کی آمدنی برابر تھی لیکن اسکولوں میں شرح اندراج مختلف تھیں۔ یہ شرح پاکستان میں 30 فیصدی اور کوریا میں 34 فیصدی تھی۔ آئندہ پچیس برسوں میں یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ کوریا میں فی کس جی.ڈی.پی پاکستان کے مقابلے میں بڑھکر تین گنی ہوگئی۔ اس رپورٹ میں یہ بات بھی دہرائی گئی ہے کہ اگر کوریا میں شرح اندراج وہی رہتی جو پاکستان میں تھی تو اس کی فی کس جی ڈی پی موجودہ جی ڈی پی سے 40 فیصدی سے بھی کم ہوتی۔

اسکولوں تک رسائی

موجودہ رجحانات سے یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ 1980 تا 1994 کے دوران سکینڈری اسکولوں کے اندراج میں دنیا کے تمام حصوں میں اضافہ ہوا ہے، اور تعلیم بالغان کے

معاملے میں بھی 1980 سے 1995 تک صورتحال میں بہتری ہوئی ہے۔ 1997 میں شائع ہونے والی یونیسکو کی رپورٹ میں سکینڈری اسکولوں میں اندراج کی اوسط شرح 1980 تا 1995 کے دوران اسکول جانے والوں کی تعداد کا 45 تا 55 فیصدی رہا ہے۔ سب سے کم فیصد افریقہ میں رہا، 20 سے 30 فیصدی کے درمیان جب کہ یورپ میں یہ اوسط 85 سے 95 کے درمیان رہا (ملاحظہ فرمایئے تصویر 1)

تصویر 1۔ اسکول جانے والے بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد 1980 تا 1994، سکنڈری اسکوں میں اندراج کے رجحانات

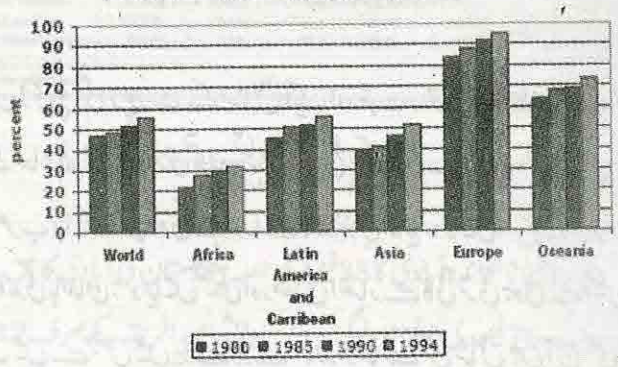

Source: UNESCO 1997: Table 2.10, pp. 2-28

خواندگی بالغان: 1997 کی یونیسکو کی ایک تحقیق کے مطابق تعلیم بالغان کی بابت خواندگی کے جو رجحانات ملتے ہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں اس ضمن میں 70 سے 78 فیصدی کے درمیان اضافہ ہوا ہے (ملاحظہ فرمایئے تصویر 2)

اگرچہ اس ضمن میں موجودہ رجحان ایک بہتر تصویر پیش کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ افریقہ میں آج بھی 40 سے 55 فیصدی کے درمیان لوگ ناخواندہ ہیں جبکہ یوروپ میں 95 تا 98 فیصدی بالغان خواندہ ہیں۔ اسطرح صورتحال یہ ہے کہ ابھی تک دنیا کے کچھ حصوں میں آج بھی ناخواندگی کے مسئلے کا مؤثر حل تلاش نہیں کیا جاسکا ہے اور آبادی کا ایک خاصا حصہ آج بھی قلیل ترین درجے کی خواندگی سے محروم ہے۔

تصویر2 خواندگی بالغان میں اضافے سے متعلق رجحانات 1980 تا 1995

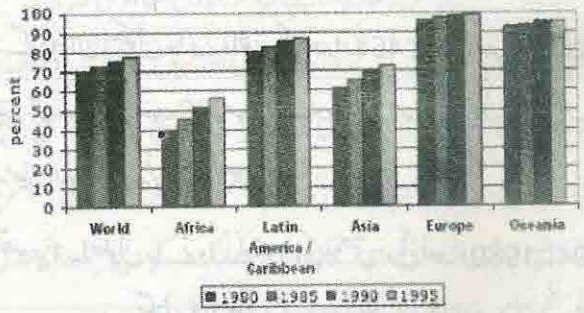

Source: UNESCO 1997: Table 2.2, pp. 2-9

یو این ڈی پی کی رپورٹ کے مطابق ایک اور مثبت رجحان سامنے آیا ہے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے معاملے میں جو دوری تھی وہ تعلیم کی ہر سطح پر کم ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ترقی عرب ممالک میں ہوئی ہے اور اسکے بعد جنوبی ایشیاء ولاطینی امریکہ کا نمبر آتا ہے۔

ناخواندگی بالغان: دنیا میں تکنیکی اور معاشی اعتبار سے کافی ترقی ہوئی ہے، لیکن دنیا کے تمام ممالک میں سے جس میں بڑے بڑے مالدار ممالک بھی شامل ہیں آج بھی جہالت، ناخواندگی، اور شدید غربت جیسی برائیاں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ جیسے ملک میں آج بھی 20 فیصدی بچے مفلسی کی زندگی گزار رہے ہیں اور 3.5 ملین لوگ بے گھر ہیں۔ خواندگی کے معاملے میں بھی امریکہ اسی قسم کی صورتحال سے دوچار ہے۔ اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو آج 21 فیصدی امریکی ناخواندہ ہیں یعنی قلیل ترین درجہ کی خواندگی سے محروم ہیں۔ یورپ میں بھی کوئی بہتر صورتحال نہیں ہے۔ آئرلینڈ میں یہ 35 فیصدی اور برطانیہ میں 25 فیصدی ہے لیکن سب سے زیادہ ناخواندہ لوگ جنوبی اور مغربی ایشیاء میں ہیں۔ (ملاحظہ فرمایئے ٹیبل 1)

ٹیبل 1 خطہ وار بالغ ناخواندگان اور خواندگی کی شرح سے متعلق تخمینے،

1990 اور 2000-2004

	Number of illiterates (000)		Literacy rates (%)		Change from 1990 to 2000-2004 (c	
					Number of illiterates	Literacy rates
	1990	2000-2004	1990	2000-2004	(000)	(%)	(percentage points)
World	871 758	771 129	75.4	81.9	-100 821	-12	6.4
Developing countries	855 127	759 199	67.0	76.4	-95 928	-11	9.4
Developed countries	14 864	10 499	98.0	98.7	-4 365	-29	0.7
Countries in transition	1 759	1 431	99.2	99.4	-328	-19	0.2
Sub-Saharan Africa	128 581	140 544	49.9	59.7	11 964	9	9.8
Arab States	59 023	65 128	50.0	62.7	7 105	3	12.6
Central Asia	572	404	99.7	99.2	-168	-29	0.5
East Asia and the Pacific	232 255	129 922	81.8	91.4	-102 333	-44	9.6
South and West Asia	352 353	351 116	47.5	58.6	-1 237	-0.3	11.2
Latin America and the Caribbean	41 742	37 901	85.0	89.7	-3 841	-9	4.7
Central and Eastern Europe	11 509	8 374	96.2	97.4	-3 135	-27	1.2
North America and Western Europe	11 325	7 740	97.9	98.7	-3 585	-32	0.8

Note: Figures may not add up to world totals because of rounding.
Source: See Chapter 2 in the full EFA Report.

Source: UNESCO, Education for All – Literacy for Life, Summary, available online, p. 19.

دنیا کی کل ناخواندہ آبادی کا 35 فیصدی حصہ ہندوستان کی آبادی کا جز ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے 75 فیصدی ناخواندہ لوگ آج بھی ایشیا اور افریقہ کے صرف 12 ممالک میں بستے ہیں۔ (ملاحظہ فرمایئے تصویر3)

ترقی پذیر ممالک میں 2002 کے تخمینے کے مطابق افریقہ میں ناخواندگی کی شرح سب سے زیادہ رہی۔ افریقی ممالک میں یہ شرح تقریباً 60 فیصد رہی۔ نائیجر میں یہ شرح سب سے زیادہ ہے چونکہ یہاں شرح ناخواندگی 83 فیصد ہے، اس لیے اس کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ ناخواندہ ملک کے طور پر کیا جاتا ہے۔ صحرائے صحارا کے نواحی افریقی ممالک میں اوسط ناخواندگی در 43.20 فیصد ہے۔ عرب ممالک میں یہ در 43.40 فیصد ہے جبکہ ناخواندگی کی سب سے زیادہ اوسط شرح جنوبی افریقہ کے ممالک میں ہے جو 49.80 فیصد ہے۔ دوسری طرف مشرقی ایشیاء اور اوسیانیا میں اس کا فیصد 17.40 ہے اور ترقی پذیر ممالک کے

زمرے میں لاطینی امریکہ میں یہ شرح سب سے کم 13.40 ہے۔

تصویر 3 دنیا کی بالغ ناخواندہ آبادی کی تقسیم، (Scan)2000-2004

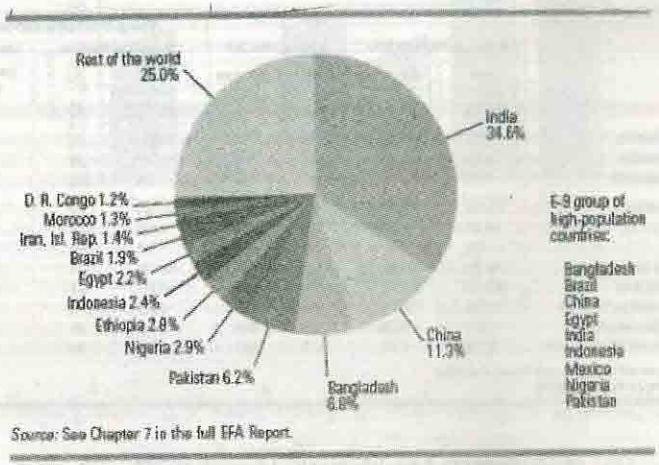

Source: UNESCO, Education for All – Literacy for Life, Summary, available online, p. 20.

مندرجہ بالا تجزیے سے جو سوال ہمارے سامنے ابھر کر آیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اس سوال کا جواب کیا دیں کہ آخر غریبی کو کس طرح ختم کیا جائے۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ اہمیت تعلیم کی ہے اور اس سوال کا جواب بھی اسی میں مضمر ہے۔ تعلیم نہ صرف ذریعہ معاش فراہم کرتی ہے بلکہ یہ ایک بامعنیٰ و باوقار زندگی کی سمت مقرر کرتی ہے اور اسے فروغ دیتی ہے۔ لیکن تعلیم تب ہی موثر ہو سکتی ہے، جب اس میں اخلاقی اور روحانی اقدار کو بھی شامل کیا جائے چونکہ ایسا کرنا بچوں کی بہتر تعلیم اور انہیں ایک مہذب معاشرے کا حصہ بنانے کے لیے ضروری ہے۔ اگر ہم اخلاقی اصولوں کو اپنی روزمرہ کی زندگی کا جز بنالیں اور باہمی تعلقات میں بھی انہیں ملحوظ خاطر رکھیں تو ناانصافی کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا اور لالچ یا حرص و خودغرضی جیسی برائیاں جو غیر ضروری ہوڑ اور مختلف قسم کی کشیدگی کو جنم دیتی ہیں خود بخود غائب ہو جائیں گی۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ ہم اس دنیا میں خالی ہاتھ آتے ہیں اور خالی ہاتھ لوٹ جاتے ہیں اور سب کچھ یہاں چھوڑ جاتے ہیں اور ہمارے اچھے اعمال ہی ہماری سرخروئی کا باعث بنتے ہیں۔ دنیاوی کامیابی یقیناً ایک مثبت اشارہ ہے، اس سے ہم واہواہی لوٹ سکتے ہیں مگر یہ اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ یہ ہماری آخرت میں بھی سرخ روئی اور نجات کا ذریعہ بنے گی۔ اخلاقی تعلیمات تمام مذہبی عقائد کا جزء لاینفک ہے اور اگر ان پر عمل کیا جائے تو اس سے یقیناً بہتر اور پرامن دنیا کا حصول ممکن ہے اور یہ وقت کا تقاضہ بھی ہے۔

میں نے پہلے بھی اس بات کی سفارش کی تھی کہ ہمیں لائحہ عمل کے جز کے طور پر ویانا بین الاقوامی مسیحی و اسلامی گول میز مذکرات میں ایک ایسی پالیسی وضع کرنی چاہیئے جس کی رو سے اسکولوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے نصاب میں اقدار و اخلاقیات جیسی چیزوں کو شامل کیا جا سکے۔

یہ پالیسی ایسی نصابی ماہرین کی مدد سے تیار کی جا سکتی ہے جو خصوصاً مختلف عقائد پر مبنی تعلیمی اداروں سے جڑے ہوئے ہوں۔ اس علم تدریس کو آگے بڑھانے کی اور تعلیمی اداروں تک پہنچانے کی ضرورت ہے تاکہ اسے نظام تعلیم کا جز بنایا جا سکے اور ختم ہوتی ہوئی اقدار کو پیدا ہونے والے مزید خطرات سے بچایا جا سکے۔ اگر ہم اخلاقی تعلیم کو بھی اپنی سیکولر تعلیم کا جز بنالیں تو اس سے متوازن نصابی ترجیحات کے انتخاب میں مدد ملے گی۔

خلاصہ: اسلام میں حصول علم اور درس و تدریس کو وقیع تر تسلیم کیا گیا ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کا احیاء تعلیمی اداروں کا مرہون منت ہے اور انہوں نے ہی اسے جلا بخشی ہے جب تک یہ مراکز فعال رہے تب تک اس دور کو عہد زریں کا درجہ حاصل رہا۔ اور معیشت و معاشرت پھلتی پھولتی رہی۔ نظام تعلیم میں زوال کے ساتھ ساتھ اقتصادی اور سیاسی شعبوں میں انحطاط پیدا ہونے لگا۔ عصر حاضر میں تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت کے پس منظر میں ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا ہوگا کہ جدید رجحانات کا مقابلہ کرنے کے لیے تعلیم کو خصوصاً نئی نسل کی تعلیم کو ایک ایسی شکل دی جائے کہ اس سے نہ صرف

لیبر مارکیٹ کے لئے ہنر مند محنت کشی پیدا ہوں بلکہ ہر شخص کی شخصیت میں نکھار پیدا ہو۔ مارکسزم اور سوشلزم کے تجربات ناکام ہونے کے بعد یہ فلسفہ تعلیم کہ ہمارا علم تدریس لیبر مارکیٹ کے لیے صرف محنت کش فراہم کرنے کی جانب مرکوز ہے، تقریباً متروک ہو چکا ہے۔

آج کا انسان صرف روٹی کے لیے نہیں جیتا۔ اسے بحیثیت انسان کے ایک ایسے پروقار معاشرے کی ضرورت ہے جس میں اعلیٰ اقدار کو ملحوظ خاطر رکھا جائے اور جس میں اسکی بنیادی روحانی ضروریات پوری ہو سکیں۔

سوالات و مداخلات

ناخواندگی ایک مذہبی مسئلہ بھی ہے

خوری:

ناخواندگی کا تعلق مملکت یا صرف معاشرے ہی سے نہیں بلکہ مذہب سے بھی ہے چونکہ ایک ناخواندہ شخص کی رسائی اس حد تک نہیں ہوتی جہاں وہ یہ سمجھ سکے کہ اس کے مذہب کی تعلیمات صحیح معنوں میں کیا تعلیم دیتی ہیں۔ وہ اس بات کا صحیح اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ اسے کیا تعلیم دی جا رہی ہے اور اس ضمن میں دوسرے لوگوں کا نقطہ نظر کیا ہے۔ لیکن یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ ہر مذہب وقت کے ساتھ ساتھ نسل در نسل آگے بڑھے۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ اسلام کے لیے بھی یہ بات اسی اہمیت کی حامل ہے چونکہ اسلام میں کوئی ایسی باقاعدہ مرکزی اتھارٹی نہیں ہے جو پوری امۃ کی نمائندگی و ترجمانی کر سکے۔

مذہبی عقائد اور ملکی اقدار

بعض اوقات بچوں کو والدین کے مذہبی عقائد کے مطابق تعلیم دینے سے حکومت کے ساتھ کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جرمنی میں یہ بات بارہا دیکھنے میں آئی ہے کہ بہت سے لوگ جن کا تعلق چھوٹے چھوٹے گروپوں یا مسلکوں سے ہے اپنے بچوں کو ایسے تعلیمی اداروں میں نہیں بھیجتے جہاں انھیں اس بات کا خدشہ ہو کہ حکومت کی طرف سے ان کو ان اقدار کی تعلیم دی جائے گی جو ان کے والدین کو قابل قبول نہ ہوں۔

حضرت محمدؐ ایک امی؟

ڈاکٹر صالحہ ایس محمود نے اپنے مقالے کے شروع میں لفظ اقراء کا حوالہ دے کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ خدا کی طرف سے بھیجی گئی وحی میں تعلیم کا قیاس مضمر تھا یعنی پڑھنے اور لکھنے کی

صلاحیت۔ اگر اس اصطلاح کا یہ مطلب نکالا جائے تو اس کا اطلاق حضرت محمدؐ پر کسطرح ہوگا جن کے بارے میں مسلمانوں کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ اُمّی تھے۔

ناخواندگی مذہبی تناظر میں

صالحہ ایس محمود:

مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ناخواندگی اور مذہبی ناخواندگی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس جانب میرا اشارہ معاشرتی تناظر میں تھا، مگر پروفیسر خوری نے مذہبی تناظر میں دیکھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام میں کوئی مرکزی مذہبی پیشوائی یا سلسلہ مدارج نہیں ہے اور یہ ہر مسلمان کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ علم حاصل کرے اور اپنے آپ کو علم سے مزین کرے۔ اسے کوئی یہ بتانے والا نہیں کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اگر چہ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ امی تھے اور وہ پڑھ لکھ نہیں سکتے تھے مگر خدا نے ان پر وحی نازل کر کے یہ بات پہنچادی کہ پڑھنا لکھنا کتنا ضروری ہے۔

نفس موضوع کا مدعا

گیبریل:

حسب امید اس مباحثہ میں یہ بات ہمارے سامنے آگئی ہے کہ مسئلہ صرف اس میں خواندگی کا نہیں ہے بلکہ نفس موضوع کا بھی ہے یعنی کیا پڑھایا جائے؟ بچوں کو پڑھاتے وقت مختلف قسم کی امدادی مواد و میٹریل کا استعمال کیا جاتا ہے اس تعلیم کی نوعیت کچھ بھی ہو سکتی ہے یعنی مذہبی یا سیکولر، رواداری پر مبنی اور اس کا فقدان بھی۔

صالحہ ایس محمود:

مجھے اس بات سے مکمل اتفاق ہے۔ یہ بات یقیناً بڑی اہم ہے کہ کیا پڑھایا جاتا ہے اور کس طرح پڑھایا جاتا ہے۔ آخر میں یہ بات یہیں پر آکر رکتی ہے کہ اصل اہمیت اس نفس

موضوع کی ہے، جس سے اسے واقف کرایا جاتا ہے چونکہ اس سے ہی اس کی سوچ و وجود میں آتی ہے، اسی کی بنیاد پر وہ تجزیہ کرتا ہے اور اس کی تعبیر کے لئے بھی اس کا سہارا لیتا ہے۔ ہر شخص کے لیے پر بے انتہا ضروری ہے کہ وہ ہر بات کو ٹھیک سے سمجھے۔ بنیادی طور پر اسلام میں یہ ذمہ داری ہر شخص کی اپنی ہے کہ وہ خود اس بات کا فیصلہ کرے کہ اسے کیا کرنا ہے اور جو کچھ بھی وہ کرتا ہے اس کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ میں نے اپنے مقالے میں اس بات کی کماحقہٗ وضاحت نہیں کی۔

سماج کی ذمہ داری

اندیاس بشتیہ:

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں ہم کمیونٹی کے رول سے متعلق پہلو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ایک طرف تو ہر شخص کی یہ ذمہ داری کہ وہ اپنے معاملات کا خود خیال رکھے تو دوسری طرف سماج کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس ضمن میں اہم کردار ادا کرے۔ کیا یہ سماج ہی نہیں ہے جو برابر یہ فیصلہ کرتا رہتا ہے کہ کیا تعلیم دی جائے؟ بالفاظ دیگر ہمیں اس بات سے بھی مکمل آگاہ ہونا چاہیے کہ یہ سماج کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس ضمن میں بالغ نظری سے کام لے اور صحیح اقدار کو صحیح افراد تک پہنچائے۔ پرورش طفل کے لیے پورے گاؤں کا تعاون درکار ہے مگر پھر بھی محرومیٔ دیہہ۔

صالحہ ایس محمود:

میں یہ سمجھ رہی ہوں کہ میرے مقالے میں بڑے بڑے اچھے سجھاؤ موجود ہیں لیکن مجھے ساتھ ہی ایک انگریزی کتاب کا عنوان یاد آرہا ہے جو افریقہ کی ایک مشہور کہاوت کی شکل میں تھا اور جس کا اردو ترجمہ ہے پرورش طفل کے لیے پورے گاؤں کا تعاؤن درکار ہے۔ یہ کتاب ہیلری کلنٹن نے لکھی ہے۔ یہ عنوان ایک حقیقت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سماجی خدمات اور تعلیم الاطفال کے لیے پورے گاؤں یعنی سب کی شرکت ضروری ہے لیکن آج کے

موجودہ سماج میں ھمارے سامنے جو مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ہم اس گاؤں ہی سے محروم ہوتے جارہے ہیں اس کے بجائے اب یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ جہاں تک بچے کی پرورش پرداخت اوراس کے دل ودماغ میں اپنے اقدار کو رچانے بسانے کی بات ہے یہ ذمہ داری خصوصاًماں باپ پراور اکثرماں باپ میں سے ایک پرآن پڑی ہے۔

خدا کے سامنے تو ہم سب ہی ناخواندہ ہیں۔

اندریاس بشتیه:

پروفیسر خوری نے جواس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اس ضمن میں میں اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ روایتی طور پر پیغمبر اسلام کو امی کہا گیا ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اس عقیدے یا روایت کی تعبیر کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ میں تو حیرت زدہ ہو کر خود اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا خدا کے سامنے ہم سب جاہل و ناخواندہ نہیں ہیں؟ کیا یہ اصطلاح بنیادی طور پر ھمارے خدا کے ساتھ رشتے کی جانب اشارہ نہیں کرتی اور کیا یہ دنیاوی معاملات سے ہماری ناواقفیت کو ثانوی درجہ عطا نہیں کرتی؟ ھم خواہ کتنے بھی آزاد کیوں نہ ہوں یا ہمیں خواہ کتنی ہی کم وبیش جانکاری کیوں نہ ہو دربار خداوندی میں ہماری حیثیت محض ایک سامع کی ہے۔

اس بات کی تصدیق قرآن کریم کی اس آیت سے ہوتی ہے۔

ترجمہ: اوراسی طرح ہم نے آپ کے پاس بھی وحی بھیجی، آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب اللہ کیا چیز ہے۔ اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان کیا ہے۔ سورہ ۴۲ آیت ۵۲

علم بنام نیکی جیسے تنازع کا خطرہ

گیبریل:

ہمیں اس معاملے میں محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے اوراس قسم کے بیانات سے احتراز کیا

جائے جن سے ان دو اصطلاحوں کے مابین کسی قسم کے تقابلی تنازع پیدا ہو۔ حالانکہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کے رجحانات معاشرے میں موجود ہیں اور دونوں کے درمیان خلا پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ایک ایسا شخص جو ناخواندہ ہے اور جسے کسی بات کا پتہ ہی نہیں ہے یقیناً ایک سیدھا سادا نیک انسان ہوسکتا ہے مگر اس قسم کا طرز فکر اپنانے سے اہالیان کتاب یعنی عیسائیوں اور اہل اسلام کو کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔

بشتیه:

یہ حقیقت ہے کہ اگر ناخواندہ لوگوں کے بارے میں اس قسم کی سوچ اپنائی جاتی ہے تو مختصراً اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ سمجھیں گے کہ جو جتنا جاہل ہے اتنا ہی نیک ہے اور اسطرح سے تقریباً ایک نیا تصور جنم لے گا۔

اعلیٰ تعلیم کا رول

خوری:

عنوان کی رو سے یہ مقام بنیادی تعلیم تک محدود ہے لیکن معاشرے، بین الاقوامی برادری اور مذاہب کی ترقی کے لیے اعلیٰ تعلیم کا ایک اپنا اہم رول ہے۔

بنیادی تعلیم ضروری ہے مگر کافی نہیں

صالحه ایس محمود:

میرا دائرہ کار بنیادی تعلیم ہے، اس لیے میں نے دوران وضاحت بہت سے ایسے اعداد و شمار پیش کیے جن سے پتہ چلتا ہے کہ معاشی اور ترقیاتی پیش رفت کے لیے بنیادی تعلیم کی کتنی اہمیت ہے۔ دارصل بنیادی تعلیم ہی شخصیت کو نکھارتی ہے اور اقدار کو جلا بخشتی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ محض بنیادی تعلیم ہی کافی ہے۔ ہمیں مقدس کتابوں کے علاوہ بھی دیگر علوم حاصل کرنے ہوں گے۔

جہاں تک علم اور نیکی کا سوال ہے ہمیں ایک دوسرے کو غالب و مغلوب کی حیثیت سے پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ محض یہ حقیقت کہ بغیر پڑھے لکھے حضور اکرم ﷺ کو اتنا علم اور معلومات حاصل ہوگئیں کہ اب علم کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ یہ تو بنیادی طور پر خدا کی دین ہے، اور ہمیں علم انسانی یا چیزوں کو جاننے کی اہلیت کے بارے میں جسارت بیجا نہیں کرنی چاہیے، چونکہ ہم اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ یہ تو بحر ظلمات میں روشنی کی ایک کرن ہے (سورہ 6.97) جو ہم نہیں جانتے یقیناً اس سے زیادہ ہے جس کا ہمیں علم ہے یعنی ہماری مجہولات، معلومات سے زیادہ ہیں لہذا ہمیں خود پر غرور نہیں کرنا چاہیے اور ہمیشہ انکساری کا دامن تھامے رہنا چاہیے۔ چونکہ ہمارے علم کا منبع خدا کی ذات ہے، ایسی صورت میں خواہ عرفان ذات کی بات ہو یا عام سرگرمیوں کی ہمیں ہر صورت میں انکساری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

تعلیم اور حکومت کا رول

بیلا ربی:

ہم یہاں تعلیم کے سلسلے میں کمیونٹی کی ذمہ داری کی تو بات کر رہے ہیں، لیکن اس معاملے میں مملکت کا کردار کیا ہوگا اس پر بھرپور غور نہیں کیا گیا ہے۔ وہ کمیونٹی جو خود غریب اور ناخواندہ ہو اور ایک ایسے ملک میں ہو جہاں کی حکومت بھی مطلق العنان ہو کس طرح تعلیم کو موثر طور پر فروغ دے سکتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو تعلیم سے بہرہ ور کرے۔ عرب دنیا سے متعلق یو این ڈی پی کی رپورٹ میں تین خامیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے پہلی علم و تعلیم کے میدان میں ناکامی، دوسرے مساوات مرد و زن سے متعلق معاملات میں ناکامی اور تیسرے جمہوریت کا فقدان۔ اس طرح اصل ذمہ داری مملکتوں اور حکومتوں ہی کی ہے۔ انہیں بنیادی تعلیم کو آگے بڑھانے اور ناخواندگی کو ختم کرنے کے معاملے میں نئے نئے طریقے اختیار کرتے وقت کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرنی چاہئے۔ اگرچہ ہم بار بار سنتے ہیں کہ

اس ضمن میں دنیا بہت آگے بڑھ رہی ہے اور بار بار یہ نعرہ بلند کیا جاتا ہے کہ تعلیم سے متعلق ہزارے کے ترقیاتی ہدف کو 2015 تک پورا کر لیا جائے گا لیکن زمینی حقیقت اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ شاید ہمیں اس کے لیے 2050 تک انتظار کرنا پڑے۔ ہمیں اس ضمن میں اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے۔ خدا کی طرف متوجہ ہونے کے لیے ہمیں تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔ اس تعلیم کو دو زمروں میں رکھا جا سکتا ہے، ایک عام بنیادی تعلیم اور دوسری مخصوص مذہبی تعلیم، اگر ہم اپنے آپ کو زیور تعلیم سے آراستہ نہیں کر پاتے ہیں تو ہم خدا کو کس طرح پہچان پائیں گے اپنے مذہب کو کس طرح زندہ رکھیں گے۔ اپنے تہذیبی اصولوں کو کس طرح سمجھ سکیں گے اور ان پر کاربند رہیں گے۔

خوری:

جب ہم نفس موضوع کی بات کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ سوال ابھر کر آتا ہے کہ اس بات کا فیصلہ کون کرے گا، کیا پڑھایا جائے اور نفس موضوع کی اعتدال پسندی کی ضمانت کون دے گا یا اس پر نظر کون رکھے گا۔

صالحہ محمود:

جہاں تک ڈاکٹر بیلا ربی کی مداخلت کا سوال ہے ان کی یہ بات صحیح ہے کہ مملکتیں اس ضمن میں بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں مگر یہ بات سب کو معلوم ہے کہ زیادہ تر ممالک ایسا کرنے میں ناکام رہے ہیں، اور اس سلسلے میں اب کثیر ملکی ادارے اور غیر سرکاری ادارے اس کام کو بہتر طریقہ سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ حکومتیں صرف بے کس و بے سہارا ناظر کا رول ادا کر رہی ہیں اور تاہنوز ناکامی ان کا مقدر بنی ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ تم میں ایمان والوں کے اور ان لوگوں کے جن کو علم عطا ہوا ہے (اُخروی) درجے لند کر دے گا اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے (58:11)

یورپی یونین کے اسکولوں میں مذہبی اقدار میں ارتباط

رچرڈ پوٹز

1. تمہید

درج ذیل میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ یورپ میں مذہبی تعلیمات کے موجودہ قانونی ادارے مشترکہ مذہبی اقدار کے ارتباط کے لیے کس حد تک مناسب ڈھانچہ فراہم کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمیں بحث کا آغاز اس حقیقت سے کرنا ہوگا کہ کلیسا، ریاست اور اسکول کا رشتہ یورپی مذہبی قانون کے کلاسیکی عنوانات کا حصہ ہے۔ اس طرح تعلیم اور اسکولنگ کے امور ریاست اور مذہب کے درمیان رشتہ کی تنظیم سے براہِ راست مربوط ہے اور اسی لیے یہ موضوعات مسلسل مذہبی سیاسی مباحث کا مرکز ہوتے ہیں۔ نتیجتاً مذہبی قانون کے تحت آنے والے ضوابط کے اہم مدارج پیچیدہ ہوتے ہیں۔ شروعات میں موجودہ یورپی قانون سے متعلق ناگزیر اشارے پیش کیے جا سکتے ہیں :

سب سے پہلے میں یورپی نظام میں موجود تعلیم سے متعلق استعدادی میدان کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔ اصولی طور پر تعلیم و تعلم کے میدان میں مشمولات کی ذمہ داری رکن ممالک پر عائد ہوتی ہے۔ یورپی برادری کے اساسی معاہدہ کے دفعہ 149 میں پیشہ ورانہ اور عام تعلیم کو براہِ راست کمیونٹی کی ذمہ داری میں شامل کیا گیا ہے : یورپی یونین رکن ممالک کے

درمیان باہمی تعاون کی فضا ہموار کر کے اور ان کی سرگرمیوں کی حمایت اور تعریف کر کے ان ممالک میں معیاری اور امتیازی تعلیم کو فروغ دیتی ہے اور رکن ممالک کی تعلیمی مشمولات اور تعلیمی نظام کے نظم و نسق اور ان کی ثقافت و زبان سے متعلق ذمہ داریوں کی سختی سے تعمیل کرائی جاتی ہے ۔ یہ فرقہ پر مبنی پرائیویٹ اسکولوں اور دینیاتی شعبوں کے ساتھ ساتھ بعض اسلامی اداروں کے لیے بھی نہایت اہم ہو سکتے ہیں۔

دوسری جانب 1997 کے ایمسٹرڈم معاہدہ کے اعلامیہ نمبر 11 کی رو سے، رکن ممالک کے مذہبی و سیاسی تصورات کی بدستور گارنٹی موجود ہے۔ اس لیے یورپ میں تعلیمی اور مذہبی دونوں میدان میں سیاست سے متعلق اصولی طور پر اقسام کو ایجنڈا بنایا گیا ہے۔ لیکن ہم یہاں پر اس حقیقت کو دہرانا چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں 'اقسام' سے مراد بین مذاہب کا وہ مثالی معاملہ ہے جو مذہبی (اور تصوراتی) اغراض کی معیاری سمجھ بوجھ سے مسلسل جاری رہتا ہے تاکہ کمیونٹی قانون کم از کم بالواسطہ طور پر ان ملکی مذہبی قانون پر برتری حاصل کر سکے جن پر یوروپی یونین کے قانون کی حکمرانی ہے۔ بالفاظ دیگر مذہبی تعلیم کے رسمی شرائط کے میدان میں ہم یوروپی معیار سے بہت کچھ امید کرتے ہیں جو کہ موجودہ اور مستقبل کے اسلامی تعلیمی اداروں کے اقسام کو بھی متاثر کریں گے۔

بحث کے وہ کون سے موضوعات ہیں جن کی وضاحت درکار ہے؟ بنیادی طور پر تین ایسے موضوعات ہیں جو ریاست، مذہب، تعلیم کے مابین سہ گوشی کا تعلق تین چیزوں سے ہے۔ اول الذکر دو، یعنی فرقہ پر مبنی اسکول اور مذہبی تعلیم کا تعلق مذہبی قانون کی کلاسکیت سے ہے جب کہ تیسرے، یعنی تعلیم بالغاں اور تاحیات علم حاصل کرنے کا تعلق سرگرمی کے میدان سے ہے جس نے گذشتہ دو دہائیوں میں کافی اہمیت حاصل کی ہے۔

فرقہ پر مبنی پرائیویٹ اسکول : تمام یورپی ممالک میں جو چیز ہمیں مشترکہ

طور پر ملتی ہے، وہ یہ کہ بعد کی جدید ریاست نے کم وبیش تعلیمی نظام کو بہتر بنایا ہے۔ عام طور پر آج کل یورپ میں پرائیویٹ اسکولوں کو آزادی حاصل ہے جس کا مذہبی فرقوں نے روایتی طور پر استعمال کیا ہے۔ اس لیے عملی طور پر تمام یوروپی ممالک میں پرائیویٹ اسکولی نظام کا تعین فرقہ وارانہ طور پر کیا گیا ہے۔ لیکن پرائیویٹ اسکولی نظام کے لیے ایک علامتی چیز وہ پابندی ہے جس کے تحت پبلک اسکولوں کا رتبہ حاصل کرنے کے لیے انھیں بعض لازمی شرائط کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اور اسی لیے ہم نسبتی طور پر ایک معیاری قانونی نظام کو نقطۂ آغاز کے طور پر لے سکتے ہیں۔ ان ممالک میں بھی جہاں فرقہ پر مبنی پرائیویٹ اسکولوں کی تعداد کافی ہے ضابطوں کے لیے ریاستی صلاحیت نے عام نظام کی پوری وضاحت کر دی ہے، جو کہ ایک طرح سے اسلامی پرائیویٹ اسکولوں کے چیلنج کو پیش کرتا ہے۔

مزید برآں، اس سلسلے میں ہمیں یہ بھی بیان کرنا ہوگا کہ اسکولوں میں مذہبی تعلیمات کی پیچیدگیوں کو عام تعلیمی سپلائی میں فرقہ پر مبنی اسکولوں کے حصہ کے مقابلے میں دیکھنا ہوگا۔ یہ کوئی سانحہ نہیں تھا بلکہ فرقہ پر مبنی پرائیویٹ اسکولوں کا بند کیا جانا اور ریاستی نظریے کے تحت تعلیم کی اجارہ داری کمیونسٹوں یا نیشنلسٹ سوشلسٹ کے ذریعے اقتدار حاصل کر لینے کے بعد اٹھائے گئے ابتدائی اقدام کا حصہ تھا۔ یورپ میں فرقہ پر مبنی پرائیویٹ اسکولوں میں داخلہ لینے والے طلبا کی تعداد بعض دلچسپ پہلوؤں کی نشاندہی کرتی ہے۔ مثال کے طور پر آئرلینڈ میں اسکولوں کی بڑی تعداد فرقہ پر مبنی ہے اور بیلجیم میں ثانوی اسکولوں کے طلبا کی 60 فیصد تعداد کیتھولک پرائیویٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی ہے۔ لیکن فرانس جیسے ملک میں، جہاں کلیسا اور ریاست کو علاحدہ کر دیا گیا ہے، فرقہ پر مبنی پرائیویٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی تعداد حیرت انگیز طور پر بڑی ہے، جو کہ مثال کے طور پر آسٹریا سے بھی بڑی ہے۔

مذہبی تعلیم کے معاملے میں، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، بہت سے نمونے موجود ہیں۔ یہ تمام نمونے خود کو درج ذیل طریقے سے واضح کرتے ہیں :

- کیا اسکولوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام ہے یا نہیں؟
- کیا مذہبی تعلیم کا انتظام ریاست کی طرف سے ہے یا پھر مذہبی فرقہ کی طرف سے؟
- کیا یہ لازمی، اختیاری یا آزاد موضوع کا درجہ رکھتا ہے؟
- مذہبی تعلیم دینے والے اساتذہ کو تربیت کیسے دی جاتی ہے؟
- مذہبی تعلیم کے اساتذہ کا تقرر کون کرتا ہے؟
- نصاب اور تعلیمی مواد کا تعین کون کرتا ہے؟
- مذہبی تعلیم اور دیگر مضامین میں کیا رشتہ ہے؟

اور آخر میں جو کہ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے :

- مذہبی تعلیم کا خرچہ کون اٹھاتا ہے؟

ظاہر ہے کہ ان تمام چیزوں کا اثر اس بات پر پڑتا ہے کہ مختلف فرقوں کی مذہبی تعلیم کے اساتذہ کے درمیان کتنا رابطہ اور میل جول ہے یا کس طرح مشترکہ مذہبی اقدار کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک تعلیم بالغاں کا تعلق ہے، تو اس کا انتظام پورے یورپ میں ہے جو کہ تاحیات تعلیم سے کم نہیں ہے اور جو لگاتار پھیلتی ہوئی سول سوسائٹی میں زیادہ سے زیادہ اہم بنتی جا رہی ہے۔ کلیسا نے اس کی پہل بہت پہلے کر دی تھی تاکہ آج کل زیادہ تر یوروپی ممالک میں تعلیم بالغاں کو حقیقی طور پر کلیسا کی مثالی سرگرمی کے طور پر دیکھا جا سکے۔ حالانکہ یہ میرے موضوع سے الگ ہے لیکن میں تاحیات تعلیم کے تصورات اور مشترکہ مذہبی اقدار کو پیش کرنے

کے مواقع کے درمیان موجود تعلق پر زور دینا چاہتا ہوں۔ تصوراتی مواقع کا تعلق بھی وسیروٹا کی آئندہ سرگرمی کا ایک دلچسپ موضوع ہوگا۔

2. مذہبی وقانونی تنظیم کاری اور مذہبی تعلیم

تعلیمی امور کو ریاستی اختیار میں شامل کرنے سے انفرادی یوروپی ریاستوں میں بہت سے نتائج سامنے آئے ہیں :

- زیادہ تر ممالک میں اسکولی تعلیم میں کلیسا کا اثر مذہبی تعلیم تک ہی محدود رہا جو کہ بنیادی طور پر اب بھی قائم ہے، جب کہ اس کے ساتھ ساتھ ریاستی نگرانی میں اضافہ ہوا ہے۔
- جہاں پر ریاست اور کلیسا کی علاحدگی پر سختی سے پابندی کی جاتی ہے وہاں پر پبلک اسکولوں سے مذہبی تعلیم کو خارج کر دیا گیا۔
- ریاست اور ریاستی کلیسا کے درمیان باہمی تعلق والے اداروں میں ریاست نے اپنی ذمہ داری میں ریاستی مذہب کی تعلیم کو جاری رکھا ہے۔

ریاست اور کلیسا کے درمیان رشتہ کی وضاحت ریاست بھر میں دی جانے والی مذہبی تعلیم سے ہوتی ہے جو ریاستی کلیسا سے ملحق تنظیموں کے ذریعے فراہم کی جاتی ہے جن کی کئی شکلیں ہیں۔ ان میں سے بعض تو فرقہ پر مبنی تنظیموں کے اتحاد سے یا پھر متعینہ اصولوں کے ذریعے پبلک اسکولوں میں یہ تعلیم فراہم کی جاتی ہے یا پھر پبلک اسکولوں سے مذہبی تعلیم کو خارج کر دیا جاتا ہے۔

یہ منحرف روایات جو کہ مذہبی تعلیم کی بنیادی قسمیں ہیں، حالیہ دہائی میں تین قابل امتیاز لیکن باہم مربوط مظاہر میں پھیل گئی ہیں :

1- بنیادی طور پر یہاں ہمیں حقوق انسانی اور بنیادی آزادیوں کے تحفظ کے لیے

یوروپی کنونشن کے پروٹوکول نمبر 1 کی دفعہ 2 کا حوالہ دینا ہوگا۔ ''احترام کرنے کا دعویٰ''، جس کی تشکیل وہاں پر ہوئی تھی، اس کے تحت ریاست اس بات کے لیے مجبور نہیں ہے کہ وہ والدین کے مذہبی یا فلسفیانہ عقیدے کے مطابق تعلیم کو یقینی بنائے، بلکہ اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ سرکاری تعلیمی نظام کے ڈھانچہ کے اندر رہتے ہوئے وہ ان کے اس عقیدے کا احترام کرے (یعنی تعلیمی کثرت الوجود کو تحفظ فراہم کرے)۔ جیسا کہ اسٹراس برگ کی عدلیہ کے ذریعے بیان کیا گیا کہ والدین کا حق دفاع کے کلاسیکی لبرل حق میں ضم نہیں ہوتا ہے بلکہ ریاست کی اس ذمہ داری کی نشاندہی کرتا ہے جس کے تحت ریاست اسکولی قسم کے کثرت الوجود اور اسکولوں میں کثرت الوجود کے تحفظ کے لیے مثبت حفاظتی اقدام کرتی ہے۔ لیکن والدین کے حقوق کی اس یقین دہانی سے نہ تو بعض تعلیمی اداروں یا منظور شدہ اسکولوں کو قائم کرنے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ایک ایسے تعلیمی نظام کو قائم کرنے کی بات اخذ کی جا سکتی ہے جو والدین کے بعض مذہبی یا فلسفیانہ عقیدے سے مطابقت رکھتا ہو۔ ریاست جب ہدایات اور تعلیم کے میدان میں سرگرم عمل ہوتی ہے تو اس پر یہ پابندی عائد کر دی جاتی ہے کہ وہ تعلیمی پروگرام سے متعلق کسی بھی مواد میں مذہبی یا فلسفیانہ مواد کو شامل نہ کرے۔

2- والدین کے اختیار کے ساتھ ساتھ فرد کی مذہبی آزادی پر زور سے بعض مخصوص تضادات پیدا ہوئے پھر بھی اس کے نتائج ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔

- عام طور پر پہلی قسم کی ریاستوں (’ریاست کلیسا‘) میں مذہبی تعلیم سے متعلق ریاست کی ذمہ داری بدستور قائم رہتی ہے۔ ان قانونی یقین دہانیوں کی بدولت جو مذہبی آزادی کو تحفظ فراہم کرتے ہیں، مذہبی تعلیم میں دیگر مذاہب کو بھی پیش کرنے کا ایک تغیر پیدا ہوا، یعنی ایک ایسے نظام کو قائم کرنا جس کے تحت مذہب اور اخلاق کا تقابلی مطالعہ کیا جا سکے۔ اس کی مثالیں برطانیہ کے

اسکول ہیں جن کو یا تو ریاست کے ذریعے حمایت حاصل ہے یا پھر وہ آزاد ہیں۔ ہر اس اسکول میں جسے ریاست کی حمایت حاصل ہے، وہاں معیاری نصاب میں مذہبی تعلیم کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ بعض ایسے بھی ادارے ہیں جہاں مسیحی تعلیم حاصل کرنا لازمی ہے۔ 1970 کے وسط میں متعدد مذاہب کی تعلیم کا نصاب تیار کیا جانے لگا جس میں اسلام کی نمائندگی پر خاص توجہ دی گئی۔ لیکن اس طرح کی تعلیم کی تنقید عیسائی قدامت پسندوں کے ساتھ مسلمانوں نے بھی کی جس کی وجہ تعلیم نظام کی کثیر ثقافتی بنیاد تھی۔

- دوسری قسم کی ریاستوں میں، جہاں مذہبی غیر جانبدارانہ طور پر مذہب کے سول سوشل اتحاد پر زور دیا گیا تھا، وہاں فرقہ پر مبنی مذہبی تعلیم دینے کے حق کی منظوری مذہبی فرقوں کے لیے دی گئی تا کہ مذہبی قانونی اصول کی برابری بنی رہے۔ ان ریاستوں کو معاشرتی یا تاریخی طور پر کیتھولک یا بائی ڈینومینیشنل کہا گیا۔ اس قسم کی انفرادی ریاستوں میں موجود اختلاف کی بنیادی طور پر تعریف غیر کیتھولک اقلیتی فرقہ کے سائز اور بائی ڈینومینیشنل ہونے کے درجہ کے طور پر کی گئی۔ اس گروپ سے متعلق بعض ریاستوں، جیسے اٹلی میں مذہبی تعلیم میں کیتھولک کو ترجیح دی گئی۔

ان ریاستوں میں جہاں فرقہ پر مبنی منظم مذہبی تعلیم کا انتظام ہے، وہاں اسے عوامی تعلیم کے مماثل بنانے کی ذمہ داری ریاست کی ہے۔ پبلک اسکولوں میں فرقہ پر مبنی تعلیم کے احساس کے ساتھ ساتھ مذہبی فرقوں نے اپنی طرف سے تعلیم کے مرکزی مقصد کو پورا کرنے کی ذمہ داری قبول کی، خاص کر آزاد اور جمہوری معاشرہ کے مفاد کے لیے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے اس قسم کی تعلیم

کا نظام پہلے سے ہی ہے، خاص کر آسٹریا اور بیلجیم میں۔

- ان ریاستوں میں جہاں کلیسا اور ریاست ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں، اس تغیر سے، یعنی مذہبی طول وعرض سے مکمل طور پر مذہب کو کاٹنے سے پہلے تو کوئی حقیقی تبدیلی رونما نہیں ہوئی لیکن کسی بھی مذہبی فرقے کے خلاف کوئی امتیاز نہیں برتا گیا۔ فرانس میں جہاں پر اس قسم کا نظام موجود ہے، وہاں پر مذہبی تعلیم کا انتظام صرف فرقہ پر مبنی پرائیویٹ اسکولوں میں ہے جو کہ روایتی طور پر کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن پرائیویٹ اسکول چونکہ معاہدہ کے پابند ہوتے ہیں، اس لیے مذہب کی بنیاد پر دیگر معاملوں کے ساتھ ساتھ وہ طلبا کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتتے بلکہ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے ہیں۔ اس لیے ان اسکولوں میں مذہبی تعلیم حاصل کرنا لازمی نہیں ہے۔

اس طرح کے معاملات میں بھی عام تعلیمی مقاصد کو پورا کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ فی الحال فرانس میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے اداروں کو قائم کرنے کی بات چل رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا اس لیے کیا جا رہا ہو کیوں کہ سرکار کی طرف سے متعدد مذاہب کے منظر عام پر آنے اور ان کی شہرت کی وجہ سے اس پر خاصی توجہ دی گئی ہے۔ یہ ذہن نشین کرنا نہایت ضروری ہے کہ پبلک اسکولوں سے مذہبی تعلیم کو ختم کرنے کا سب سے اہم اور اصلی سبب ریاست کو کیتھولک چرچ کے چنگل سے گلوخلاصی حاصل کرنا تھا جو کہ ممکن نہیں ہے۔

ان ریاستوں میں نصاب سے الگ ہٹ کر مذہبی تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہے، جو کہ چونکہ عوامی کنٹرول سے باہر ہے اس لیے اس میں شفافیت کے ختم

ہونے کا اندیشہ لاحق ہے جو کہ کسی بھی آزاد معاشرہ کا بنیادی معاشرتی ضابطہ کہلاتا ہے۔

3- تیسری شکل جس پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے وہ 1970 اور 1980 کے عشرے کی وہ اصلاحات ہیں جن کا تعلق تعلیم اور اسکولنگ سے ہے اور جن کا لینا دینا مذہبی تعلیم سے بھی ہے۔ ان اصلاحات میں پہلے مذکور ہو چکی وہ پیش رفتیں بھی شامل تھیں جن کا تعلق تدریسی اصولوں سے ہے جو لازمی طور پر کلیسا سے ٹکراتی ہیں۔ جدید دور کے تقاضوں کے مدنظر عمومی طور پر مواد کی اور خصوصی طور پر مقدس کتاب کی تشریح پر ایک لمبے عرصے تک توجہ مرکوز کرنے کے بعد ایک نئی مذہبی تعلیم کا انتظام کیا گیا جو کہ مذاہب کے تقابلی مطالعہ پر مبنی ہے جس کا مقصد کسی مذہب کی مخالفت کیے بغیر بنیادی مذہبی تعلیم فراہم کرنا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسی مذہبی تعلیم ابھر کر سامنے آئی جو طلبا کی طرف مائل تھی، یعنی اس نے طلبا پر فوکس دینا شروع کیا، ان کے سوالات اور مسائل پر توجہ مرکوز کی اور کلاس میں صرف ان ہی چیزوں کو موضوع بحث بنایا جو طلبا کی زندگی سے متعلق ہوں۔ سب سے جدید اس ہم نسبت مذہبی تعلیم کا مقصد طلبا کی زندگی اور مذہبی فرقے کے عقیدے کو یکساں درجہ عطا کرنے کے بعد ان کے درمیان موجود تمام اچھی چیزوں اور عقائد کو جمع کرنا ہے تا کہ ان کا باہمی رشتہ اور اتحاد برقرار رہے۔

3. آخری مشاہدات

مجموعی طور پر تمام یوروپی ممالک میں ہم قدیم مذہبی و سیاسی ڈھانچے کا مشاہدہ کر سکتے ہیں جن کی شناخت فرقہ پر مبنی اسکولی نظام اور مذہبی تعلیم سے بالکل الگ ہے۔ 1970 اور 1980 کے عشرے میں اصلاحات کی وجہ سے ہم تمام یوروپی ممالک میں مختلف قسم کے میلانات دیکھتے ہیں، جن کو اختصار کے ساتھ ذیل میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے :

- مذہبی آزادی اور مساوات کے رجحان کی وجہ سے کلیسا کے ذریعے مذہبی تعلیم

دیے جانے کے اختیار میں کمی آتی ہے۔

- عیسائی کلیساؤں کی زیادہ سے زیادہ امداد پہنچانے کی فطرت سے اس قسم کی ایک عالمگیر فطرت پیدا ہوتی ہے، جسے اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ مذہبی فرقوں کو آپس میں ملانے کا کام کرتی ہے۔
- اوپر مذکور باہمی تعاون کے جذبے اور مذہبی معاملات میں ریاست کے غیر جانبدارانہ رویے سے مذہبی تعلیم کے میدان میں تقابلی مذہبی فطرت پیدا ہوتی ہے۔

اس قسم کی پیش قدمیوں سے مذہبی فرقوں کو چیلنج کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ مذہبی تعلیم کو ایک بند مقام تک محدود نہیں کیا جا سکتا جہاں پر اسے تنقید کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ بلکہ اسے عوامی مقامات پر پیش کرنے کی ضرورت ہے تا کہ اس کے بارے میں تنقیدی بحثیں ہوں۔ وہاں پر مذہب کی صداقت کو خطرہ لاحق ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مذہب کو سماجی نظام میں سرگرم عمل ہونے دینا چاہیے اور اسے سماج میں مشترکہ اقدار کو پیش کرنے دینا چاہیے، چاہے وہ معاشرہ کتنا ہی آزاد اور کھلے ذہن کا کیوں نہ ہو۔

سوالات و مداخلات

مذہبی تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے والدین کا حق

صالحہ ایس محمود :

اگر میں نے پروفیسر پوٹز کو ٹھیک طرح سے سمجھا ہے تو، یہ والدین کا حق ہے کہ وہ اپنے بچوں کو مذہب کی تعلیم دلوائیں اور یہ بات واضح طور پر کہی گئی کہ مذہبی تعلیم دلوانا ریاست کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس لیے وہ نظام جو والدین کے اس حق کو یقینی بناتا ہے، اس کا تعلق ریاست کے ذریعے مذہبی تعلیم فراہم کرنے کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب مذہبی تعلیم فراہم کرنے کی والدین کی ذمہ داری میں رکاوٹ ڈالنا نہیں ہے۔

پوٹز :

(یورپ کے) حقوق انسانی کے تحفظ اور بنیادی آزادی کے پروٹوکول نمبر 1 (1952) کے مطابق ''ریاست والدین کے حق کا احترام کرے گی جس کے تحت وہ اپنے مذہب اور فلسفہ کے مطابق تعلیم کو یقینی بناتے ہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کو اس حق کا احترام کرنا پڑے گا اور نہ صرف یہ کہ اس میں مداخلت نہیں کرنی ہوگی۔ اس کے لیے عوامی تعلیم اور تدریس کے میدان میں ریاست کو ناہموار نظریاتی تعلیم کا انتظام نہیں کرنا چاہیے۔

آسٹریائی حالات کی مثال کو پیش کرتے ہوئے میں اس حقیقت کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں کہ آسٹریائی اسکولی نظام کے اہم مقاصد میں سے ایک مذہبی تعلیم کی فکر کرنا بھی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اسکول میں مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کی قانونی اساس حاصل ہوتی ہے۔ عطا کردہ آئینی بنیاد کے مطابق مذہب کے تئیں وفادار شخص کو آسٹریا میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کا پورا اختیار ہے۔ یہ اس سے کہیں زیادہ ہے جس کا ذکر حقوق انسانی کے تحفظ کے یورپی کنونشن میں ہے۔

مذہبی تعلیم فراہم کرنے میں پرائیویٹ اور ریاستی اسکولوں کا رول

صالحہ ایس محمود :

میں یہاں پر جس بات کا مزید ذکر کرنا اہم سمجھتی ہوں وہ یہ کہ یورپ کے پرائیویٹ اسکولوں کا تعین فرقہ وارانہ طور پر ہوتا ہے۔ جب کہ دوسری جانب کئی اسلامی ممالک میں زیادہ تر پرائیویٹ اسکول جو کہ بہت زیادہ سیکولر ہوتے ہیں اور ماڈرن لبرل ایجوکیشن فراہم کرتے ہیں وہ فرقہ وارانہ نہیں ہوتے۔ اس لیے اسلامی ممالک میں مذہبی تعلیم کا انتظام پرائیویٹ اسکولوں کے بجائے ریاستی اسکولوں میں ہوتا ہے۔ کیا تضاد ہے؟

پوٹز :

اس کے پیچھے آپ یورپ میں تاریخی عوامل کو کارفرما پائیں گے۔ یہاں پر اسکولی نظام پر ریاست کا کنٹرول مختلف طریقے سے ہوتا ہے۔ اور اسی لیے تمام یوروپی ممالک میں ریاستی اسکول سیکولر ہوتے ہیں جب کہ پرائیویٹ اسکول فرقہ وارانہ ہوتے ہیں۔ واقعی اس تضاد پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اقبال :

میں ڈاکٹر صالحہ ایس محمود کے اس مشاہدہ پر کہ 'اسلامی ممالک کے زیادہ تر پرائیویٹ اسکول غیر فرقہ وارانہ ہوتے ہیں'، ایک معمولی تبصرہ کرنا چاہوں گی: درحقیقت دو طرح کے پرائیویٹ اسکول ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو امرا کے اسکول ہیں جنھیں کسی طرح غیر مذہبی ہونے کا اختیار حاصل ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ہمارے ہاں مدرسے بھی ہیں جو کہ پوری طرح پرائیویٹ اسکولی نظام ہے اور ظاہر ہے اسی لیے ان پر پوری طرح مذہب کا غلبہ ہے۔ لہٰذا یہ مدرسے مختلف مسلکوں سے تعلق رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں بے شمار پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

والدین کا حق اور بچوں کے حقوق

بیلا ربی :

میں اوپر ذکر کیے گئے حقوق انسانی کے تحفظ کے یوروپی کنونشن کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گی۔ وہاں پر والدین کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے بچوں کو مذہبی طور طریقے سے تعلیم دیں۔ لیکن کچھ حد تک اس کی مخالفت بچوں کے حقوق کے کنونش (1989) کے ذریعے کی جاتی ہے، جس کے تحت بچوں کو ''سوچنے، سمجھنے اور مذہب کی آزادی'' (دفعہ 14) حاصل ہے۔ کیا اس سے تھوڑا بہت مخمصہ نہیں پیدا ہوتا؟ ایک طرف تو والدین کو یہ اجازت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دیں اور دوسری طرف بچوں کو اپنی مرضی سے مذہبی عقیدہ کو اختیار کرنے کا حق دیا جاتا ہے۔ میرے خیال سے یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر زیادہ تر اسلامی اور عرب ممالک اس کنونشن کو اپنی غیر مشروط منظوری نہیں دیتے۔

پوٹز :

میں حقوق انسانی کے تحفظ کے یوروپی کنونشن کے پروٹوکول کا ذکر اس لیے کر رہا تھا کیوں کہ بچوں کے حقوق کے کنونشن کے برخلاف وہ ضابطے جو حقوق انسانی کے تحفظ کے یوروپی کنونشن میں شامل ہیں، انھیں قانون کے ذریعے پیچھے دھکیلا جاسکتا ہے۔ دراصل، اسٹراس برگ کی قانونی عدالت کے ذریعے صادر کیے گئے زیادہ تر فیصلے اسی اضافی پروٹوکول کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

پروفیسر بیلا ربی نے مذہبی تعلیم کے تئیں والدین اور بچوں کے حقوق کے درمیان جس مخمصے کا ذکر کیا وہ بالکل درست ہے۔ یہ آسٹریا پر بھی صادق آتا ہے جہاں 14 سال یا اس سے زیادہ عمر کے بچے کو اپنی مرضی سے مذہب کو اختیار کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے، اسی لیے 14 سے 18 سال کی عمر تک بچوں پر والدین کا حق بہت محدود ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اس سے پہلے کے اپنے اجلاس میں میں نے ایک خاص معاملے کی مثال پیش کی تھی۔

اس کے مطابق آسٹریا یا جرمنی کا 14 سال کا کوئی نوجوان اپنے مذہب کو چھوڑنے کے حق کا دعویٰ کر سکتا رسکتی ہے۔ لیکن گھر کے اندر اسے کچھ حد تک اب بھی والدین کے اختیار میں رہنا پڑتا ہے۔ قانونی مفہوم میں اس مسئلے کا حل نکال پانا بہت مشکل ہے اور اسی لیے اس قسم کے معاملے عدالتوں کے لیے بھی پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ دوسری جانب کوئی شخص 14 سال کی عمر پر زور دینا چاہتا ہے کیوں کہ مذہبی فیصلہ سب سے ذاتی فیصلہ ہوتا ہے جسے زندگی میں پہلے بھی لیا جاسکتا ہے۔

سیکولرازم کے متعدد نظریات تعلیمی نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں

طاہر محمود :

میرے خیال سے اس بات کو عام طور پر قبول کیا جاچکا ہے کہ سیکولرازم کے بارے میں مشرق و مغرب کے اپنے اپنے نظریات ہیں۔ اس کا بھی تعلیمی نظام پر اثر پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستانی آئین تین قسم کے تعلیمی اداروں کو مانتا ہے: پہلی قسم کے وہ تعلیمی ادارے ہیں جو ریاست کے ذریعے قائم کیے گئے ہیں اور جنھیں مالی تعاون پوری طرح ریاست سے ہی حاصل ہوتا ہے؛ ان اسکولوں کو یہ حکم صادر کیا گیا ہے کہ وہ کسی قسم کی مذہبی تعلیم نہ دیں۔ لیکن وہ اسکول جو ریاست کے ذریعے قائم نہیں کیے گئے ہیں بلکہ انھیں ریاست سے مالی امداد حاصل ہوتی ہے، انھیں مذہبی تعلیم دینے کی اجازت عطا کی گئی ہے لیکن وہ بھی صرف رضا کارانہ طور پر، ان اسکولوں میں مذہبی تعلیم فراہم کرنے کے فیصلے کا انحصار پوری طرح والدین کی آزادانہ منظوری پر ہوتا ہے۔ تیسری قسم کے وہ اسکول ہیں جو نہ تو ریاست کے ذریعے قائم کیے گئے ہیں اور نہ ہی انھیں حکومت سے کوئی مالی تعاون ملتا ہے؛ انھیں اس بات کی مکمل آزادی حاصل ہے کہ وہ مذہب کے بارے میں جو کچھ بھی مناسب سمجھیں اس کی تعلیم دیں۔ اور یہ تیسری قسم کے ہی اسکول ہیں جن کے تحت بے شمار مدرسے آتے ہیں، جو پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مغربی تعلیمی نظام، جس کی وضاحت پروفیسر پوٹز نے کی، اور ہندوستانی نظام تعلیم (پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی اسی طرح کا نظام ہے) کے درمیان جو اختلاف ہے، وہی مشرق کے سیکولرازم کی خاصیت ہے، جو ہمارے سیکولر نظریہ کی ترجمانی کرتا ہے لیکن ساتھ ہی مذہب اور ریاست کے درمیان ایک خط تقسیم بھی کھینچتا ہے۔

آسٹریا کے مخصوص ضوابط

پوٹز :

نقطۂ آغاز کے طور پر میں ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا : ویانا میں ایک فرانسیسی اسکول 'لیسی فرینکائس ڈے وئینے' ہے جسے آسٹریا اور فرانس کے درمیان ہونے والے معاہدے کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے اور جہاں پر آسٹریائی اور فرانسیسی ڈپلوما کا انتظام ہے۔ اسی لیے یہ فرانسیسی ریاست کے ذریعے چلایا جانے والا اسکول ہے جہاں پر مذہبی تعلیم کا بھی انتظام ہے کیوں کہ بیک وقت یہ ایک آسٹریائی اسکول بھی ہے جس کے تحت مذہبی تعلیم دینا لازمی ہے (اس حقیقت کے علاوہ کہ خود فرانس میں بھی، تین مقامات پر جو 1905 تک جرمنی کے قبضے میں تھے، وہاں پر بھی مذہبی تعلیم کا انتظام ہے)۔

لہٰذا آسٹریا میں سیکولر ریاست، مذہب اور ریاست کے درمیان کوئی خط تقسیم نہیں کھینچتی بلکہ معتدل رویہ اختیار کرتی ہے؛ جہاں پر مذہب کو قدرت کے مظہر کے طور پر شامل کیا جاتا ہے لیکن غیر جانبداری کے نظریہ سے، اسے ایک لازمی سماجی مظہر کے طور پر قبول کیا جاتا ہے لیکن کسی خاص مذہب یا فلسفہ کو کسی پر ترجیح نہیں دی جاتی۔

.....اور جرمنی میں

خوری :

جہاں تک جرمنی میں مذہبی تعلیم کا سوال ہے تو وہاں پر ریاست کی ذمہ داری نہ تو نصاب

کا تعین کرنا ہے اور نہ ہی تعلیمی موضوعات کو طے کرنا، جو کہ حقیقتاً انفرادی مذہبی فرقہ کی ذمہ داری ہے۔ اسی لیے جرمنی میں مذہبی تعلیم ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے کیوں کہ وہاں کے مسلمان ریاست کے ہم جنس مصالحتی حصہ دار نہیں ہیں۔ بالفاظ دیگر، وہاں پر کوئی بھی ایسا عملہ نہیں ہے جو اس کام کو ریاست سے حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن چونکہ ریاست بھی اسکولوں میں باقاعدہ اسلامی تعلیم کو قائم کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے، مثال کے طور پر شمالی رھائن ویسٹ فیلیا میں ایک نصاب متعارف کرایا گیا جس میں بعد میں ریاست نے اسلامی مطالعہ کے ایک ماہر اور تدریس کے پروفیسر، جو کہ عیسائی مذہب کے ماننے والے تھے، کی مدد سے اس نصاب میں توسیع کی۔ اس کے بعد اس نصاب کو عنقرہ اور قاہرہ کے ماہرین اسلامیات کے پاس بھیجا گیا جنھوں نے اسے منظوری دے دی اور کہا کہ اس نصاب کو متعارف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جرمنی کے مسلم فرقہ نے اس کی مخالفت کی جس کی وجہ سے اس نصاب کو رد کر دیا گیا۔

جہاں تک اسلامی پرائیویٹ اسکولوں کا معاملہ ہے تو وہ اکثر ناکام رہتے ہیں جس کی سب سے پہلی وجہ یہی ہے کہ یہ اسکول ان افراد کے ذریعے چلائے جاتے ہیں جو عوامی عہدیداروں کے بقول، اس قسم کے اسکول کو چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتے؛ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان اسکولوں میں تعلیمی مواد کے بعض حصوں کو مخفی رکھا جاتا ہے، اور ناکامی کی تیسری وجہ یہ ہے کہ ان اسکولوں کے اساتذہ پوری طرح قابل اور تعلیم یافتہ نہیں ہوتے۔

حکومت نے اب تین چیئر قائم کیا ہے، ایک ہیڈل برگ یونیورسٹی میں اور بقیہ دو مؤنسٹر اور فرینک فرٹ یونیورسٹی میں لیکن مشکل یہ ہے کہ ایسے بہت کم طلبہ ہیں جو اس کورس کا انتخاب کرتے ہیں اور اس کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

عیسائی اور مسلم اقلیتوں کے لیے متوازی حالات

صالحہ ایس محمود :

ڈاکٹر خوری کے تبصرہ میں تھوڑا اضافہ کرنا چاہتی ہوں۔ جرمنی میں عیسائیوں کی، چاہے وہ کیتھولک ہوں یا پروٹیسٹینٹ، ان کی مذہبی تعلیم کی حالت کے بارے میں مزید جانکاری حاصل یقیناً دلچسپی کا باعث ہے۔ جب ہم مسلم اقلیتی فرقوں کے مسائل کے بارے میں سنتے ہیں، تو ہمیں ان کی مختلف جغرافیائی جائے پیدائش اور ثقافتی پس منظر کے بارے میں پوری جانکاری ہونی چاہیے؛ ان میں سے کچھ تو وہ لوگ ہیں جو مذہب تبدیل کر کے مسلمان بنے ہیں؛ کچھ اقلیتی فرقے وہ ہیں جو دوسری جگہوں سے ہجرت کر کے یہاں آئے ہیں اور بعض ایسے ہیں جنھوں نے اپنے ملک وعلاقہ میں تباہی کے باعث یہاں پناہ لے رکھی ہے۔ لہٰذا ان کے مسائل نہایت ہی الگ قسم کے ہوسکتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے لیے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ عیسائی اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والے افراد کو بھی اسکولوں میں اس قسم کے کتنے متوازی مسائل کا سامنا ہے۔ ان میں سے بعض چیزیں تو مختلف ہوسکتی ہیں لیکن بعض متوازی بھی ہوسکتی ہیں۔

پوٹز :

ڈاکٹر صالحہ ایس محمود نے ابھی جو سوال اٹھایا، ٹھیک اسی طرح کی ایک مثال عیسائی راسخ الاعتقاد فرقہ کے تعلق سے آسٹریا میں دیکھنے کو ملی۔ سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو مدنظر رکھنا ہوگا کہ حالیہ 20 سے 25 برسوں کے دوران ہجرت کر کے ویانا میں باہر سے آنے والے ترکی سے نہیں ہیں بلکہ یہ افراد یہاں پر سربیا اور بوسنیا سے آئے ہیں۔ اس لیے سربیائی کٹر مذہبی تعلیم کا مسئلہ واقعی حقیقی ہے۔ ایک بار ایک مصری نژاد قدامت پسند البانیائی خاتون اپنی بیٹی کو کٹر مذہبی تعلیم دلوانا چاہتی تھی۔ لیکن جب اسے یہ بات معلوم ہوئی کہ استاد ایک سرب ہے تو اس

نے اپنی بیٹی کو غیر فرقہ واری قرار دے دیا اور اسے رضا کارانہ طور پر کیتھولک کلاس میں بھیج دیا، کیوں کہ البانین ہونے کے ناطے یہ بات اس کے وہم وگمان سے پرے تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو سربیائی کٹر مذہبی تعلیم دلائے، حالانکہ دونوں ایک ہی مذہب کو مانتے ہیں۔ آسٹریا میں بھی مشترکہ اسلامی مذہبی تعلیم کے بجائے مشترکہ کٹر مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا اور بھی مشکل ہے کیوں کہ یہاں پر مختلف ممالک (سربیا، البانیا، رومانیا، روس وغیرہ) کے باشندے رہتے ہیں۔

ہندوستانی حالت کے بارے میں خاص سوالات

گیبریل :

پروفیسر طاہر محمود کی موجودہ مداخلت کو دیکھتے ہوئے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا ہندوستان میں مدرسوں کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ ایسا سرٹیفکیٹ جاری کریں جسے ریاست منظوری دیتی ہو۔ دوسرا سوال یہ کہ : ہندوستانی بچوں کو کس عمر میں یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہیں اختیار کریں؟

طاہر محمود :

ہندوستان کے قومی قانون کے مطابق بچے کو اپنی پسند کے مذہب کو اختیار کرنے کا حق بالغ ہونے پر حاصل ہوتا ہے، یعنی 18 سال کی عمر میں۔ 18 سال کی عمر سے پہلے اسے اپنے والد کے مذہب کو ماننا پڑتا ہے۔

مدرسہ کے بارے میں : ہندوستان میں دو قسم کے مدرسے ہیں۔ پہلی قسم کے مدرسوں میں سیکولر و مذہبی ملی جلی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان مدرسوں کو ریاست کی پوری منظوری حاصل ہے اور زیادہ تر ریاستوں میں ان مدرسوں کو چلانے اور ان کی ضابطہ بندی کے لئے مخصوص قوانین ہیں۔ ان مدرسوں کی ڈگریوں اور ڈپلوما کو ریاست کی منظوری حاصل ہے۔

اس کے علاوہ دوسری قسم کے وہ مدرسے ہیں جہاں پر صرف مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔

ان کے لیے نہ تو رجسٹری کرانے کی قانونی ضرورت ہے اور نہ ہی ان کی ڈگریوں اور ڈپلوما کو ریاست کوئی منظوری دیتی ہے۔

پوٹز :

جرمنی میں اسلامی مذہبی تعلیم کی حالت کے بارے میں پروفیسر خوری کے مشاہدے میں میں ایک اور لفظ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سب 1912 کے خوش قسمت تاریخی واقعہ کی بنا پر ممکن ہوا، بوسنیا پر قبضہ کے بعد ایسٹرو ہنگیرین سلطنت کے مسلم باشندوں کو قانونی حیثیت حاصل ہوئی اور انھیں مکمل برابری کا درجہ حاصل ہوا اور اسی کے تحت مسلم مذہبی فرقہ کو ہم جنس ڈھانچے کا درجہ عطا کیا گیا۔ یہاں پر ریاست ایک سرکاری رابطہ میں ہے اور اسے عمومی طور پر بعض چیزوں کا جواب دینے کا اختیار حاصل ہے۔ اس لیے یہاں پر کسی قسم کے مقابلہ کا سوال نہیں کھڑا کیا جاتا کیوں کہ آسٹریا کے قومی قانون کے مطابق ہر منظور شدہ مذہبی فرقہ کو قانونی طور پر اس طرح کے اسکولوں کو چلانے کا اختیار حاصل ہے، چاہے وہ مسلمان ہوں، بودھ ہوں یا پھر مورمونس۔

میں یہاں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ اس سال موسم خزاں سے ویانا یونیورسٹی بھی اسلامی مذہبی تعلیم کی ماسٹر ڈگری کا انتظام کرنے جارہی ہے۔ اس کے تحت یہ منصوبہ تیار کیا گیا ہے کہ اس میں وہی طلبا حصہ لیں گے جنھوں نے پہلے سے ہی اسلامی مذہبی تدریسی اکیڈمی میں تین سال کا نصاب مکمل کیا ہو اور کسی قسم کی بیچلر ڈگری حاصل کی ہوتا کہ وہ ویانا یونیورسٹی میں ماسٹر ڈگری کے لیے اپنی اس تعلیم کو جاری رکھ سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مذہبی تدریس کا ایک چیئر قائم کیا گیا ہے جس کا موازنہ اوپر مذکور مؤنسٹر یا فرینک فرٹ یونیورسٹی سے کیا جاسکتا ہے۔

مذہبی کتابوں اور جدید قوانین میں تعلیم کا حق

طاہر محمود

ابتدائیہ

اس سال کے اوائل میں حکومت ہند نے ایک منصوبے کا اعلان کیا ہے جس کے تحت اعلیٰ سطحی عام اور پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں میں سماج کے پسماندہ طبقوں کے لیے کوٹہ مختص کیا گیا ہے۔ چونکہ اس قسم کا کوٹہ جو 1950 سے ہی چلا آرہا ہے تین مذہبی فرقوں اور چنندہ قبائلی گروپوں تک محدود تھا نیا مجوزہ کوٹہ خصوصاً دوسرے مذہبی گروپوں میں پسماندہ لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ پہلے سے موجود تحدیدی کوٹہ پر کسی نے اعتراض نہیں کیا لیکن پیشہ ورانہ اور زیر تربیت طلباء نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا مگر حکومت اسے روکنے میں ناکام رہی اور یہ احتجاج تشدد میں بدل گیا۔ آخر کار یہ معاملہ ملک کی عدالت عظمیٰ تک پہنچا۔ اس نے احتجاج کرنے والوں کو متنبہ کیا کہ وہ اپنے رویئے میں تبدیلی لائیں اور ساتھ ہی اس نے حکومت سے نئے کوٹے سے متعلق منصوبے کے جواز اور اس کے قابل عمل ہونے کی بابت وضاحت طلب کی۔ چونکہ ہمارے ملک میں عدلیہ کا یہ وطیرہ بن چکا ہے کہ اسکے ہاتھوں کسی بھی معاملے کا فیصلہ بلا تاخیر نہیں ہوتا اس لیے اس معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور عارضی طور پر یہ معاملہ دب بھی گیا مگر میں بار بار اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ اگر حکومت بلا امتیاز نسل و ذات سوسائٹی کے تمام پسماندہ طبقوں کے لیے تعلیمی مواقع فراہم کرنے کے معاملے میں مساوات کے حصول کے لیے کوئی قدم اٹھاتی ہے تو آج کے طلباء کا ایک طبقہ اس پر کیوں اس قدر چیں بجبیں ہوتا ہے۔ کیا ہندوستان ایک ایسا ملک نہیں ہے جس کا آئین تمام شہریوں کو

مساوات اور انصاف کی ضمانت دیتا ہے اور مملکت کو بتاکید یہ حکم دیتا ہے کہ وہ بغیر کسی امتیاز کے سماج کے تمام طبقوں کی تعلیمی و معاشی ضروریات کی جانب خصوصی توجہ دے۔

ابھی میں متذکرہ بالا سوالات کے جوابات کا متلاشی ہی تھا کہ میری اپنے ملک کے دو مؤقر اخبارات میں دنیا کے دیگر حصوں سے متعلق دو پریشان کن خبروں پر نظر پڑی۔ یکم جون کے ٹائمس آف انڈیا نے اپنے قارئین کو اس خبر سے آگاہ کیا کہ برطانیہ جیسے ملک نے جو مکمل طور پر ایک ترقی یافتہ ملک ہے اور جو انسانی حقوق سے متعلق قوانین کی علمبرداری کا ہمہ وقت دم بھرتا ہے 'یوروپی یونین اور غیر یوروپی یونین' ڈاکٹروں کو ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد الگ الگ زمروں میں رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلہ کے خلاف برٹش ایسوسی ایشن آف فزیشینس آف انڈین اوریجن (بی اے پی او آئی) نے ایک مقامی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ اس غیر متوقع خبر سے میرے ضمیر کو دھچکا لگا۔ دوسری خبر نے جو ایشین نیوز میں شائع ہوئی تھی، میرے ضمیر کو تو نہیں جھنجھوڑا لیکن مجھے ایک ہیجانی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ یہ خبر پاکستان سے متعلق تھی یعنی ایک ایسے ملک سے جس کے آئین کے مطابق مملکت کی حکمت عملی اور تمام کارروائیوں کے لیے ہدایتی اصول قرآن و سنت ہیں۔ رپورٹ میں وہاں کے وزیر تعلیم کی ایک حالیہ تقریر کا حوالہ دیا گیا ہے جس میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ ان کے ملک میں شرح خواندگی 50% فیصدی سے کم ہے اور 45 فیصدی طلباء تعلیم بیچ میں ہی چھوڑ دیتے ہیں اور اسکول جانے والے طلباء میں سے صرف 2 فیصدی ہی یونیورسٹی کی سطح تک پہنچ پاتے ہیں۔ عقل انسانی اس بات پہ حیران ہے کہ آج کی دنیا اس صورتحال سے دوچار کیوں ہے جبکہ نہ صرف اسلام بلکہ دیگر مذاہب نے بھی خواندگی اور تعلیم پر اس قدر زور دیا ہے اور ملکی و بین الاقوامی قوانین بھی ایک صدی سے زائد عرصے سے یہ اعلان کرتے رہے ہیں کہ تعلیم ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ میں اس پس منظر میں سامعین کرام کو مختصراً گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ قدیمی مذہبی تعلیمات، جدید بین الاقوامی قوانین اور مختلف ممالک کے دساتیر میں کس طرح یہ بات کہی گئی

ہے کہ تعلیم ایک بنیادی حق ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی توجہ اس جانب بھی مبذول کرنا چاہوں گا کہ تمام دنیا میں اس پر کس قدر مہیبانہ انداز میں عمل کیا جارہا ہے۔

مذہبی تناظر میں تعلیم کا حق

ہندوستان کے سب سے بڑے مذہب ہندوازم میں اپنی مقدس کتابوں میں علم یعنی ودیا پر کافی زور دیا گیا ہے۔ علم کی دیوی سرسوتی کی زیادہ تر گھروں میں پوجا کی جاتی ہے اور ودیادان کو سب سے بڑی سماجی خدمت سمجھا جاتا ہے۔ دیگر مذاہب بھی خواہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے خواندگی تعلیم اور علم پر زور دیتے ہیں اور کسی بھی مذہب میں اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ اس کے پیرو ناخواندہ رہیں۔ اسلامی تعلیمات کے تحت تعلیم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت کا بنیادی انسانی حق ہے اور اسی طرح پورے فرقے کا یہ مقدس فریضہ ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ اس فرقے کا ہر فرد تعلیم حاصل کرے۔ ساتویں صدی میں غار حرا سے جو پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی تھی اس کا آغاز بھی اس حکم کے ساتھ ہوا تھا جس سے پڑھنے اور لکھنے کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

(اقراء باسم ربك الذی خلق .....علم الا نسان مالم یعلم

ترجمہ پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا۔ بنایا آدمی کو جمے ہوئے لہو سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔ سکھلایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا۔)

اس وحی کو صدق دلی سے عملی جامہ پہنانے کے لیے حضور اکرمؐ نے تمام مردوں اور عورتوں کو ہدایت دی کہ (طلب العلم فریضه علی کل مسلم و مسلمه) حصول علم ہر مسلمان مرد عورت کا مقدس فریضہ ہے۔ اس کا اطلاق صرف نوجوانوں پر ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں تعلیم بالغان کا پیغام بھی مضمر ہے۔ یہاں یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا اشارہ یہاں صرف دینی تعلیم کی جانب نہیں بلکہ دنیاوی علوم کے حصول کی طرف بھی تھا۔ یہ بات ان کی اس حدیث سے بھی ثابت ہوتی ہے اطلب العلم ولو کان بالصّین علم

حاصل کرو چاہے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ ظاہر ہے کہ چین جسے ملک میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے تو یہ ارشاد نہیں فرمایا تھا۔ اپنے تعلیم سے متعلق اس طرز فکر کو مزید مضبوطی فراہم کرنے کے لیے حضور اکرم ﷺ نے جنگ بدر میں اپنی شاندار کامیابی کے بعد جنگی قیدیوں کو بغیر کسی تاوان کے اس شرط پر چھوڑنے کا فیصلہ کیا کہ وہ ان کے ناخواندہ متبعین کو زیور علم سے آراستہ کرینگے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ غیر اسلامی معاشرے میں بھی تعلیم حاصل کرنا بالکل درست تھا اور ناخواندگی دور کرنے اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے دشمنوں کی خدمات بھی حاصل کی جاسکتی تھیں۔ اسلام کی اس گرانقدر تعلیم کے باوجود آج نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ دیگر ممالک کے مسلمان بھی اعلی تعلیم سے محروم ہیں بلکہ مسلم ممالک میں معمولی خواندگی کا بھی فقدان ہے۔ اسلامی مذہبی کتابوں میں ان دونوں باتوں کو اس قدر اہمیت دیئے جانے کے باوجود کہ ہر شخص کا یہ حق ہے کہ وہ علم حاصل کرے اور کمیونٹی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسے تعلیم دلائے یہ صورت حال قابل ترحم ہے۔ آج دیگر باتیں جو کم اہمیت کی حامل ہیں اول الذکر پر غالب آگئی ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ آج مسلمانوں کو جو مختلف النوع مسائل درپیش ہیں اور جن میں سے کچھ باقی دنیا کے لیے بھی دردسر بنے ہوئے ہیں اور وہ بھی اکیسویں صدی میں اسکی بنیادی وجہ بھی یہی ہے یعنی ضروری اور بنیادی تعلیمات جنھیں اولیت کا درجہ حاصل ہونا چاہئے تھا اب ثانوی حیثیت اختیار کرگئی ہیں، اس قسم کی بے جا صورتحال کا پیدا ہونا اس مذہب کے متبعین کے لیے باعث شرم ہے جس میں تعلیم وتعلم کے زریں اصولوں اور مثالی واقعات کا گونا گوں ذخیرہ موجود ہے۔

مانگتے پھرتے ہیں اغیار سے مٹی کے چراغ
اپنے خورشید پہ پھیلا دئے سائے ہم نے

۲۔ بین الاقوامی قوانین میں تعلیم کا حق

جدید انسانی حقوق سے متعلق قوانین میں اب سے تقریباً 57 سال پہلے انسانی حقوق

کے عالمگیر اعلامیہ میں واضح طور پر یہ بات کہی گئی تھی کہ

ہر شخص کو تعلیم کے حصول کا حق حاصل ہے۔ تعلیم مفت ہوگی، کم از کم ابتدائی اور بنیادی سطح پر۔ ابتدائی تعلیم لازم ہوگی۔ تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم عمومی طور پر میسر کی جائے گی اور اعلیٰ تعلیم تک اہلیت کے مطابق یکساں طور پر ہر شخص کی رسائی ہوگی۔

تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی مکمل نشوونما اور انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام کی پختگی کا حصول ہوگا۔ تعلیم تمام اقوام، نسلی اور مذہبی گروہوں میں مفاہمت، رواداری اور دوستی کو فروغ دے گی اور قیام امن کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

والدین کو اپنے بچوں کو دی جانے والی تعلیم کے انتخاب کا ترجیحی حق حاصل ہوگا۔

اسکے اٹھارہ سال بعد بین الاقوامی منشور برائے معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق میں پھر یہ اعلان کیا گیا کہ

اس منشور کی فریقین مملکتیں ہر شخص کے تعلیم کے حق کو تسلیم کرتی ہیں۔ وہ اس بات پر راضی ہیں کہ تعلیم اس طرح کی ہونی چاہیے کہ اس سے انسانی شخصیت اور اس کے وقار کے احساس کا مکمل فروغ ہو اور اس سے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام کو مزید تقویت حاصل ہو۔ وہ اس بات پر بھی راضی ہیں کہ تعلیم اس قسم کی ہونی چاہیے کہ تمام لوگ مؤثر طور پر کسی آزاد معاشرے میں شرکت کرسکیں۔ دنیا کی تمام اقوام اور تمام نسلی یا مذہبی گروپوں کے مابین، سمجھ، صبر وتحمل اور دوستی کا فروغ ہو اور امن قائم کرنے سے متعلق اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو بڑھاوا ملے۔

جہاں تک کہ بچوں کی تعلیم کا سوال ہے بچوں کے حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کے اس اعلامیے میں جو 1955 میں منظور ہوا تھا۔ یہ بات کہی گئی ہے کہ ہر بچہ تعلیم کا حقدار ہے. یہ تعلیم مفت اور لازمی ہوگی کم از کم ابتدائی اور بنیادی سطح پر اسے ایسی تعلیم دی جائے گی جس سے اس کی عام تہذیب کا فروغ ہو اور اسے اپنی اہلیت کو فروغ دینے کا مساوی موقع ملے، وہ اپنے معاملات کا فیصلہ خود کرسکے اور ساتھ ہی اسکو اپنی اخلاقی اور سماجی ذمہ داری کا بھی احساس

ہواور وہ معاشرے کا ایک اہم رکن ہو۔ جولوگ بچے کی تعلیم اور رہنمائی کے ذمہ دار ہیں ان کے لیے رہنما اصول بچوں کا اعلیٰ ترین مفاد ہوگا۔ اس میں اولین ذمہ داری والدین پر عاید ہوتی ہے۔

تین دہائیوں کے بعد 1989ء میں بچوں کے حقوق سے متعلق کنونشن میں یہ بات کہی گئی تھی کہ فریق مملکتیں بچوں کی تعلیم کے حق کو تسلیم کرتی ہیں تا کہ اس حق کو مساوی مواقع کی بنیاد پر سرعت کے ساتھ حاصل کیا جا سکے۔ فریق مملکتیں تعلیم کے متعلق اہم معاملوں میں بین الاقوامی تعاون کو فروغ دیں گی، اور اس کی حوصلہ افزائی کریں گی خصوصاً اس نیت سے کہ تمام دنیا سے جہالت اور ناخواندگی جیسی برائیاں مٹ جائیں اور سائنٹفک و تکنیکی جانکاری اور جدید طریقہ ہائے تدریس تک رسائی ہو سکے۔ اس ضمن میں خصوصاً ترقی پسند ممالک کی ضروریات کو دھیان میں رکھا جائے گا۔

فریق مملکتیں اس بات پر اتفاق کرتی ہیں کہ بچوں کو تعلیم مندرجہ ذیل اغراض کے لیے دی جائے گی۔

(الف) بچے کی شخصیت اہلیت اور ذہنی و طبعی اہلیت کی بھرپور نشوونما۔

(ب) انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں اور اقوام متحدہ کے منشور میں دیئے گئے اصولوں کے احترام کا فروغ۔

(ج) بچے کے والدین، اس کا اپنا ثقافتی تشخص، زبان اور اقدار، اس ملک کی قومی اقدار جہاں وہ رہائش پذیر یا جہاں سے آکر وہ بسا ہے اور ان تہذیبوں کے، جو اسکی اپنی تہذیب سے مختلف ہے، احترام کا فروغ۔

(د) بچے کو ایک فری سوسائٹی میں ذمہ دارانہ زندگی گزارنے کے لیے افہام و تفہیم، امن، رواداری، جنسی مساوات اور سبھی لوگوں، نسلی، ملکی، مذہبی گروپوں اور کسی ملک کے اصل باشندوں کے احترام کا فروغ کی نیت سے تیار کرنا۔

(ہ) قدرتی ماحول کے لیے احترام کا فروغ۔

1993 میں آسٹریا میں منعقدہ انسانی حقوق سے متعلق عالمی کانفرنس میں اس بات کا پھر اعادہ کیا گیا ہے کہ

☆ مملکتوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ تعلیم کا مقصد انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام کو مزید تقویت حاصل ہو تعلیم، قوموں اور تمام نسلی یا مذہبی زمروں کے مابین افہام و تفہیم، رواداری، امن اور دوستانہ تعلقات کو فروغ دے اور اس سے ان اغراض کی تکمیل کی شکل میں اقوام متحدہ کی سرگرمیوں میں مزید پیش رفت ہو اور ان کی ہمت افزائی ہو۔

☆ انسانی حقوق کی تعلیم اور ضروری معلومات کی تشہیر ہو خواہ وہ تھیوری کی شکل میں ہو یا پریکٹکل کی، انسانی حقوق کے فروغ اور احترام میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں بشرطیکہ ایسا بغیر کسی امتیاز کے کیا جائے۔ جیسے نسل، جنس، زبان یا مذہب اور ایسا نہ صرف ملکی پیمانے پر کیا جائے بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی یہی طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے۔

☆ انسانی حقوق سے متعلق عالمی کانفرنس یہ سمجھتی ہے کہ انسانی حقوق کی تعلیم، تربیت اور عوام تک رسائی مختلف قوموں وطبقوں کے مابین پائیدار و خوشگوار تعلقات پیدا کرنے اور باہمی رواداری، افہام و تفہیم اور امن کے فروغ کے لیے ضروری ہے۔

☆ مملکتوں کو چاہئے کہ وہ جہالت و ناخواندگی کا قلع قمع کریں اور تعلیم کا رخ انسانی شخصیت کی مکمل نشوونما اور بنیادی آزادیوں کے لیے احترام کو مزید تقویت بخشنے کی طرف موڑ دیں۔ یہ کانفرنس تمام مملکتوں اور اداروں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ انسانی حقوق، بشر دوست قوانین، جمہوریت اور قانون کی حکمرانی جیسے مضامین کو تمام تعلیمی اداروں کے، خواہ وہ رسمی تعلیم دے رہے ہوں یا غیر رسمی، نصابوں میں شامل کریں۔

☆ انسانی حقوق کی تعلیم میں امن، جمہوریت، ترقی اور سماجی انصاف، جیسا کہ بین ا

لاقوامی اور علاقائی انسانی حقوق سے متعلق دستاویزات میں مرقوم ہے، جیسے مضامین کو شامل کیا جانا چاہیئے تاکہ انسانی حقوق سے متعلق بین الاقوامی ذمہ داری کو نبھایا جا سکے اور سب کو قابل قبول ایک نئی سوچ کا آغاز ہو اور لوگوں میں بیداری پیدا ہو۔

ملکی قوانین میں تعلیم کا حق

تمام ممالک کے دساتیر میں لوگوں کے تعلیم حاصل کرنے کے حق اور مملکت کے انہیں تعلیم دلانے کے حق کو غیر استثنائی طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

مشرق کے سب سے زیادہ آبادی والے ملک چین کے آئین میں اس بات کا اعلان کیا گیا ہے کہ شہریوں کو تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہے، اور ایسا کرنا ان کا فرض بھی ہے اور ساتھ ہی سائنسی تحقیق، ادبی اور فنی تخلیق اور دیگر ثقافتی سہولیات میں حصہ لینے کی آزادی حاصل ہے۔

بھارت کے آئین میں 1950 میں ہی مملکت کی حکمت عملی کے ھدایتی اصولوں کو شامل کر کے مملکت کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ دس سال کے اندر اندر چودہ سال سے کم کے سبھی بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کو یقینی بنائے۔ یہ ہدف پانچ دہائیوں تک بھی پورا نہ ہو سکا اور نصف صدی گزرنے کے بعد آئین میں ترمیم کی گئی اور چھ سال سے چودہ سال کی عمر کے بچوں کے لیے تعلیم کو ایک بنیادی حق بنایا گیا، اور ماں باپ و ولیوں کو یہ بنیادی فرض سونپا گیا کہ وہ چھ سال سے چودہ سال تک کی عمر کے اپنے بچے یا وارڈ، جیسی بھی صورت ہو، کے لیے تعلیم کا موقع فراہم کریں۔

جنوبی افریقہ کے آئین میں ہر شخص کو—

(الف) بنیادی تعلیم، جس میں بالغوں کی بنیادی تعلیم بھی شامل ہے، حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔

(ب) تعلیم کو فروغ دینے کا حق بھی حاصل ہے، اور مملکت اس غرض سے ایسے مناسب اقدامات کرے گی جو ہر وقت دستیاب اور قابل رسائی ہوں۔ اس کے علاوہ اس میں یہ بھی توضیع کی گئی ہے کہ مملکت کو (الف) نصفت (ب) اس کے قابل عمل ہونے اور (ج) ماضی

میں نسلی امتیاز پر مبنی قوانین اور کارروائیوں کے نتیجے میں ہونے والی زیادتیوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے سبھی مناسب تعلیمی متبادل پر غور کرنا چاہیئے۔

مصر کے آئین میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ تعلیم ایک ایسا حق ہے جس کی مملکت نے ضمانت دی ہے، اور جہالت کا خاتمہ ایک قومی فرض ہے جس کے لیے لوگوں کی بھرپور صلاحیتوں کو روبعمل لایا جائے گا۔

4- زمینی حقائق: پورے عالم کے لیے لمحۂ فکریہ

ہمارے سامنے اب سوال یہ ہے کہ لوگوں کے تعلیم کے حق اور مملکت کے تعلیم کا انتظام کرنے کے بارے میں بین الاقوامی قوانین کے احکامات اور دساتیر عالم میں اس ضمن میں دی گئی ضمانت کے باوجود اس پر عمل کیوں نہیں کیا جا رہا ہے۔ آیئے ان زمینی حقائق پر نظر ڈالیں۔

1990 میں تھائی لینڈ نے Jomtien میں یونیسکو کے ذریعہ منعقد کی گئی ایک عظیم عالمی کانفرنس میں اقوام عالم نے اس بات کو مانا تھا کہ:

☆100 ملین سے زیادہ بچے، جن میں 60 ملین بچیاں شامل ہیں، تاہنوز پرائمری تعلیم سے بھی محروم ہیں۔

☆960 ملین سے زیادہ بالغان، جن میں سے دو تہائی خواتین ہیں، ناخواندہ ہیں اور تمام ممالک میں خواہ وہ صنعتی ہوں یا ترقی پذیر، آج بھی ناخواندگی ایک اہم مسئلہ بنی ہوئی ہے۔

☆دنیا کے ایک تہائی سے زیادہ بالغوں کی مطبوعہ مواد، نت نئے ہنروں اور ٹکنالوجی تک رسائی نہیں ہے جبکہ یہ سب چیزیں ان کی زندگی کا نقشہ بدل سکتی ہیں اور وہ سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔

☆100 ملین سے زیادہ بچے اور لاتعداد بالغان تعلیمی پروگرام پورا نہیں کر پاتے ہیں اور اس سے بھی کہیں زیادہ تعداد ان کی ہے جو حاضری کی رسم تو پورا کرتے ہیں مگر ضروری علم و ہنر حاصل نہیں کر پاتے۔

Jomtien عالمی کانفرنس میں حقیقتاً سب کے لیے تعلیم سے متعلق عالمی اعلامیہ (ای ایف اے) منظور کیا تھا۔ اس میں لوگوں کے تعلیم کے حق کی پھر توثیق کرتے ہوئے اور اس کے بارے میں یہ پرزور اعلان کرتے ہوئے کہ یہ ہمارے عزم مصمم کی ذاتی یا اجتماعی طور پر بنیاد ہوگی اور سب کے لئے تعلیم کو یقینی بنائے گی، اقوام عالم نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اپنی ذمہ داری کو نبھاتے ہوئے سب کے لیے تعلیم کے ہدف کو پورا کرنے کے لیے تمام ضروری اقدامات کریں گی۔

ای ایف اے اعلامیے میں خاص طور سے محولہ ''محروم طبقات: غرباء، بے گھر اور کام کرنے والے بچوں، دیہی اور دور دراز علاقوں میں رہائش پزیر لوگوں، خانہ بدوشوں اور نقل مکانی کرنے والے مزدوروں، دیسی لوگوں، نسلی اور لسانی اقلیتوں، مہاجروں، جنگ کے دوران بے خانماں افراد اور پیشہ ورانہ لوگوں کی تعلیمی عدم مساوات کو دور کرنے کے لیے ایک ''عزم مصمم'' پر زور دیا گیا تھا۔

''ای ایف اے اعلامیے کے کئی سال بعد حالات کا جائزہ لینے کے لیے سینگل کے ڈکار شہر میں منعقد ورلڈ ایجوکیشن فورم میں اس معاملے پر غور وخوض کیا گیا تھا۔ 1100 سے زیادہ شرکاء نے حصہ لیا تھا جن میں حکومتیں وغیر سرکاری ادارے شامل تھے۔ اس فورم نے ڈکار فریم ورک فار ایکشن کو منظوری دی تھی۔ ای ایف اے کی پیش رفت کا جائزہ لیتے ہوئے فورم اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ''ای ایف اے 2000 کے جائزے سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس ضمن میں بہت سے ممالک میں کافی پیش رفت ہوئی ہے لیکن یہ بات دماغ کسی طرح قبول نہیں کرتا 2000 میں 113 ملین سے زیادہ بچے پرائمری تعلیم سے محروم ہیں، 880 ملین بالغ ناخواندہ ہیں، نظام تعلیم میں جنسی تفریق آج بھی موجود ہے اور تعلیم کا معیار اور انسانی اقدار کا حصول آج بھی افراد کی ضروریات اور معاشرتی اغراض کو پورا نہیں کرتا، نوجوانوں اور بالغوں کی سود مند روزگار حاصل کرنے اور سماج میں مکمل شراکت داری کے لیے ضروری علم و ہنر تک رسائی نہیں ہے۔ جب تک سب کے لیے تعلیم کے معاملے میں کماحقہٗ پیش رفت نہیں ہوگی تب

تک غریبی کم کرنے کے تمام ملکی و بین الاقوامی مقررہ ھدف پورے نہیں ہونگے اور ممالک و معاشروں کے درمیان عدم مساوات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔''

اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ اقوام عالم کے مابین امن واستحکام کے لیے تعلیم کو ہی کلیدی حیثیت حاصل ہے اور نئی صدی کے آغاز سے قبل اس اہم موڑ پر زمینی حقائق کا معروضی تجزیہ کرتے ہوئے ڈکار فورم نے مندرجہ ذیل اہم اعلانات کیے۔

جومٹین کا وژن آج بھی اسی اہمیت کا حامل ہے، اور اس میں اتنی ہی پائیداری ہے جتنی کہ شروع میں تھی۔ اس سے تعلیم کی ہمہ جہت اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور افراد و معاشرے کو بااختیار بنانے کے معاملے میں اس کی فعالیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی خاص باتوں اور اصولوں میں تعلیم تک عالمی رسائی، نصفت پر فوکس، تعلیم کے نتائج پر زور، بنیادی تعلیم کے ذرائع اور وسعت میں مزید چیزوں کو شامل کرنا، تعلیمی ماحول میں وسعت پیدا کرنا اور شراکتوں میں مزید استحکام پیدا کرنا شامل ہے۔ یہ کیسا المیہ ہے کہ آج تک بھی یہ وژن شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، کتنے ہی ملین لوگ آج بھی تعلیم کے اس حق کے حصول سے محروم ہیں جو ان کی زندگی کو باوقار و بامعنی بنانے اور روشن مستقبل کے لیے بہتر مواقع فراہم کرتا۔

تجزیے سے مزید یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سب کے لیے تعلیم ایک قابل عمل و قابل تکمیل ھدف ہے لیکن ھمیں اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی تسلیم کرنی ہوگی کہ اس معاملے میں کماحقہٗ پیش رفت نہیں ہوئی ہے اور یہ کچھوے کی چال سے چل رہی ہے۔ نئے ہزارے کے آغاز میں ای ایف اے کے تجزیے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ:

1. چھ سال سے کم عمر کے 800 ملین سے بھی زیادہ بچوں میں سے صرف ایک تہائی بچے ہی ایام طفولیت کی تعلیم سے مستفید ہو پاتے ہیں،
2. 113 ملین بچے میں جن میں 60 فیصدی بچیاں ہیں، پرائمری تعلیم سے بھی نابلد ہیں۔

3. کم از کم 880 ملین بالغ ناخواندہ ہیں اوران میں خواتین کی اکثریت ہے۔

یہ اعداد وشمار انسانی وقار اور حق تعلیم کی نفی کرتے ہیں یہ خاتمہ غربت اور پائیدار ترقی کے عمل میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہیں جسے کسی بھی صورتحال میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔

☆اس ناکامی کی مختلف وجوہات ہیں:

کمزور سیاسی قوت ارادی، ناکافی مالی وسائل اور موجودہ وسائل کا غلط طریقے سے استعمال، قرض کا بوجھ، غرباء، اور محروم طبقات کی تعلیمی ضروریات تعلیم کے معیار کی جانب کم توجہ، اور جنسی تفریق دور کرنے کے معاملے میں عدم دلچسپی۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ حصول تعلیم میں آنے والی ان رکاوٹوں کا مقابلہ آسان نہیں ہے لیکن ایسا کیا جاسکتا ہے اور ہمیں ایسا کرنا ہوگا۔

☆اسکولوں کا احترام کیا جانا چاہئے اوران کی جائے امن وامان کے طور پر حفاظت کی جانی چاہیے، تعلیمی پروگرام اس طرح مرتب کیا جانا چاہیے کہ اس سے انسانی شخصیت کی مکمل نشوونما اوران انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام کو مزید تقویت حاصل ہو، جن کا انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیے میں تذکرہ ہے۔(ملاحظہ فرمایئے دفعہ 26)

ایسے پروگرام تمام قوموں، نسلوں اور مذہبی گروہوں میں مفاہمت، رواداری اور دوستی کو فروغ دیں، ثقافتی اور لسانی تشخص کو جلا بخشیں ، گوناں گوں ثقافتوں کے احترام کو یقینی بنائیں اور ایک پرامن کلچر کی آبیاری کریں۔

تعلیم کا مقصد صرف مختلف صلاحیتوں کا فروغ ہی نہیں ہے، بلکہ اس میں تنازعات کا تدارک اور پرامن حل اور سماجی اور اخلاقی اقدار کو فروغ دینا بھی شامل ہے۔

☆ان اہداف کو حاصل کرنے کے لیے ہم سب یعنی حکومتیں، تنظیمیں، ایجنسیاں، گروپ اورانجمنیں جنھوں نے اس عالمی تعلیمی فورم میں شرکت کی ہے اس بات کا عہد کرتی ہیں کہ ہم تصادم یا تنازعات، قدرتی آفات اور ناپائیداری سے متاثر تعلیمی نظام کی ضروریات کو پورا

کریں گے اور تعلیمی پروگراموں کا انعقاد اس طرح کرینگے کہ ان سے باہمی مفاہمت، امن اور رواداری کو فروغ حاصل ہو اور تشدد وتصادم کا تدارک ہو۔ تمام متعلقہ ممالک میں ملکی منصوبوں کی مؤثر اور کامیاب عملدرآمدگی کے لیے سیاسی قوت ارادی اور پائیدار قومی لیڈرشپ کی بھی ضرورت ہے۔

خلاصہ

انسانی حقوق سے متعلق عالمگیر اعلامیے میں ہر قسم اور ہر نوعیت کی نابرابری کو دور کرنے کے لیے تعلیم کو بنیادی انسانی حق تسلیم کیا گیا تھا لیکن آج تقریباً 58 سال گزر جانے کے بعد بھی تعلیم کے حق کی تصویر بہت دھندلی ہے اور اسکے ساتھ کماحقہٗ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔

اقوام متحدہ کی بہت سی دستاویزوں، علاقائی منشوروں اور دساتیر عالم میں اسکول جانے کے قابل عمر کے بچوں کے لیے مکمل مساویانہ طور پر بغیر کسی امتیاز کے مفت اور لازمی تعلیم کی ضمانت دی گئی ہے لیکن آج بھی دنیا کے نصف سے زائد ممالک میں مفت پرائمری تعلیم کا اہتمام نہیں ہے، مناسب تعلیم کے ذریعہ تمام انسانوں کو برابر لانے کا ہدف بھی تا ہنوز محروم از تکمیل ہے۔ انسانی حقوق سے متعلق ادارے بار بار اس بات کی توثیق کر چکے ہیں کہ تعلیم ایک بنیادی انسانی حق ہے اور وہ بار بار ان کی توجہ ان بین الاقوامی قانونی ضمانتوں کی طرف مبذول کراتے ہیں جس کی عالمی حکومتیں خود فریق ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ انہی حکومتوں کے نمائندے تعلیمی تجارت میں لبرلائزیشن کی بات کرنے میں اور اس ضمن میں مکمل آزادی وکشادگی کے خواہاں ہیں۔ تعلیم بیک وقت ایک کے لیے بنیادی حق اور دوسرے کے لیے، جو اسے بڑی قیمت دے کر حاصل کرسکتا ہے، کس طرح سامان تعیش ہوسکتی ہے؟ ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا!

انسانی حقوق سے متعلق بین الاقوامی قانون کی غرض وغایت بھی یہی ہے اور یہی اس کی روح رواں ہے کہ تعلیمی نظام میں مختلف پس منظر سے آنے والے بچوں کی ضروریات اوران

کے مفادات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مطابقت پیدا کرنی چاہیے۔ جب کہ اس کے برعکس زیادہ تر ممالک میں بچے اس بات کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ یا تو اپنی سماجی و مذہبی روایات کا انتخاب کریں یا اس ملک میں مروجہ تعلیم یا کم از کم بہتر تعلیم کا۔ ایک مذہب کے ماننے والوں کو اچھی تعلیم کے عوض ایک دوسرے مذہب کے آداب و رسوم کی بجا آوری کرنی پڑتی ہے۔ کچھ ممالک میں لڑکیوں کو اس بنا پر اسکول سے نکال دیا جاتا ہے کہ وہ سر پر اسکارف باندھتی ہیں تو کچھ ممالک میں اسکارف نہ باندھنے پر اس قسم کی صورتحال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ہم اکثر یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اسکولوں میں داخلہ لینے والے سبھی بچے یکساں نہیں ہوتے اور ان کا پس منظر مختلف ہو سکتا ہے۔ ان کی الگ الگ صلاحیتوں اور پس منظر کا ان کے رپورٹ کارڈ پر اثر پڑتا ہے اور اس سے تعلیم برائے مساوات کا وعدہ ایفا نہیں ہوتا۔ اسکولوں میں اچھے بچوں کو انعامات دے کر اور دوسروں کو سزا دے کر عدم مساوات کو فروغ دیا جاتا ہے۔ روایتی طور پر تعلیم کو اس نظریے سے دیکھا جاتا ہے کہ کوئی بھی شخص تعلیم حاصل کر کے معاشرے میں عدم مساوات پر قابو پا سکتا ہے اور اپنے لئے برابر کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن آج بھی تفریقی بنیادوں جیسے طبقہ، جنس، اقلیتی حیثیت، نسل، نااہلیت یا عدم استطاعت پر مبنی سماج میں رچی بسی عدم مساوات ہمارے تعلیمی نظام میں نہ صرف دیکھنے کو ملتی ہے بلکہ اسے بار بار دہرایا جاتا ہے۔ عدم مساوات کی صورتحال آزردہ و گمراہ کے دل میں گھر کر لیتی ہے اور وہ ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں جو ناانصافی اور عدم رواداری کو جنم دیتی ہیں۔

دور حاضر میں سب کے لیے تعلیم معاشرے کی سب بڑی ضرورت ہے چونکہ آج کی اس دنیا میں جہاں ناانصافی اور عدم رواداری کا بول بالا ہے اس کا واحد حل صرف تعلیم اور تعلیم ہی ہے۔ مذہبی کتابوں، جن میں انسانی حقوق پر مبنی تعلیم کو یقینی بنایا گیا ہے، کا بھی فائدہ اٹھایا جانا چاہیے۔ اور ملکی و بین الاقوامی قوانین کو ایک ایسی نئی شکل دی جانی چاہیئے کہ ہر سطح اور دنیا کے ہر حصے میں دی جانے والی تعلیم سے پورے عالم میں انسانی حقوق کا ایک نیا کلچر وجود میں آئے۔

آج اس بات کی ضرورت ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جا رہی ہے، اس کی نظر ثانی کی جائے۔ انسانی حقوق کو پرائمری سطح سے ہی نصاب میں شامل کیا جانا چاہیئے۔ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ کہیں ایسی صورتحال پیدا نہ ہو جائے کہ تعلیم سے فلاح کی بنسبت برائی کا عنصر غالب آ جائے۔ تعلیم کو ایک ایسی شکل دی جانی چاہیئے جس سے آج کی دنیا سے ناانصافی اور عدم رواداری جیسی برائیوں کا خاتمہ ہو جائے اور خود تعلیم ہی ان برائیوں کا ذریعہ نہ بن جائے۔ نہ صرف آج بلکہ کل کی دنیا کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے اس ضمن میں مثبت کردار ادا کرے۔

آؤ ہم ریت میں وہ نقش قدم چھوڑ چلیں
جس کی آتی ہوئی نسلوں کو ضرورت ہوگی

اگر متعلقین اپنا یہ مقدس فریضہ انجام دینے میں ناکام رہتے ہیں تو وہ دن دور نہیں جب خواندگی اور تعلیم کے متعلق تمام مذہبی تصورات اور جدید قانونی نکات ناکارہ و بے معنی ہو جائیں گے۔

سوالات و مداخلات

دیہی وشہری علاقوں میں تعلیم کا معیار

خید یا طوف:

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ تعلیم ایک بنیادی حق ہے مگر حق کے تصور اور اسکی عمل درآمدگی میں بہت بڑا فرق ہے۔ مجھے اپنے ہندو پاک دورے کے دوران یہ بات دیکھنے کو ملی کہ شہری علاقوں میں تعلیم کا معیار کافی بلند ہے اور دیہی علاقوں میں اسکے برعکس ناخواندہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ میں ہندوستان میں انفارمیشن ٹکنالوجی کے میدان میں جو ترقی ہوئی ہے اس سے بھی بہت متاثر ہوا ہوں اور مجھے اس بات کا بھی علم ہوا کہ اس میدان میں ہندوستان کو دنیا میں دوسرا مقام حاصل ہے۔ لہذا میں پروفیسر محمود سے یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ ہندوستان کے دیہی علاقوں میں تعلیمی ترقی کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے چونکہ مہاتما گاندھی نے دیہی علاقوں میں پرائمری تعلیم کی طرف خاص توجہ دی تھی۔ دراصل مسئلہ ہندوستان کا نہیں بلکہ تمام ایشیائی ممالک کا ہے۔ البتہ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اسی ایشیا میں چین اور جاپان اپنے یہاں ناخواندگی بالکل ختم کر چکے ہیں۔ اسکو اس بات کی ایک مثبت مثال مانا جا سکتا ہے کہ مملکت تعلیم کے میدان میں ایک اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اغلباً یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ تعلیم کو اپنی پالیسی کا جز بنائیں۔

طاہر محمود:

پروفیسر خید یا طوف نے جو کچھ بتایا میں اسے استفسار کے بجائے ایک روداد سمجھتا ہوں لیکن اگر وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ بابو کے زمانے سے تعلیمی میدان میں اب تک دیہی علاقوں میں کتنی ترقی ہوئی ہے تو میں عرض کرنا چاہوں گا کہ اس ضمن میں کافی پیش رفت ہوئی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ شہری اور دیہی علاقوں میں آبادی بھی کافی بڑھی ہے۔ آج ہندوستان

101 بلین لوگوں کا مسکن ہے، اور اتنی بڑی آبادی میں ہر بچے کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کے لیے مالی وسائل فراہم کرنا سرکار کے بس کی بات نہیں ہے البتہ یہ مدعا برابر ہندوستان کی سرکاری پالیسی کا حصہ رہا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو پیش تعلیمی مسائل کا سامنا:

اب سے بیس سال قبل حکومت نے ایک نئی تعلیمی پالیسی کو منظوری دی تھی اور اس میں صاف اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ 140 ملین مسلمان تعلیمی اعتبار سے نہایت پسماندہ ہیں۔ در حقیقت یہ بات مسلمانوں کے لیے باعث شرم تھی جو اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر لازم ہے۔ (ملاحظہ فرمایئے صفحہ 51 پر)

ایک ایسی امت کے لیے جسے اپنے پیغمبر سے یہ تعلیم ملی ہو اسے کسی ملک میں تعلیمی اعتبار سے سب زیادہ پسماندہ قرار دیا جائے اس کے لیے باعث شرم ہے۔ لیکن اس ضمن میں نہ تو سرکار نے کچھ کیا ہے اور نہ ہی کمیونٹی اپنے وسائل کو بروئے کار لائی ہے اور صورتحال جوں کی توں بنی ہوئی ہے۔ لیکن یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ہندوستان کے مسائل دنیا کے دیگر حصوں سے مختلف ہیں یہاں دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ تعصّبات بھی ہیں غربت بھی اور مقامی سیاست کی نیرنگیاں وکوتاہیاں بھی۔

وہ عوامل جو تعلیم کو فروغ دیتے ہیں یا جو رکاوٹ پیدا کرتے ہیں

خوری:

اب تک ہم نے زمینی حقائق اور اس کے اندوہناک نتائج کا تجزیہ کیا ہے۔ اب ہمارے سامنے اصل مسئلہ ان عوامل کی نشاندہی کرنا ہے جو ہمارے ارادوں کو پائے تکمیل تک پہنچانے، حقوق کو قانون کی شکل دینے اور قانون کی عمل درآمدگی میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں تاکہ ہم تعلیم کے میدان میں اس اندوہناک صورتحال کا صحیح اندازہ لگا سکیں جس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر ممالک بھی نبرد آزما ہیں۔ دوسری بات ہمیں ان عوامل کا بھی پتہ لگانا ہوگا جو

اس ضمن میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

مذہبی فرمودات اور قانونی احکامات میں امتزاج

یہ حقیقت مندانہ سوچ نہیں ہے کہ ہم ہمیشہ سرکاری وسائل اور سرکاری میکانزم پر ہی منحصر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو میرے مقالے میں مختلف مذاہب میں مذہبی تعلیم سے متعلق مذہبی فرمودات اور قانونی احکامات کے مابین امتزاج کی جھلک نظر آئے گی۔ یہ بالکل صحیح وقت ہے کہ ہم اپنا دھیان صرف قانونی احکامات پر مرکوز کرنے کے بجائے مذہبی فرمودات پر مرکوز کریں لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب مذہبی فرقے اور ان کے رہنما عالمی سطح پر متحد ہو جائیں اور اپنے اپنے مذہبی فرمودات و احکامات کو روبعمل لاتے ہوئے مذہبی تعلیم کو عملی جامہ پہنائیں۔ جہاں تک مسلمانوں کی بات ہے ان میں کسی بھی ملک میں اتحاد نہیں ہے۔ انہیں کم از کم تعلیم کے میدان میں تو متحد ہو جانا چاہئے۔ مذہبی تعلیم سے متعلق مذہبی احکامات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے شرائط ماقبل میں سے ایک شرط ہے۔ انہیں اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ تعلیم کے متعلق تمام مذاہب کے احکامات اس دنیا میں ایک زمینی حقیقت بن جائیں، متحد ہو جانا چاہئے۔ یہ ذمہ داری حکومت سے زیادہ ان کے کندھوں پر ہے

مذہبی رہنماؤں کو سرگرم ہونا ہوگا

مملکتوں کے اپنے وسائل ہوتے ہیں اور انہیں مختلف ممالک سے امداد بھی ملتی ہے لیکن اسی امداد کے ساتھ مختلف شرائط جوڑ دی جاتی ہیں۔ وہ ادارے جنکی حیثیت ایسی ہے کہ وہ تعلیمی اغراض کے لیے مالی امداد دے سکیں زیادہ تر تعلیم کے تجارتی پہلو کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں مثلاً نیویارک میں WTO۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے حکومتوں کی جانب سے کی جانے والی پیش رفت اور کارروائی کا تو بہت انتظار کر لیا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مذہبی رہنماؤں کی جانب سے کی جانے والی کسی پیش رفت یا کارروائی کا انتظار نہ کریں بلکہ انہیں ایسا کرنے کے لیے مجبور کریں۔

مذاہب، مملکتوں اور بین الاقوامی کمیونٹی کا تعاون درکار ہے

گیبریل:

اس بحث کے دوران میرے دماغ میں دو باتیں آئیں۔ پہلی بات یہ کہ تعلیم سے ہمیشہ بہت سے قوی، ذاتی مفادات وابستہ ہوتے ہیں اور اس ضمن میں جو سب سے اہم سوال ہے وہ ہے نفس موضوع یا مشمولات کا ہے جس سے مختلف فرقوں میں تضادی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرا سوال ہے مالی وسائل کا۔ اس ضمن میں میں یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس معاملے کو صرف مذہبی فرقوں پر ہی چھوڑ دیا جائے۔ کیا ہمیں ایسی صورتحال میں مختلف اداروں کو جیسے مذاہب مملکتوں اور بین الاقوامی کمیونٹی کو نزدیک لانے کے لیے فکرمند نہیں ہونا چاہیے؟

تعلیمی پروگرام بنیادی انسانی اقدار پر مبنی ہونا چاہیے

کیا ہمیں اس بات کی حتی الوسع کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ ہم ایسے تعلیمی پروگرام مرتب کریں جن میں اعلیٰ درجے کی مشمولات شامل ہوں جیسے بنیادی انسانی اقدار، امن و انصاف اور وہ تمام اہم مدعے جو ان گول میز مذاکرات میں موضوعِ بحث رہے ہیں؟

طاہر محمود:

یقیناً، مگر ہمیں مملکتوں کو قانونی ذمہ داریوں سے بری الذمہ نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا کرنا ہماری کج فہمی ہوگی۔ دوسری جانب ہمیں حکومتوں پر اس بات کے لیے زور ڈالنا چاہئے کہ وہ تعلیم کے میدان میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں مستعدی برتیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس وقت اس بات کی بھی شدید ضرورت ہے کہ ہمارے مذہبی رہنما بھی اپنا فعال کردار ادا کریں اور اس بات کا احساس کریں کہ انہیں تعلیم کو عام کرنے کے لیے سرگرم عمل ہونا پڑے گا۔ یہاں تعلیم سے مراد صرف مذہبی تعلیم ہی نہیں ہے۔ جہاں تک اسلام کی بات ہے تو یہاں ہمارے پیغمبرؐ کا یہ قول بہترین مثال ہے۔ ''علم حاصل کرو خواہ چین ہی کیوں نہ جانا پڑے''

یقیناً یہاں ان کا اشارہ چین جا کر اسلامی تعلیم حاصل کرنے کی طرف نہیں تھا بلکہ وہ یہ

چاہتے تھے کہ وہ وہاں جا کر سائنس اور ریاضی کی تعلیم حاصل کریں یعنی ان مضامین کی جن میں چین اس وقت دنیا میں سب سے آگے تھا (ملاحظہ فرمایئے ص) ایسی صورت میں مذہبی رہنماؤں کو یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے پیغمبر کا اصل منشا کیا تھا اور ان کی توقعات کیا تھیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہم پاکستان یا ہندوستان میں کسی عالم دین سے پوچھیں تو اس کا جواب صرف یہ ہوگا کہ یہ حدیث مشکوک ہے۔

ہندوستان کی صورتحال تمام مسلم مسائل کی عکاسی نہیں کرتی

محمود ایس ایس :

سب سے پہلے پروفیسر محمود کا اس بات کے لیے شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ انہوں نے متذکرہ بالا حدیث کا حوالہ دیا ہے لیکن ساتھ ہی میں مختصراً دو باتیں کہنا چاہونگی کہ جو کچھ پروفیسر موصوف نے فرمایا اس کا تعلق محض اس تعلیم سے ہے جو مسلمانوں نے ہندوستان میں حاصل کی ہے۔ چونکہ مسلمانوں کی آبادی ہندوستان میں صرف بارہ فیصدی ہے اس لیے وہاں کی صورت حال سے تمام مسلم مسائل کی عکاسی نہیں ہوتی۔

اور کیرالہ میں حاصل ہونے والی کامیابی کی داستان

دوسری نشاندہی کا تعلق کیرالہ میں حاصل ہونے والی کامیابی سے ہے۔ اس کے بارے میں ہر کوئی مزید جاننا چاہے گا چونکہ یہ بات ہر شخص کے علم میں ہے کہ وہاں پر مسلمانوں کی شرح خواندگی نہ صرف ہندوستان کی نسبت سے بلکہ ایشیا میں بھی سب سے زیادہ ہے۔ جیسا کہ پروفیسر خید یاطوف پہلے ہی کہہ چکے ہیں اس کا تعلق ہندوستان میں انفارمیشن ٹکنالوجی کے میدان میں ہونے والی ترقی سے بھی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی اپنی ایک اہمیت ہے

طاہر محمود:

ہندوستان کی آخری مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی 13.4

% فیصدی ہے۔ یہاں 13.4 % فیصدی کا مطلب ہے 145 ملین افراد۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو دنیا کے مسلمانوں میں ایک غالب اکثریت کی حیثیت حاصل ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی برطانیہ اور فرانس کی کل آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ لہٰذا اس خطے کے مسلمانوں کی صورتحال بین الاقوامی اداروں اور اسکالروں کے لیے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

کیرالہ کی مخصوص صورتحال

جہاں تک کیرالہ کا سوال ہے اس کے بارے میں میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ میرے جواب کا ایک حصہ یہ ہوگا کہ یہ کمیونزم کی دین ہے کیونکہ یہاں پر ہمیشہ کمیونسٹ ہی برسر اقتدار رہے ہیں۔ چونکہ کمیونزم اور سوشلزم ہمیشہ اعلیٰ درجے کی تعلیم خواندگی اور عالمی معلومات سے بہرہ ور رہے ہیں اس لیے کیرالہ نے اس قدر ترقی کی ہے لیکن اس کی ایک اور اہم وجہ بھی ہے۔ زمینی حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اور عیسائی کیرالہ میں اقلیت میں ہیں لیکن ان دونوں کی کل تعداد دیکھی جائے تو وہ اکثریت میں آجاتے ہیں ایسی صورت میں وہاں کی ہندو اکثریت کو اتنی آزادی حاصل نہیں ہوسکتی کہ وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی اتنی بڑی تعداد کو نظر انداز کردیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں کیرالہ کا شمار سب سے زیادہ Progressive State کے طور پر ہوتا ہے۔

کمیونزم کا دور ختم ہونے کے بعد تعلیم میں کمی

پوٹز:

میرے لیے ایک باعث تشویش مسئلہ یہ ہے کہ کمیونزم کے زوال کے بعد وسط ایشیا میں تعلیم کا گراف نیچے آرہا ہے۔ مثال کے طور پر تاجکستان کے میرے بہت سے ساتھی اس بات پر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ کمیونزم کے زوال کے بعد ہی تعلیم نسواں کا گراف نیچے آنے لگا اور لڑکیوں کی تعلیم میں دلچسپی کم ہونے لگی۔ آخر اس کی کیا وجوہات ہیں؟ ظاہر ہے اس کا تعلق

کمیونزم کی اندرونی نظریاتی چقلش سے ہے جس میں واضح طور پر کمیونزم اور اسلام کے مابین رشتے کا صریحی طور پر حوالہ نہیں دیا جارہا ہے لیکن جب ہم پھر پلٹ کر دیکھتے ہیں تو پھر ایک مثال ہمارے سامنے آتی ہے یعنی اس رشتے کی جو کمیونزم اور عیسائیت کے بیچ ہے اسی طرح ہمیں لاطینی امریکہ میں بھی کوئی ایسا ملک نہیں ملتا جس میں ناخواندہ لوگ نہ ہوں ماسوائے کیوبا کے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

کمیونسٹ دور حکومت میں تعلیم پر زور

خیدیاطوف:

1917 کے روسی انقلاب کے بعد کمیونسٹ نظریات اور اسلام کے مابین کشیدگی پیدا ہوئی۔ یہ بات کمیونسٹ نظام کے حق میں تھی کہ اسلام کا اثر وہاں کم ہو۔ اس مقصد کا حصول متشدد تصادم کے ذریعہ نہیں بلکہ تعلیم کے ذریعہ مقصود تھا۔ سب سے پہلے عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف نے لی اور اس کے بعد روسی حروف نے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بڑی الجھی ہوئی صورتحال تھی۔ اس دور میں تعلیم ریاستی پالیسی کا جز بن گئی اور جن ممالک میں اس پر خرچ کی جانے والی رقم بجٹ کا صرف ایک فیصدی تھا سوویت دور میں بڑھ کر دس فیصدی ہوگئی۔ اس طرح تعلیمی اغراض کے لیے مالی وسائل میں کافی اضافہ ہوا۔ ہر گاؤں میں اسکول کھولے گئے۔ تعلیم حاصل کرنا فخر کی بات سمجھی جانے لگی۔ غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو کام ملنا بند ہوگیا۔ کمیونزم کی کتنی بھی تنقید کی جائے لیکن جہاں تک تعلیم اور ثقافتی ترقی کی بات ہے ہمیں اسے ماننا ہی ہوگا۔

ایک اور مثال چین کے 1.5 بلین لوگوں کی ہے وہاں پر چینی حروف کی مخصوص ہیئت کے باعث پیش آنے والی دشواریوں کے باوجود ہر شخص خواندہ ہے۔ ماؤ ٹوسی ٹنگ اس ملک کا سب سے تعلیم یافتہ شخص تھا۔ وہ پچیس سو حروف سے واقف تھا جبکہ آج کے ایک سمجھ دار چینی باشندے کے لئے ایک ہزار حروف جاننا ہی کافی ہے۔ تبت میں بھی کافی ترقی ہوئی ہے۔ یہاں پر دلائی لامہ کی پوجا ہونے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے اور پڑھنے لکھنے سے نہیں روکا گیا۔

کمیونسٹ تمام شہریوں کو برابری پر زور دیتے ہیں

طاہر محمود:

میرا خیال ہے کہ کمیونزم میں ہر معاملے میں مساوات پر زور دینے کے باعث یہ صورتحال پیدا ہوئی ہے، دیگر غیر کمیونسٹ تصورات میں مساوات پر اتنا زور نہیں ہے کیونکہ بہت سی بنیادوں پر تعلیم سے محروم کیا جارہا ہے، کبھی کبھی تو مذہب، اقلیتی حیثیت اور اسی طرح کی دیگر بنیادوں پر بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ دین دھرم اور دیگر وجوہات سے قطع نظر یہ کمیونسٹ نظریات ہی کی دین ہے کہ وہاں تعلیم کو فروغ ہوا۔ یہ تمام قومیں اور مختلف نظریات رکھنے والے لوگ یہ دعوی کرتے ہیں کہ تعلیم ان کی آئیڈیالوجی کا جز ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دوسری حکومتوں کے معاملے میں کمیونسٹوں کے دور حکومت میں مساوات پر زیادہ زور دیا گیا اور اسے قبولیت عام حاصل ہوئی۔

محمود ایس ایس:

یہ بات بالکل درست ہے کہ وسط ایشیا اور دیگر سابق کمیونسٹ ملکوں میں تعلیم کا فروغ ہوا ہے لیکن اس دور میں مختلف بنیادوں پر بہت زیادہ امتیاز برتا گیا۔

اقدار کی منتقلی مذاہب کی مشترکہ ذمہ داری

خوری:

بحث کے دوران یہ بات آئی کہ مذاہب کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اپنی اقدار ایک دوسرے تک پہنچائیں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں یہ کام صرف مذاہب تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہئے بلکہ ہمیں ان سے تعاون کی درخواست کرنی چاہئے اور ان سے جو بھی مدد ملے اسے حاصل کرنی چاہئے۔

ایسی صورت میں ہم مذاہب کو ارتباتیت کی نظر سے کیوں دیکھیں جہاں خود اقدار میں

ارتباط ابھی ایک مسئلہ بنا ہوا ہے، یہ کام تعلیم کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ کیا یہ خصوصاً اقدار کے معاملے میں ہی نہیں کہ تمام مذاہب کو ایک دوسرے کے نزدیک آنا چاہئے؟ اگر یہاں ارتباتیت کو درست مان لیا جائے تو اس کی وجوہات کچھ اور ہیں۔

تعلیم میں صحیح اقدار خود بخود منتقل نہیں ہو جاتیں

گیبریل:

میں نے اپنی اس سے قبل مداخلت میں اس بات طرف اشارہ کیا تھا کہ نصاب میں مشمولات خود ایک بڑا مسئلہ ہے ہمیں یہ قیاس نہیں کرنا چاہئے کہ تعلیم کا مقصد یقینی طور پر رواداری اور انسانیت ہے۔ میری یہ فکر مذہبی فرقوں کے بارے میں کسی شک کے حوالے سے نہیں تھی بلکہ یہ اس عام قیاس کے بارے میں تھی کہ تعلیم میں صحیح مشمولات خود بخود منتقل ہو جائینگی۔

مذہبی تعلیم کے میدان میں نئی مشمولات اور پالیسوں کی وضاحت کی جانی چاہئے

بیلا ربی:

مجھے بھی پروفیسر گیبریل کی طرح تعلیم میں مشمولات کی فکر ہے کیونکہ اس کی اپنی خود بہت اہمیت ہے۔ ان مشمولات سے اقلیتوں یا جنسی تفریق سے متعلق آمرانہ تصورات اور تفریقی قیاس جنم لے سکتے ہیں۔ لہٰذا مذہب کے بنیادی اصولوں جیسے رواداری، ہم آہنگی اور نصفت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں مذہبی تعلیم کے میدان میں نئی مشمولات اور نئی پالیسیوں کی وضاحت کی جانب توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بہت سے حکمراں عوام کو جہالت اور کاہلی جیسی حالت میں رکھنے کے لئے مذہبی تعلیم کا سہارا لیتے ہیں تا کہ وہاں کے لوگ اپنے جمہوری حقوق کے لئے جدوجہد کرنے سے باز رہیں؟ ہمیں ایسی مذہبی تعلیم منظور نہیں کیونکہ یہ

انسانوں، جمہوریت اور انسانی حقوق کے منافی ہے اور یہ مذہب کے بھی خلاف ہے۔

مذہبی تعلیم کو مذہب کی اصل اقدار کے ساتھ ترتیب نو کی ضرورت ہے

طاہر محمود:

اپنے مقالے کی آخر میں میں نے تعلیم میں تعلیم کی مشمولات یعنی نصاب میں شامل کیے جانے والے موضوعات کی بابت تشویش کا اظہار کیا تھا۔

جہاں تک مذہبی تعلیم کی بات ہے تو اس سلسلے میں میں یہ عرض کرنا چاہونگا کہ مختلف مذاہب کے ہی مختلف گروپوں میں انتہائی نا اتفاقی اور اختلاف رائے ہے اور کبھی کبھی تو یہ ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ آخر مذہبی تعلیم کا نام لے کر کیا کچھ پڑھایا جائے گا۔ اگر ہم مذہبی تعلیم کے معاملے میں عیسائیوں سے Crusade (صلیبی جنگ) اور مسلمانوں سے جہاد کی بات کریں تو کوئی راہ نکل ہی نہیں پائے گی۔ مذہبی تعلیم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک مذہب اپنے متبعین سے یہ توقع کرے کہ وہ دوسرے مذاہب کے متبعین کے ساتھ دست گریباں ہوں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مذہب کی اصل اقدار کی مستقل طور پر ترتیب نو کی جائے جو ہمارے سامنے عالمی بھائی چارے کی شکل میں موجود ہے اور جو ہمیں ایک دوسرے کی عزت کرنے کی دعوت دیتی ہے اس قسم کی مذہبی تعلیم کو لازمی بنایا جانا چاہئے نہ کہ اس تعلیم کو جسے ہمارے مذہبی رہنما مذہبی تعلیم کا نام دیتے ہیں۔ بقول شاعر۔

جن چراغوں سے تعصب کا دھواں اٹھتا ہے
ان چراغوں کو بجھادو تو اجالے ہونگے

عیسائیت اور اسلام میں تبلیغ اور تعلیم :
ایک قدیم تصور

جارج خضر

تمہید

اپنی گفتگو کا آغاز کرتے وقت میں یہ مشورہ دینا چاہوں گا کہ ہمارا موضوع ''تبلیغ اور تعلیم'' سب سے پہلے اس انسانی برتاؤ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو فرقوں کے سوشلائزیشن کے آہستہ رو عمل میں رائج ہے اور جو خدا کو اپنا حتمی گردشی محور تصور کرتا ہے۔

بالفاظ دیگر، تبلیغ کا خاص مقصد فرقوں میں تعلیم ہے۔ اس کا مقصد ایک فرقہ کے ماننے والوں کی حدود میں اضافہ کرنا ہے اور اسے اس کی مادی حد بندی سے آگے دھکیلنا ہے تاکہ یہ لوگوں کی روح، ان کے گھر اور ان کی شہروں کی زندگی تک پہنچ سکے۔

جیسا کہ آرک بشپ جان (شاہووسکائے) نے شعری انداز میں اسے بیان کیا ہے کہ ''جس طرح شہد کی مکھیاں کھیتوں کے پھولوں سے شہد اکٹھا کرتی ہیں اسی طرح عابد حضرات سچی عبادت کے بعد جنتی مٹھاس اپنے گھروں کو لے آتے ہیں اور اسے دنیا میں تقسیم کرتے ہیں۔''

1. سچائی کا اعلان

قدیم مسیحی نظریہ کے مطابق سرمن (مذہبی خطاب) لوگوں میں، ان کے دل، ذہن اور خواہش میں روح پھونکتا ہے۔ یہ پادری کا کام ہے جو تین شکلیں اختیار کرسکتا ہے :

- کلیسا میں تبلیغ یا دوسرے الفاظ میں، مقدس کتاب کی مکمل تفسیر و تاویل۔ اس کی بنیاد کلیسا کی روایت یا پھر حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کی روشنی میں انجیل کی صداقت ہے جو سب سے پہلے انجیل اور اس کے ابتدائی مفسرین یا اپوسٹلس

کے ذریعے اور اس کے بعد کلیسا کے پادریوں کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ مذہبی علما کے الفاظ بلا واسطہ اور انجیل کی صداقت کے سادہ بیان ہونے چاہئیں۔

- کلیسا یا پھر عیسائی تعلیم کے مکمل میدان سے باہر رسمی یا غیر رسمی ادارے جیسے اسکولوں، اعلیٰ تعلیمی اداروں اور ساتھ ہی مسلسل تعلیمی تنظیموں جیسے کلب، فرقوں کے گروہ اور اس جیسے دیگر اداروں میں لکچر دینا۔
- گھروں اور اس کے ساتھ ہی 'شہر' میں گواہوں کا مشاہدہ کرنا۔

عیسائیت کے اس تصور جیسا دلچسپ نظام اسلام میں بھی ہے :

- اسلامی تعلیمات کی بنیاد قرآن اور حضرت محمدؐ کی روایات ہیں جن کو تمام مسلمان پہلا اور ماڈل خاطب تصور کرتے ہیں۔ محمدؐ نے خطابات دیے، اجلاس کا انعقاد کیا اور اپنے پیروکاروں کو پہلی مسجد، جو مدینہ میں ان کے گھر کے پاس واقع تھی، لے کر گئے۔ انھوں نے امت، یعنی مسلم فرقہ کے لیڈر کی حیثیت سے اس کام کو انجام دیا۔ ان معنوں میں مسجد کو بذات خود اس فرقہ کا مرکز تصور کیا گیا جس کا استعمال روحانی اور عملی دونوں طور پر ہوتا تھا۔ ابتدا میں مسجد مختلف قسم کا کردار ادا کرتی تھی جس سے خاطب کی مختلف النوع سرگرمی ظاہر ہوتی تھی۔ رچرڈ اینٹون نے اپنی مشہور کتاب 'جدید دنیا میں مسلم خاطب' میں مسجد کے کردار پر اس طرح روشنی ڈالی ہے : ''یہ ایک پناہ گاہ، اہم عوامی معاملات پر بحث کرنے کی جگہ، ایک اسکول، مسافروں کے لیے آرام کرنے کی جگہ اور عبادت کی جگہ تھی۔''

اس قسم کے ڈھانچے میں خاطب کا رول دلائل کے ساتھ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ دنیا کی روزمرہ کی زندگی اور لازمی اجزا کے درمیان ایک بہتر ربط تھا۔

- اس طرح مسلم تعلیم کو عوامی رائے کی تشکیل، بنیادی تنظیموں کی تشکیل اور وسیع اسلامی نظریے کے حامل تعلیمی افراد پیدا کرنے میں مرکزیت کا درجہ حاصل تھا۔
- جہاں تک گواہوں کا مشاہدہ کرنے کا معاملہ ہے تو اسلام میں اسے 'جہاد' لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ گیفنے نے وضاحت کی ہے کہ غیر مسلموں کے لیے یہ ماننا عام سی بات ہے کہ لفظ 'جہاد'، جس کا عربی میں لغوی معنی 'مذہبی جنگ' ہے، کا مطلب منکرین (کافروں) کے خلاف جسمانی طور پر جنگ کرنا ہے۔ حالانکہ یہ معنی صحیح ہے لیکن اس لفظ کا صرف یہی معنی نہیں ہے۔ اسلام کی امن پسند تعلیمات سے بھی اس کا معنی اخذ کیا جاسکتا ہے : ''حکمت عملی اور بہترین تبلیغ کے ذریعے (تمام افراد کو) خدائے برتر کی راستے کی دعوت دو [.....]'' (قرآن 16,125)۔

مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ کھلی بحث کے دوران علم اور حکمت کے ذریعے جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر کسی مسلمان کی موت اسلام کی تبلیغ و تشہیر کے وقت واقع ہو جاتی ہے، چاہے وہ مواد کی تیاری کے وقت مرا ہو یا پھر گفتگو کے لیے جاتے وقت اس کی موت ہوئی ہو، تو اسے شہید مانا جائے گا جس پر اللہ کی رحمت ہوگی۔ یہاں پر یہ چیز دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ عربی لفظ 'شہادۃ' کے دونوں معنی ہیں، یعنی گواہی اور شہادت۔

2. خاطب یا مبلغ (Preacher)

اسلام میں تعلیم کی سب سے مقبول اور روایتی شکل مسجدوں میں دیکھنے کو ملتی ہے جہاں پر تعلیم دینے والے کو، جو کہ جمعہ کی نماز کے دوران خطاب بھی کرتا ہے، خاطب (یا امام، جس کا معنی ہے وہ شخص جو سامنے کھڑا ہوتا ہے) کہا جاتا ہے، اور خطبہ دینے کی روایت سیدھے طور پر

نبیؐ کے ذریعے قائم کی گئی روایت کو پیش کرتی ہے جو کہ 'امت' (یا لوگوں) سے مخاطب ہونے کے ان کے طریقہ کی نقل ہے۔

خاطب کے رول میں ہونے والی تبدیلی کو نبیؐ کی وراثت سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اسلامی سیاست اور معاشرہ میں خاطب کے ثقافتی، سیاسی اور معاشرتی پس منظر کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں اسلام کے پھیلنے سے قبل کے اس دور کی طرف جانا ہوگا جہاں پر خاطب ایک قبائلی ترجمان یا کہانی سنانے والا ہوتا تھا۔ عوام کے سامنے آتے وقت اس کے پاس ایک خاص نشانِ امتیاز ہوا کرتا تھا جو یا تو نیزہ کی شکل میں ہوتا تھا یا پھر اس کے ساتھ کوئی ایسا آدمی ہوتا تھا جو اس بات کا اشارہ ہوا کرتا تھا کہ یہ شخص (خاطب) قبیلہ کا نمائندہ ہے۔ اسلام کے ابتدائی ایام میں، نبیؐ نے ''عوام سے پورے اختیار کے ساتھ'' گفتگو کرنے کے لیے خاطب کا رول اختیار کیا۔ حکمرانی اور عظمت کے نشان کے طور پر کسی فرد یا خاطب کے نیزہ کے ساتھ اسلامی خاطب مسلم فرقہ کو مخاطب کیا کرتے تھے، لیکن یہ خطاب قبائلی جنگ یا مقابلہ کے متعلق نہیں ہوتا تھا بلکہ خدا کے پیغام کو پہنچانے کے مقصد سے ہوا کرتا تھا۔ مزید برآں یہ کہ، نبیؐ نے خاطب کے طور پر صرف روحانی امور پر ہی روشنی نہیں ڈالی بلکہ منبر کا استعمال وہ اخلاقی سماجی اصلاحات کو فروغ دینے کے مقصد سے بھی کیا کرتے تھے۔

خاطب کے منبر کی اہمیت یوں بھی ہے کہ یہ وہ مقام تھا جہاں سے دنیاوی اور روحانی معاملات پر روشنی ڈالی جاتی تھی، اس روایت کو نبیؐ کے علاوہ ان کے خلفائے راشدین نے بھی قائم رکھا اور ان چاروں خلفاء نے مسلم فرقہ کے لیڈر کی حیثیت سے اپنے خطبے دیے۔ یہ خطبے ''اسلام کے ابتدائی ایام کی نوعیت اور عرب خاطب سے متعلق تھے جہاں پر بادشاہ خود ہی ترجمان ہوا کرتا تھا اور وہ نہ صرف یہ کہ خاطب کے طور پر منبر سے روحانی تقریر کرتا تھا بلکہ احکام بھی جاری کیا کرتا تھا، فیصلے لیا کرتا تھا اور سیاسی امور پر اپنے خیالات ظاہر کرتا تھا خاص کر عوامی مفادات کے سوال کے جواب دیا کرتا تھا۔''

یہ سیاسی رشتہ جو بادشاہ وقت کو منبر سے جوڑتا تھا، اور خاطب کا رول چاروں خلفائے راشدین کے بعد امویوں اور ان کے گورنروں کے دور میں بھی جاری رہا جن کا منبر پر کنٹرول بدستور جاری رہا اور یہ حضرات جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے اور نماز پڑھایا کرتے تھے۔ بہت بعد میں بھی جب حقیقی بادشاہ خاطب نہیں ہوا کرتے تھے، ایک ایسی روایت کا عروج ہوا جس میں خاطب، جواب بادشاہ کی جگہ منبر پر بیٹھا کرتا تھا، وہ نماز کے بعد ملک کی سلامتی کے لیے دعا کرتا تھا۔ موجودہ دور میں اور اس روایت کے مطابق خطبے میں بادشاہ کا نام شامل کرنا یا خطبے سے اس کا نام خارج کرنا نماز کے لیے جمع ہونے والے افراد کے لیے یہ اشارہ ہوا کرتا تھا کہ یہ خاطب کی طرف سے سیاسی تنظیم کی حمایت میں یا پھر اس کے خلاف ایک سیاسی اعلان ہے۔

اس کی حمایت میں گیفنی لکھتے ہیں کہ منبر عوامی حکمرانی کی علامت ہے اور مساجد ''اس مذہبی و سیاسی نظام کا اظہار ہیں جو اس فرقے کے کردار کو پیش کرتی ہیں جو انھیں بناتے ہیں، ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور اصولی طور پر اس کے اسٹاف کی تقرری کرتے ہیں۔'' ان معنوں میں خاطب کو اختیارات نہ صرف یہ کہ خدا کی طرف سے حاصل ہوتے ہیں بلکہ اس فرقے کے اندر سے بھی حاصل ہوتے ہیں جو اجماع کے ذریعے اس کی حکمرانی کی توثیق کرتے ہیں۔ اینٹون کا یہ تبصرہ بجا طور پر درست ہے کہ بہت سے انفرادی خاطب آج کل اپنے خطاب کو علامتی عوامی اظہار کے طور پر حکومت کے ذریعے دیے گئے ''سرکاری حکم'' کو فروغ دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ اسلامی معاشرے میں خاطب اور ان کے خطاب اخلاقی ضابطوں میں تبدیلی پیدا کرنے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں اس لیے اپنے فرقے کے اندر ان کا زبردست اثر و رسوخ ہوتا ہے۔

چونکہ اسلام کسی بھی قسم کی مقدس پادریت کو نہیں مانتا ہے اس لیے پادری اور خاطب کے رول کے درمیان متوازی لائن کھینچنے سے انسان تذبذب کا شکار ہو سکتا ہے۔ لیکن چند دلچسپ تبصروں کو درکنار نہیں کیا جا سکتا ہے :

- قدیم نظریہ کے مطابق مرشد ان معنوں میں ایک امام ہے کہ وہ عوام کے نمائندہ کی حیثیت سے خدائی منبر پر ہجوم کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ امام کی تقرری کے موقع پر یہ ضروری ہے کہ عوام اپنے اجماع (اتفاق رائے) کے ذریعے یہ دعویٰ کریں کہ ''وہ اس لائق ہے۔'' یہ تمام چیزیں سرکاری طور پر اسے اس عہدے پر مقرر کرنے سے پہلے ہو جانی چاہئیں۔ پادریت ایک ایسی آئینی اکائی کی شکل میں عوام کا فعل ہے جو عیسیٰ مسیح کی ایک مشترکہ مجلس کو پیش کرتا ہے۔
- مرشد یا پادری سیاسی یا غیر جانبدار نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ نظریاتی طور پر سیاسی ہوتا ہے جسے اس شہر کی حمایت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے 'شہر کی زندگی' کے بارے میں حالات کی پوری جانکاری ہونی چاہیے۔ کسی بھی مخصوص پارٹی یا فریق میں شامل ہوئے بغیر یا کسی حکومت کی حمایت یا اس کی مخالفت کے بغیر، اسے اس بات کے لیے تیار ہونا چاہیے کہ اس کے پیروکاروں میں مختلف عقیدے اور مخالف پارٹیوں کے افراد ہوں۔ مقدس جام کی تقسیم کے موقع پر اسے ان افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ کھڑا ہونے کے لیے آمادہ کرنا ضروری ہے تاکہ ان کی زندگیوں میں بھائی چارگی کے طور پر اتحاد کی روح پھونکی جا سکے۔
- پادری 'زندگی سے باہر' نہیں ہوتا ہے : بلکہ وہ اس کی خود پسندیوں سے باہر ہوتا ہے، اس کا کام سماجی تنظیم کے نئے طریقوں کی ایجاد کرنا نہیں ہے بلکہ کسی بھی موجودہ سماجی نظام میں رہتے ہوئے لوگوں کو خدا کے تئیں فرمانبردار بنانا ہے۔ وہ لوگوں کو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ وہ زندگی کی تمام تر شرائط کے ساتھ فرمانبردار رہیں اور زندگی کی ہر راہ پر عیسیٰ مسیح کی روح کے ساتھ گامزن ہوں۔

● خود عیسیٰ مسیح کی طرح ہی ایک پادری لوگوں کو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ وہ چاہے جس معاشرتی نظام کو اختیار کریں لیکن معاشرے میں ایک دوسرے کے ربط میں رہیں۔

3. تعلیمی عمل

اسلام میں تعلیم کی ذمہ داری صرف خاطب کی ذمہ داری تک ہی محدود نہیں ہے، جو مسجد میں نماز پڑھاتا ہے اور روایتی خطبہ دیتا ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف اسلام قبول کرنے کی 'دعوت' دینا تمام ایمان والوں کا فریضہ ہے جو کہ صرف مسجد تک ہی محدود نہیں ہے۔

قرآن میں 'دعوت' کے بنیادی تصور سے مراد مسلمانوں کو دیے گئے خدا کے اس حکم کی ذاتی اپیل یا اقرار ہے جس کے تحت خدا کے ذریعے اتاری گئی مقدس کتاب کی روشنی میں دوسروں کو دلائل اور حکمت کے ساتھ خدا کا یہ پیغام پہنچانا ہے جو کہ خدا کے سیدھے راستے کی طرف جاتا ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ ''حکمت اور بہترین تعلیم کے ذریعے تمام افراد کو خدا کی سچی راہ کی طرف بلاؤ اور ان سے اس طرح گفتگو کرو جو بات کرنے کا سب سے بہتر طریقہ ہے[.....]''(16,125)۔

چونکہ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ ''مذہب میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے'' (2,256)، اس لیے مذہبی اور سماجی مشن کے طور پر دعوت کا مطلب 'مدلل تدبر' پر زور دینا ہے نہ کہ زور زبردستی کرنا ہے۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ کچھ بددماغ اور بیوقوف لوگ اس آواز پر کبھی بھی لبیک نہیں کہیں گے، چاہے انھیں کتنے ہی اچھے انداز میں کیوں نہ دعوت دی جائے، لیکن اسی کے ساتھ قرآن میں پلٹ وار نے کی بجائے صبر وتحمل کی تلقین بھی کی گئی ہے :

''[.....] خدائے برتر کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ کون اس کے راستے سے بھٹک چکا ہے اور کس نے رہنمائی قبول کر لی ہے۔ اور اگر آپ ان کی پکڑ کریں گے تو وہ بھی آپ کی پکڑ کرنے لگیں گے: لیکن اگر آپ صبر وتحمل کا مظاہرہ کریں گے تو یہ ان لوگوں کے لیے بہتر طریقہ

ہے جو صابر ہیں۔ ان لوگوں کا یہ صبر وتحمل خدا کی طرف سے ودیعت کیا ہوا ہے؛ ان پر افسوس نہ کریں: اور ان کی سازشوں کی وجہ سے خود کو پریشان نہ کریں۔'' (16,125-127)

دعوت کسی داعی یا داعیہ کی طرف سے دی جاتی ہے جو کہ کوئی بھی مسلمان ہو سکتا ہے جسے مذہب کا پورا علم ہو اور جو لوگوں کو اسلامی طریق زندگی اختیار کرنے اور ایمان والوں (امت) کے فرقے میں داخل ہونے کے لیے انھیں اچھی طرح آمادہ کر سکتا ہو اور خود ان کے سامنے اپنی مثال پیش کر سکتا ہو۔ دعوت کے اس 'فرقہ وارانہ طول وعرض' پر قرآن کے 'اقرار' یا 'میثاق' کے اس تصور سے زور دیا گیا ہے جو خدا اور تمام مسلمانوں کے بیچ قائم ہے۔ اس لحاظ سے مومنین میثاق میں خدا کی اصلی دعوت کو قبول کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں، جس دعوت کو خدا نے اپنے نبیؐ کے ذریعے لوگوں کے پاس بھیجا ہے : خدا کی اپیل نبیؐ کی اپیل میں تبدیل ہو جاتی ہے؛ لہٰذا محمدؐ اس کی پیروی میں ان لوگوں کو منظم کرتے ہیں جو ان کا جواب دیتے ہیں اور ہر ایک سے عہد و پیمان لیتے ہیں اور اس طرح ایک 'امت' کی تشکیل کرتے ہیں جو بعد میں 'دعوت' کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتی ہے۔''

دعوت کو ایک روحانی پروجیکٹ کے طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے جو کہ ''غیر مسلموں کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ مسلمانوں کے لیے۔'' دعوت کی اساسی بنیاد توحید ہے، یعنی خدا کو ایک ماننا، لیکن اس نظریہ کو وسیع فلسفیانہ اور سماجی معنوں میں بھی لیا جا سکتا ہے۔ اسماعیل الفاروقی نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ دعوت کا خیال اسلام کا روحانی خیال ہے جو کہ دانشوری کا تجربہ حاصل کرنے کے لیے ذاتی علم کی خواہش ہے اور خدا کے اس مقصد کی تکمیل ہے کہ انسانی استعداد کو پہچانا جائے : ''اس فریضہ کو پورا کرنے کے لیے اور خدا کے طریقہ کو اپنانے کے لیے تمام افراد زمان ومکان کے اندر جمع ہوتے ہیں۔ کسی بھی فرد واحد کے لیے یہ کام کبھی پورا نہیں ہوتا۔ مسلم ایک ایسا شخص ہے جس نے اس بوجھ کو برداشت کرتے ہوئے خود کو اسے حقیقت کی شکل دینے کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ غیر مسلم کو اب بھی اس تبدیلی کو قبول کرنا ہے۔ اس لیے 'دعوت' لازمی طور پر دونوں کو دی جاتی ہے، مسلمانوں کو اس لیے تاکہ وہ

حقیقت کے اس راستے پر خود کو مزید سرگرمی سے آگے بڑھا سکیں اور غیر مسلم کو اس لیے تاکہ وہ ان لوگوں کے صف میں آسکے جنھوں نے خدا کے راستے پر عمل پیرا ہونے کو اپنا عظیم مقصد حیات بنالیا ہے۔''

اس طرح یہ بات سمجھ میں آئی کہ دعوت خود کو حقیقت میں تبدیل کرنے کا ویسا ہی عمل ہے جس طرح کہ یہ ایک مذہبی مشن ہے۔ الفاروقی کا یہ کہنا کہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کی صف میں داخل ہونے کی دعوت دینا تاکہ ایمان والوں کی ایک فوج کھڑی کرنے کے خدائی مقصد کی تکمیل ہوسکے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے جہاد کے لیے فوج کھڑا کرنا ہے بلکہ اس سے مراد خدا کی خواہش کے مطابق ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہے جس کے افراد خود اپنے اندر اصلاح کرنا چاہتے ہوں۔ اس قسم کی تشریح قرآنی آیات کی روشنی میں کی جاسکتی ہے: اور تم میں سے ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خیر کی طرف بلائے اور نیک کام کرنے کے لیے کہا کرے اور برے کاموں سے روکا کرے۔ (4, 104)

اس طرح 'دعوت' وسیع پیمانے پر اچھائی کو فروغ دینے اور ناانصافی کے خلاف لڑنے کا حکم ہے۔ آیت 4,104 میں دعوت کو ایک طرح سے 'امت' لفظ کا مترادف اور خود سچائی بتایا گیا ہے۔

اس پس منظر میں خدا اپنے بندوں سے یہ بھی کہتا ہے کہ ''تمام دنیا کی مخلوق کو جا کر یہ خوش خبری سنادو'' (Mk 16:15)۔

لفظ 'دعوت' (اگر اسے ایسا کہا جاسکتا ہے تو) عیسائی نظریہ کو مجملاً بیان کرتا ہے۔ یہ الفاظ عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کی مساوی طور پر رہنمائی کرتے ہیں اور ہماری مشترکہ دعوت کو موزوں پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ آج کل ہم جس دنیا میں تیزی سے قدم رکھ رہے ہیں جہاں ہماری مصروفیات مشترک ہیں، یہ ہوسکتا ہے کہ عقیدے کے مطابق ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوں لیکن انسانیت اور خدا کے لیے، جن سے ہمارا لینا دینا ہے، ہم اجنبی نہیں ہیں۔ جیسے جیسے ہم خدا کے قریب ہوتے جاتے ہیں ہمیں یہ احساس زیادہ سے زیادہ ہونے لگتا ہے کہ اس کے سامنے ہم سب ایک ہیں، لہٰذا ہماری طرف سے بھی اس کا جواب ایک

فرقہ کے طور پر ہونا چاہیے تاکہ ہم اس سے کوئی پھل پاسکیں۔ ہمارے جوابی الفاظ تقریر کے طور پر نہیں ہوتے نہ ہی تعلیمی پیغام کے طور پر بلکہ ایسے الفاظ کے طور پر سامنے آرہے ہیں جو ہمارے سروں سے اوپر نکل جاتے ہیں۔ اس تقریر میں کوئی حرف نہیں ہے؛ اس کی ہر آواز ایک مشترکہ حالت ہے، جو ہماری روزمرہ زندگی میں ہمیں ایک دوسرے سے باندھے رکھتا ہے۔

ہمارے عیسائی راہبوں اور مسلم صوفیوں، دونوں نے ہی 'تعلیم' کے معنی کو لاعلمی کے خدائی اندھیرے سے تعبیر کیا ہے۔ یہ صرف اصولی بحث ومباحثہ تک ہی محدود نہیں ہے جس کی تعلیم ان دونوں فرقوں میں دی جاتی ہے جہاں پر کوئی بھی حقیقی طور پر اپنے پارٹنر کو نہ تو پہچانتا ہے اور نہ ہی اس کو خطاب کرتا ہے۔ لاعلمی کا یہ خدائی اندھیرا امید کی ایک رات ہے، یہ بیکار امید نہیں ہے بلکہ ایسی امید ہے جس کی تکمیل ہمارے اوپر اور ہمارے ذریعے تبھی ہوتی ہے جب ہم مشترکہ طور پر اس کا جواب دیتے ہیں۔ ہم ایک ایسے دیدارِ الٰہی کی امید کرتے ہیں جس کے بارے میں ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے، ہمیں جو کچھ معلوم ہے وہ ہے مقام، اور اس مقام کو 'امت' یا فرقہ کہتے ہیں۔

ہم اپنی مشترکہ امیدوں کی اس مشترکہ رات میں شاید یہ محسوس کرنے والے ہیں کہ خدا کا کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس کے بارے میں واضح طور پر جانا جاسکے اور اس کو بیان کیا جاسکے، لیکن جو الفاظ ہمیں بتائے گئے ہیں ان کی وضاحت ہماری انسانی حالت کے مطابق کی گئی ہے کہ ہم ایک دوسرے کی طرف منہ کرکے کھڑے ہیں۔

خدا کی مخلوقات کے تئیں وفاداری کیے بغیر ہم خدا کی فرمانبرداری نہیں کرسکتے۔ اس کے بعد ہی حقیقی مشترکہ زندگی منظر عام پر آئے گی، جس میں عقیدہ کا کوئی امتیاز نہیں ہوگا بلکہ جہاں پر سخت ذہنی یا جسمانی تکلیف اور امید کی ایک ایسی مشترکہ حالت ہوگی۔ اس حالت کا مقابلہ ہم جس طرح کرتے ہیں وہ ہمیں خدا کو پانے کے لیے مشترکہ طور پر ایک دوسرے سے باندھے رکھتا ہے۔

تبلیغ اور تعلیم کی مجموعی طور پر تعریف شاید اُصفی کی تصنیف میں کی گئی ہے جس کے مطابق ''وہ جس کا حاکم عظیم الشان ہے، وہ لفظ کے ساتھ کلام کرتا ہے۔ یہ لفظ تمام روحانیت کا نچوڑ ہے جس کا تعلق حروف و آواز سے نہیں ہے، یہ ایک ایسی صفت ہے جس کا خاموشی کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا[......]۔ عظیم الشان خدا اسی لفظ میں بات کرتا ہے، حکم دیتا ہے، منع کرتا ہے اور بیان کرتا ہے۔ اور [......] خدا کا غیر تخلیق شدہ لفظ، ہماری زبانوں سے دہرا جاتا ہے، ہمارے کانوں سے سنا جاتا ہے[......]، ہمارے دلوں میں محفوظ ہوتا ہے، اس کے بعد بھی ان میں صرف ناپائیدار حالت نہیں ہے[......]۔''

سوالات و مداخلات

اعلان شدہ الفاظ فرقے کی تشکیل کرتے ہیں اور لوگوں کو ذاتی طور پر خدا کا فرمانبردار بناتے ہیں

بشتیہ :

پیامبر خضر کی پیش کش کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہونے کے ناطے میں یہ سوچتا ہوں کہ اس ماحول میں تناؤ پیدا ہونا فطری ہے جس میں عیسائی فرقہ زندگی گزار رہا ہے۔ اعلان شدہ لفظ، جہاں ایک طرف فرقہ کی تشکیل کرتا ہے وہیں دوسری طرف وہ فرقہ جو اس لفظ سے باہر رہتا ہے، وہ ان لوگوں کا مجمع ہے جو ذاتی طور پر اپنے خدا کو جوابدہ اور اس کے لیے ذمہ دار ہیں۔ لازمی طور پر اس نازک شے، یعنی فرد واحد کے ساتھ ساتھ اس کے فرقے اور اعلان شدہ لفظ کے درمیان تناؤ ایک طرف ہے اور دوسری طرف فرقہ کی تشکیل دینے کے عمل کے طور پر اس لفظ کا رول ہے، پھر بھلا ہم کیسے ان دونوں اشیا کو باہم مربوط رشتے میں باندھ سکتے ہیں؟

اس لفظ کے تئیں فرمانبردار کا کھلا پن جو معتقدین کے خود اپنے فرقہ کی تشکیل کرتا ہے اور ساتھ ساتھ پوری طرح ذاتی مواد، جو کہ فرد واحد کے لیے طبعی ذمہ داری ہے، اسے ہمیشہ خود احتسابی ہونا چاہیے اور فرقہ کے بارے میں زندہ حقیقت کیا ہے اس کے متعلق کبھی بھی غیر سوالیہ یا غیر تنقیدی نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں پر میں ایک وسیع تناؤ محسوس کرتا ہوں کہ کیا فرقہ اور فرد واحد، دونوں ہی جو اس میں یقین رکھتے ہیں، زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

عیسائی فرقے کا مقدس کردار

خضر :

یہ عیسائی فرقہ پر صادق آتا ہے کہ اس کا کردار مقدس ہے، یعنی ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ

ایک ایسا فرقہ جس کی جڑیں امید پر ٹکی ہوئی ہیں، جو شدت کے ساتھ خدا کے فرمان کا انتظار کر رہا ہے، چاہے وہ حضرت عیسیٰؑ کا دوسرا اوتار ہو یا اگر کوئی مسلم فرقہ کے بارے میں سوچتا ہے تو، مہدیؑ کی آمد۔ یہ ایک ایسا فرقہ ہے جو مسلسل حرکت میں ہے، اور جو کلیسا کے بارے میں بتا رہا ہے، یہاں اور اب کبھی بھی پوری طرح 'عیسیٰؑ کے جسم' کے مشابہ نہیں ہے۔ یہ دنیا میں رہتا ہے لیکن اس کا تعلق دنیا سے نہیں ہے (cf. Jn 15:19, 17:14-18)۔

مصلحین اور دیگر کلیساؤں سے لمبے عرصے تک بحث و مباحثہ کرنے کے بعد اب ہم یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ ہم 'گناہ گاروں کا کلیسا' ہیں۔ ہم کیا ہیں، ہم ہمیشہ گناہ گار جسم کے درمیان ہونے والے تناؤ میں رہتے ہیں، ایک ایسا جسم جسے خدا کے لفظ کے ذریعے ہمیشہ درست کرنے اور مرمت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، اور قیامت کے روز اس فرقہ کا حشر کیا ہونے والا ہے، ''اپنے شوہر کے لیے سجی سنوری دلہن، لیمب کی بیوی'' (Rev. 21:2.9)۔ لفظ اور مقدس رسومات اسی طرح ہیں جیسے کہ کلیسا کے ڈھانچے، جس طرح مقدس رسومات لفظ کی الگ شکلیں ہیں۔ اس لیے کلیسا خود اپنے آپ میں ایک لفظ کی تعمیل میں دوسرے لفظ کی تنقید ہے، اور اسی لیے ہم اس چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کے لیے ہمیں یہاں بلایا گیا ہے۔

''بہترین مخلوق'' ہونے کے تناؤ میں گرفتار امت پھر بھی اسے اصلاح کی ضرورت ہے

اسلام میں ہمارے پاس امت کے معاملے میں اس طرح چیزوں کو دیکھنے کا رواج نہیں ہے؛ اسلام میں 'عیسیٰؑ کے جسم' جیسا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ ''تم تمام انسانوں میں بہترین امت ہو [.....] - كنتم خير امت اخرجت الناس [.....]'' (4,110)۔ ظاہر ہے کہ مسلمان لبنان، شام، سعودی عرب یا افغانستان میں رہنے والے اپنے

فرقے کے بارے میں یہ ہرگز نہیں سوچتے کہ وہ سب سے بہتر ہیں۔ بلکہ وہ خود کو خدا کے فرقے کے طور پر تصور کرتے ہیں، خدا کی آواز، یعنی اس لفظ پر لبیک کہنے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں جو ان کو مخاطب ہو کر کہا گیا ہے اور اسی لیے اپنی اصلاح کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ صرف اسی طریقے سے، یعنی امید، جنگ اور جدوجہد کے ذریعے ہی مسلم فرقہ سب سے بہتر بن سکتا ہے۔

عیسائی پادری اور امام کے درمیان اختلافات

صالحہ ایس محمود :

عیسائی اور مسلم مذہبی سمجھ بوجھ کا معاملہ، تبلیغ پر زیادہ زور دیتے ہوئے جہاں سامنے آتا ہے، وہاں ہمارے لیے اس حقیقت کو جاننا ضروری ہے کہ اسلام اور عیسائیت میں مبلغ سے مراد الگ الگ مرتبہ کے لوگ مراد لیے جاتے ہیں۔ ہمارے درمیان نہ تو پیشہ ور کلیسا ہیں اور نہ ہی اس قسم کے مبلغ، دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام کا مرتبہ پادری کے برابر نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں پادریت کے روایتی نظام کا علم ہے۔ عیسائی مذہب کے رسمی مبلغ اور اسلام کے غیر رسمی لیڈر کے بارے میں تعلیم پر زور دیے جانے پر یہ کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟

خدا اپنے فرمان کے ذریعے ہماری رہنمائی کرتا ہے

خضر :

عیسائی عقیدہ کے مطابق پادری، خدا اور انسانوں کے درمیان ثالث نہیں ہوتا۔ ''عیسیٰؑ مسیح، بذات خود انسان، کے علاوہ کوئی ثالثی نہیں ہیں جنھوں نے تمام انسانوں کی طرف سے خود کی قربانی دی'' (1 Tm 2:5 f.)۔ کوئی بھی دوسرا انسان ثالث نہیں ہے۔ خدا تک رسائی حاصل کرنا سب کے لیے ممکن ہے۔ بعض معنوں میں ہم کلیسا کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ثالثی کا کردار ادا کرتا ہے کیوں کہ کلیسا فرد کے اندر فرقہ کی روح پھونکنے اور دوسرے کے ساتھ

ملانے کا کام کرتا ہے، فرد واحد کو اس فرقہ کا شخص بنانے کی کوشش کرتا ہے جہاں پر خدا کا احساس کیا جاسکتا ہے۔ خدا اپنے فرمان کے ذریعے براہِ راست ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اور اگر پادری ہمیں خود اپنے نظریات کی تعلیم دیتا ہے، جو کہ اس کا ذاتی نظریہ ہے تو ہمیں اس کی بات کو سننے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہم اس کی اصلاح کر سکتے ہیں۔

پادری کا کام لوگوں کو تعلیم فراہم کرنا اور ان کو راستہ دکھانا ہے

چند زمانہ قبل ہمارے درمیان بہت اچھے عالم، عبداللہ ال الائیلی ہوا کرتے تھے جنھوں نے جامعہ ازہر سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ بہت زیادہ مذہبی نہیں تھے لیکن اپنے دور کے دنیا کے سب سے بڑے عربی داں تھے۔ ایک بار انھوں نے کہا تھا، ''میں عیسائیوں کے درمیان وہ پادریت دیکھتا ہوں، کیوں کہ ان کے درمیان کچھ ایسے لوگ ہیں جو انفرادیت کی نگرانی کرتے ہیں۔'' اگر ہم اپنے ذہن میں یہ تصور قائم کرلیں کہ کلیسا کو پرفیکشن قیامت کے دن نصیب ہوگی، اسی لیے یہ ایک مقدس ادارہ ہے، تو انفرادی معتقد کو تب تک درست نہیں کیا جاسکتا۔ اور الائیلی نے بڑے دلچسپ انداز میں اس بات کا مشاہدہ کیا تھا کہ عیسائی ادارے میں پادریت بامعنی ہے کیوں کہ اس کے تحت ایک شخص نہ صرف یہ کہ لفظ خدا کی تعلیم دیتا ہے بلکہ وہ اس طرف بھی اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں یہ لفظ اترا یا نہیں اور وہ اپنی زندگی اس کے مطابق گزار رہے ہیں یا نہیں۔ اس لیے پادری ایک ایسا شخص ہے جو لوگوں کو ان کے راستے میں مدد کرتا ہے تاکہ وہ تھکیں نہیں بلکہ آخر کار اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ ظاہر ہے کہ وقت بہ وقت پادریوں کے درمیان کرایہ پر رکھے گئے ایسے افراد بھی آئے جنھوں نے ''بھیڑیے کو آتے ہوئے دیکھا اور بھیڑوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے [.....] کیوں کہ کرایہ پر رکھا گیا شخص بھیڑوں کی پروا نہیں کرتا'' (Jn 10:12-14)۔

میرے زیر اثر حلقے میں 97 مملکتیں ہیں اور مجھے لگاتار علاقائی فرقوں اور ان کے

پادریوں کے بارے میں اس قسم کی اطلاعات ملتی رہتی ہیں کہ کیا انھیں اندر سے کوئی خطرہ لاحق ہے یا پھر باہر سے، یا پھر اس قسم کی دیگر اطلاعات۔ اس لیے بشپ ایک گڈریے اور گارڈ کی طرح ہے، وہ ایک مجتہد ہے، یعنی جو نگرانی رکھتا ہے۔

انسانوں کی زبان پر فرمان خداوندی

شبستری :

پیامبر خضر نے جب عیسائی نظریہ کے مطابق تبلیغ کی بات کی تو انھوں نے کہا کہ ایک پادری خدا کے لفظ کا اعلان کرتا ہے۔ میں یہ تفصیل کے ساتھ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کا اصل مطلب کیا ہے۔

مقدس کتاب اور روایت کا سوال

خضر :

ہم تمام لوگ مارٹن لوتھر کے مشہور مقولہ ''سولا اسکرپچورا'' سے واقف ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ صرف انجیل (بائبل) میں ہی خدا کا لفظ مل سکتا ہے۔ جب کہ رومن کیتھولک چرچ میں اس حقیقت پر زور دیا جاتا ہے کہ ایمان کے دو ماخذ ہیں، یعنی مقدس کتاب اور روایت۔ مارٹن لوتھر سے قبل عیسائی کلیسا کے لوگوں کو سوال و جواب کے ذریعے علم حاصل کرنے کا طریقہ معلوم نہیں تھا : اس وقت لوگ مقدس کتاب کو پڑھا کرتے تھے اور عبادتوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ایمان کے معاملے میں ان کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے یہی ذرائع تھے۔

یہ روح ہے جو زندگی فراہم کرتی ہے

پروفیسر شبستری کے ذریعے پوچھے گئے سوال کے جواب میں میں اس حقیقت پر زور دینا چاہوں گا کہ ہمیں انجیل میں موجود خدا کے الفاظ اسی شکل میں ملتے ہیں جس طرح وہ کلیسا کے فادرس کی موافقت سے ہمیں دیے گئے ہیں۔ لیکن فادرس کی موافقت سے صحیح معنوں میں

مراد کیا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں یہ سوال بار بار دہرانا پڑے گا کہ کیا یہ موافقت صحیح معنوں میں پائی جاسکتی ہے اور یہ یا وہ کہنے میں انفرادی فادر صحیح ہے یا نہیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا کا یہ لفظ ہمیں کلیسا کی روایت کے ذریعے دیا گیا ہے۔ اس سے ہماری مراد کیا ہے؟ ایک بار میں نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ کلیسائی روایت سے مراد کچھ اور نہیں بلکہ مقدس روح کے تئیں فرمانبرداری ہے۔ اس طرح ہم آسان الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی روح سے مراد وہ شے ہے جو تمام صدیوں اور زمانہ کی تبدیلیوں کے دوران اسی سچائی کو تحریک دیتا ہے۔ اس لیے خدا کے لفظ کی کوئی طبیعیاتی تعریف نہیں ہے بلکہ روحانی تعریف ہے، ایک ایسی تعریف جو خدا کے لفظ کو روح کی روشنی میں سمجھتی ہے، جو زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ خود اپنے تئیں فرمانبردار رہتا ہے اور خدا کے لفظ کو فرد واحد اور فرقہ تک پہنچاتا ہے۔

خدا کے لفظ کو صرف اس کی اثر پذیری میں سمجھا جاسکتا ہے نہ کہ اس کی ذات میں

شبستری :

جیسا کہ میں دیکھتا ہوں، ہمیں خدا کے لفظ یا کلام اللہ کو عیسائیت اور اسلام میں الگ الگ طریقے سے سمجھنا ہوگا۔ جہاں تک انسانی لفظ کا سوال ہے تو ہم جانتے ہیں کہ یہ کیا ہے کیوں کہ ہم خود اپنی انسانیت کا تجربہ کر رہے ہیں کیوں کہ ہم ایک انسانی معاشرے میں رہتے ہیں اور ہمارے اندر اپنا تجربہ کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، اس طرح یہ ہماری اپنی دنیا ہے؛ اور جب دوسرے لوگ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو یہ ان کی دنیا ہوتی ہے جو یا تو دکھ دیتی ہے یا علاج کرتی ہے، جو ہمیں اوپر کرتی ہے یا نیچے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ لیکن خدا کے لفظ کی تعریف ہم کیسے کریں، اگر یہ انسان کے لفظ سے الگ کوئی چیز ہے؟ جیسا کہ کارل بارتھ کہا کرتے تھے کہ خدا پوری طرح سے دوسری چیز ہے، اس لیے اس کا لفظ بھی پوری طرح

سے الگ ہے۔ لیکن اگر کوئی لفظ پوری طرح سے الگ ہے تو ہم اسے سمجھ کیسے سکتے ہیں؟ اسلام کے ایک عظیم صوفی ابن عربی کا کہنا ہے کہ خدا کے لفظ کو اس کی اثر پذیری کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ اس لیے اس کی تعریف ہم اس کی ذات میں نہیں کر سکتے بلکہ اس کے اثر میں کر سکتے ہیں، کیوں کہ اس قسم کا اثر انسانی لفظ سے پیدا نہیں ہوتا۔ کیا عیسائیت میں تقابلی فہم وفراست ہے کہ خدا کے لفظ کو صرف اس کے خاص اثر، یعنی اس کے روحانی اثر سے پہچانا جاسکتا ہے؟

ہمیں دونوں مذاہب میں موجود اختلافات کا احترام کرنا چاہیے

طاہر محمود :

اس سے پہلے کہ پیامبر خضر، پروفیسر شبستری کے سوال کا جواب دیں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے ہمیں اس اجلاس کے اسپیشل عنوان سے، کلام اللہ کے بارے میں عیسائی یا مسلم نظریہ سے متعلق سوال اٹھا کر، میں یہ بھی کرا اپنی توجہ کو نہیں ہٹانا چاہیے۔

اس کے علاوہ میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صالحہ محمود بالکل صحیح کہہ رہی تھیں کہ عظیم عیسائی مذہبی روایات کی طرح اسلام میں کوئی Clergy (پادریوں جماعت) جیسی جماعت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ قرآن پاک یا نبی اکرمؐ نے اسلام کسی بھی راہبانہ حکمرانی کے نظام کی تخلیق کی بات نہیں کہی۔ اس لیے لفظ خاطب یا مبلغ (Preacher) اصلی اسلامی تعلیم میں جیسی اصطلاح کا کوئی تصور نہیں ہے۔ نبی اکرمؐ اپنی پوری زندگی یہی کہتے رہے کہ ''میں تمہاری طرح ہی ایک انسان ہوں۔ انما انا بشر مثلکم'' (سورۃ 18,110؛ 41,6)۔ انھوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ''میں ایک مبلغ ہوں'' یا ''میں مذہبی امور کی تعلیم دے رہا ہوں''، بلکہ یہ کہا کہ ''میں ایک انسان ہوں''۔ اس کے بعد اپنے بارے میں انھوں نے دوسری بات یہ کہی کہ ''میں علم کا شہر ہوں۔ میں تعلیم کا شہر ہوں۔ انا مدینة علم''۔ عیسائی مذہب کی طرح انھوں نے نہ تو کبھی پادری یا مبلغ کا رول ادا کرنے کی بات کہی ہے اور نہ ہی کسی راہبانہ حکمرانی کے نظام کی تخلیق کی۔

ہمیں ان اختلافات کو قبول کرنا ہوگا اور ان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ہنر سیکھنا ہوگا۔ میں خدا کی تعظیم کرتا ہوں اور خدا کی تعلیم کا احترام کرتا ہوں۔ ان دونوں مذاہب کی ہر ایک تعلیم یا ہر ایک خاصیت کا موازنہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم لوگ یہاں پر تعلیم کے بارے میں مذاکرہ کرنے اور دونوں مذاہب کی تعلیمات کے بارے میں اظہارِ خیال کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

تعلیم کے ذریعہ کے طور پر تبلیغ

خوری :

ہم لوگ تبلیغ کو تعلیم کے ایک ذریعہ کے طور پر بیان کر رہے ہیں۔ یہ سوال خود اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ: تبلیغ کے ذریعے ہم کس چیز کی تعلیم دے رہے ہیں؟ کسی نہ کسی طور پر ہم اپنے فرقہ کو اپنی روایات اور اپنے مذہب کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں۔

اس کے علاوہ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ : عیسائی ہونے کے ناطے ہم سے ہمارے پیغمبر کے پیغام اور ان کے طریقے کی کس حد تک پیروی کرنے کی امید کی جاتی ہے اور ٹھیک اسی طرح مسلمانوں سے حضرت محمدؐ کے پیغام اور ان کے طریقے کی پیروی کرنے کی امید کی جاتی ہے؟ اس کا جواب مختلف ہوسکتا ہے جس کا انحصار اس بات پر ہے کہ کیا یہاں پر نبی محمدؐ یا عیسیٰ کے بنیادی مذہبی فیصلے یا ارادے یہاں زیر بحث ہیں یا پھر ان کے اصلی تاریخی پس منظر میں کوئی ٹھوس سماجی و سیاسی پیچیدگی ہے۔ بالفاظ دیگر : کیا ہماری تعلیم میں بعض مخصوص روایت کا بنیادی مقصد خطرے میں ہے یا پھر ہم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم اس تاریخی حل کی طرف رجوع کریں جو کسی زمانہ میں سماجی و سیاسی ماحول کے جواب میں اس وقت پائے جاتے تھے؟

ہمیں خدا کے پیغام کو انسانوں تک صحیح ڈھنگ سے پہچانا ہوگا

خضر :

چاہے اس شخص کی صلاحیت کی بدولت، جو اپنی قوم کو خطاب کرتا ہے، اسے 'پادری' یا مبلغ

کہا جاتا ہے، عیسائیت اور اسلام میں کم از کم کوئی نہ کوئی شخص تو ایسا ضرور ہوتا ہے جو لوگوں کو خدا کے لفظ کا معنی بتاتا ہے اور اس کی وضاحت کرتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو ہم اسے کوئی تکنیکی معنی فراہم نہیں کرنا چاہتے۔ یہ ایک اچھی عیسائی روایت ہے، میں خاص طور پر اصلاح یا Reformation کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوں۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ آج کل چھٹی صدی کے ابتدائی ایام میں رائج 'سوڈوڈائنی سیس' جیسی کوئی کلیسائی حکومت نہیں ہے۔ مقدس میز کے اردگرد ہم عیسائی ایک حکومت ہیں۔ میرے بہترین کیتھولک دوست، جیسے کارڈینل یوئیس کونگر نے کہا کہ : ہم مخروطی کلیسا نہیں ہیں۔ لہٰذا مقدس انجیل کے اردگرد عبادت کے پہلے دور میں فرقہ کا یہی اتحاد اور دوسرے دور میں مقدس عشائے ربانی ہے جسے ہم عیسائی حکومت کہتے ہیں۔ یونانی لفظ 'ہیرارکی' کا یہی مطلب ہے کہ (عبادت کے پہلے مرحلے میں) آپ مقدس کتاب اور (دوسرے مرحلے میں) روٹی اور جام کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔

اگر میرے ذریعے کی گئی اسلام کی ترجمانی درست ہے تو ہم دونوں کے درمیان بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ میرے خیال سے ہم اسی گروپ کی باتیں کر رہے ہیں یا پھر اسی قسم کے دوسرے گروپ کی جو کہ کلام اللہ کی فطرت رکھتا ہے۔ کیوں کہ ایک سچا عیسائی سب سے پہلے یہی کہے گا کہ 'جیسس' یا 'کرائسٹ' ہی خدائی لفظ ہے۔ اصلی عیسائی عقیدہ یہی کہتا ہے کہ وہ بذات خود خدائی لفظ، یعنی کلام اللہ ہے۔

اگر میرے مسلم دوست یہ سمجھتے ہیں کہ دعوت اور تبلیغ کا ذکر کرتے وقت میں اسلام کے تئیں ایماندار تھا تو مجھے کافی خوشی ہوگی۔

طاہر محمود :

اسلام کی ان تعلیمات کی تعبیر کرتے وقت آپ کئی مسلمانوں سے زیادہ ایماندار رہے ہیں۔

تعلیم اور ذکور و اناث

عائشہ بیلا ربی

بین الاقوامی پیمانے پر آج کل عالمی گاؤں (Global Village) کے بارے میں بات کرنا ایک عام فیشن سا بن گیا ہے۔ اس اصطلاح کا استعمال عام طور پر ان رابطوں، تعلقات اور آپسی لین دین کے بارے میں کیا جاتا ہے جو پوری دنیا میں اطلاعاتی ٹیکنالوجی اور ترسیل کے ذریعے قائم ہوئے ہیں۔ مختلف افراد کو درپیش ایک جیسے معاملات، اور ان معاملات کو قومی، علاقائی یا بین الاقوامی سطح پر حل کرنے کی خواہش ایک دوسرے کو سمجھنے، افراد اور گروہوں کے درمیان ترسیل کو بحال کر کے ایک دوسرے کو برقرار رکھنے کی نئی ضرورت کو ظاہر کرتی ہے۔

لیکن اگر 'عالمی گاؤں' سے مراد مجموعی ذمہ داری ہے تو عملی طور پر دنیا کی اقتصادیات کے عالمی نظام میں متحد ہونے، تعلیم کی ہم نوعیت، عالمی پیمانے پر باہمی ربط و ضبط کا وسیع نفاذ اور ہماری دنیا کو پھر سے بہتر انداز میں تعمیر کرنے والے آلات کی تحقیق کو بیان کرتا ہے۔

بہر حال، اس عالمی گاؤں کی خصوصیت شمال اور جنوب، مختلف طبقات، ذات اور نسلی گروہ، مرد و عورت اور ان لوگوں کے درمیان گہرا ساختیاتی عدم توازن ہے جو طبقہ امرا سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا حکومت سازی میں عمل دخل ہے۔ یہ ایسے مقام کی مانند ہے جہاں جمہوری اصولوں اور ضوابط کو ذرائع، اطلاعات اور تعلیمی نابرابری کے ذریعے محدود کر دیا جاتا ہے۔

''تعلیم کا مطلب خود مختار بنانا ہے۔ یہ جمہوریت کو قائم کرنے، ایسی ترقی کو یقینی بنانے کے لیے جو کہ دائمی اور انسانیت پر مبنی ہے اور باہمی عزت و احترام اور سماجی انصاف کی بنیاد پر امن قائم کرنے کی کنجی ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں تخلیقیت اور علم بہت بڑا رول ادا کرتے ہیں، تعلیم حاصل کرنے کا حق، جدید دنیا کی زندگی میں حصہ لینے کے حق سے کسی بھی درجہ کم نہیں ہے'' : تا کہ اس نئے عالمی گاؤں میں حصہ لیا جا سکے اور اس کا حصہ بنا جا سکے۔

اس حق کا تعلق مرد و عورت دونوں سے ہے؛ یہ ایک بنیادی حق ہے جسے بہت سے بین الاقوامی کنونشن اور معاہدوں نے اجاگر کیا ہے۔ بہت سی ریاستوں نے اسے نافذ کیا ہے یا پھر اس پر غور و فکر کر رہی ہیں۔ کوئی بھی ملک اس وقت تک خوش حال، جمہوریت پسند اور قانون کا رکھوالا نہیں بن سکتا جب تک وہاں کی عورتیں ناخواندگی، غربت اور اجارہ داری پر مبنی حکومت کے زیر سایہ زندگی گزارتی ہوں۔

اس کے علاوہ میں وسیر وٹا تین اور چار کے درمیان ایک قریبی رشتہ قائم کرنا چاہتی ہوں۔ غربت، اس کے بنیادی اسباب اور اسے کم کرنے کے طریقوں پر لمبی بحث کرنے کے بعد ہم اب بھی غربت کے سب سے بڑے سبب، یعنی تعلیم کی کمی پر بحث کر رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرد کی خوش حالی، معاشرے کی اقتصادی اور سماجی حالت کو بہتر بنانے، جمہوریت کو قائم کرنے اور حقوق انسانی کے تحفظ میں تعلیم ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

غربت کی کئی شکلیں ہیں جو کہ کم آمدنی سے بھی کہیں بڑی چیز ہے۔ یہ خراب صحت اور تعلیم، علم اور ترسیل تک نارسائی، انسانی اور سیاسی حقوق کے عدم استعمال اور خود اعتمادی اور ذاتی عزت و احترام کی کمی کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

''جب غربت کسی خاندان کو اپنے گھیرے میں لیتی ہے تو اس کا سب سے زیادہ اثر سب سے کم عمر کے بچوں پر پڑتا ہے، زندہ رہنے، فلاح و بہبود اور ترقی کرنے کے ان کے حقوق کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ آج کی ترقی پذیر دنیا میں پیدا ہونے والے بچہ کو نہایت غریب ہونے کی بدولت جینے کے 10 میں سے 4 مواقع حاصل ہوتے ہے۔''

'ایجوکیشن فار آل' (EFA)، یعنی سب کے لیے تعلیم اور خاص کر لڑکیوں کے لیے تعلیم مہیا کرنا نہایت ضروری ہے جو کہ غربت اور عدم ترقی کی سب سے بنیادی وجہ ہے۔ اس طرح کے بہت سے ثبوت ہیں جو لڑکیوں کی تعلیم کی سطح اور اقتصادیات، جمہوریت، صحت اور معاشرہ کی خوش حالی کے درمیان واضح طور پر رابطے کو ظاہر کرتے ہیں۔

اس مقالے میں دو نظریات، یعنی تعلیم اور جنس کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک کشادہ مطمح نظر کو اپناتے ہوئے ہم اس کو بیان کرنے اور کچھ تعریفیں پیش کرنے کی کوشش کریں گے جو ان سے متعلق ہمارے نظریات کو واضح کرتے ہیں۔

تعلیم :

تعلیم کا مطلب ہے ''کوئی بھی عمل، چاہے وہ رسمی ہو یا غیر رسمی، جو پختہ ہو رہے عضویہ کی استعداد کی تشکیل کرتا ہے۔ غیر رسمی تعلیم ماحولیات کے مسلسل اثر کے نتیجے میں ظاہر ہوتی ہے اور اقدار اور عادات کی تشکیل میں لگنے والی اس کی طاقت کو زیادہ بڑھاوا نہیں دیا جا سکتا۔ رسمی تعلیم انسانی معاشرے کی وہ باشعور کوشش ہے جس کے تحت ذہن کی صلاحیت میں اضافہ کیا جاتا ہے اور سوچنے کے وہ طریقے بتائے جاتے ہیں جو کہ سماج کے لیے ضروری ہیں، یعنی حاکموں کا گروہ جو پرتکبر طریقے کے بارے میں بتاتا ہے جب کہ جمہوری نظام سوچ کی آزادی کی وکالت کر سکتا ہے۔''

ایک قدیم نظریہ جس کی بنیاد سقراط نے ڈالی تھی کہ ٹھیک طور سے تربیت حاصل کرنے والا ذہن خوبی سے بھرا ہوگا۔ اس نظریہ کی تردید کبھی نہیں کی گئی، حالانکہ بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ، انسانی خوش حالی، دولت اور سرمایہ کے ذریعے صداقت کی کھوج سے متعلق مختلف اصولوں نے تعلیمی پالیسیوں، تعلیمی مواد اور تکنیکوں کو متاثر ضرور کیا ہے۔

تعلیم کو علم حاصل کرنے کے طریقے کے طور پر عام طور پر قبول کیا جاتا ہے کیوں کہ علم پیداوار کا ایک بنیادی جز اور پیداوار اور انسانی سرمایہ کو متعین کرنے والا سب سے بڑا آلہ تصور کیا جاتا ہے۔ ''ایک محدود علم، خاص طور پر اگر وہ کمزور یا غیر مروج علم سے منسلک ہو تو اس سے ملک میں بہت کم پیداوار سامنے آتی ہے اور اس ملک کی ترقی بھی کمزور ہوتی ہے۔''

پھر بھی، تعلیم ایک گہرا نظریہ ہے۔ یہ صرف تعلیم و تعلم کے عمل تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس سے ہٹ کر وہ سقراط کے نظریہ پر بھی زور دیتا ہے، یا بالفاظ دیگر وہ اس بات پر زور دیتا ہے

کہ کسی شخص کی مدد کر کے اسے کیسے سامنے لایا جائے تاکہ وہ مخفی خیالات یا یادداشتوں کے بارے میں جان سکے۔ اس لیے تدریس صرف علم کی منتقلی نہیں ہے بلکہ علم حاصل کرنے والے کو اس لائق بھی بنانا ہے تاکہ وہ خود اپنی صلاحیتوں کا پتہ لگا سکے، اپنے مخفی ذرائع کو جان سکے، تاکہ وہ خود مختار بن سکے اور خود اپنے لیے ذمہ دار بن سکے۔

خلیل جبران نے بھی اپنی کتاب 'دی پرافیٹ' میں تعلیم کے بارے میں کہا ہے کہ

''وہ استاد جو اپنے پیروکاروں کے ساتھ مقدس مقام پر بیٹھتا ہے، وہ انھیں صرف اپنا عالم ہی نہیں دیتا ہے بلکہ اپنا ایمان اور پیار و محبت کا جذبہ بھی انھیں عطا کرتا ہے۔ اگر وہ عاقل و دانا ہے تو وہ آپ کو عقل و شعور (علم) کے گھر میں آپ کو یوں ہی گھسنے نہیں دے گا بلکہ خود آپ کے ذہن تک آپ کی رہنمائی کرے گا۔ ماہر نجوم آپ کو خلا کے بارے میں اپنی سمجھ بوجھ آپ کو بتا سکتا ہے لیکن یہ علم وہ آپ کو نہیں دے سکتا۔ موسیقار آپ کو وہ تمام نغمے سنا سکتا ہے جو کہ تمام مقامات میں موجود ہیں لیکن وہ آپ کو ایسا کان نہیں دے سکتا جو مقامات میں موجود موسیقی کو اپنی گرفت میں لے سکیں اور نہ ہی وہ آپ کو وہ آواز دے سکتا ہے جس سے اس کی بازگشت ہوتی ہے۔

جنس کی تعریف :

حالانکہ بہت سی تحریروں میں لفظ 'سیکس' اور 'جنس' ہم معنی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں لیکن بعض قلم کاروں نے ان دونوں کے درمیان موجود فرق کو بیان کیا ہے۔ اپنی 1992 کی رپورٹ میں ''امیریکن ایسوسی ایشن آف یونیورسٹی ویمن ایجوکیشنل فاؤنڈیشن'' نے 'سیکس' لفظ کا استعمال حیاتیاتی طور پر عورت یا مرد کو مخاطب کرنے کے لیے کیا، جب کہ اس نے 'جنس' لفظ کا استعمال سماج کے ذریعے لڑکیوں یا لڑکوں سے عورت یا مرد ہونے کے ناطے کی جانے والی امیدوں کی طرف مخاطب کرنے کے لیے کیا۔ 'سیکس' وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے کوئی فرد پیدا ہوا جب کہ 'جنس' افراد کے ذریعے 'سیکس' کے صحیح برتاؤ کو سیکھنا ہے۔

''آکسفورڈ ایڈوانسڈ لرنرز ڈکشنری'' (1995) میں 'جنس' کی تعریف مرد یا عورت ہونے کی شرائط کے طور پر کی گئی ہے۔

لفظ 'جنس' کو اس طریقے سے بھی سمجھا جاسکتا ہے جس کے ذریعے عورت اور مرد کی سماجی طور پر تخلیق پیدائش سے لے کر پوری زندگی تک خاندان کے ادارے، اسکول، میڈیا، سول سوسائٹی، سیاسی اور مذہبی ادارے اور ریاستوں کے ذریعے ہوئی ہے جو عورت اور مرد کے امتیازات کو قبول کرتی ہے۔

نہ تو عورت اور نہ ہی مرد ہم جنس گروہ ہیں؛ ہر انفرادی جنس طبقہ، نسل، مذہبی عقیدہ، عمر اور موجودہ خاندانی رول سے متاثر ہوتی ہے۔

ایک کلچر سے دوسرے کلچر میں جنس کی نوعیت بدل جاتی ہے، وقت کے ساتھ بھی اس میں تبدیلی آتی ہے۔ ہمیں یہ قبول کرنا ہوگا کہ کلچر کوئی جامد شے نہیں ہے؛ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی بعض مخصوص روایتوں کو سنبھال کر رکھتے ہیں اور نئی روایات کی دریافت کرتے ہیں۔

1. اقتصادی اور سماجی ترقی پر عورتوں کی تعلیم سے کیا اثر پڑتا ہے؟

لڑکیوں کی تعلیم سے اقتصادی ترقی، بازپیدائشی صحت، بچے اور خاندان کی خوش حالی اور سماجی تبدیلیوں پر مثبت اثر پڑتا ہے۔

جمہوری عمل میں بھی تعلیم ایک اہم رول ادا کرتا ہے کیوں کہ اس سے عورت و مرد کو یکساں مواقع فراہم ہوتے ہیں، علم حاصل ہوتا ہے اور سماج کی فطرت اور سمت کو متعین کرنے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ تعلیم کے بغیر کوئی بھی فرد اپنی صلاحیتوں کا پورا استعمال نہیں کرسکتا اور نہ ہی وہ شہری ہونے کے ناطے وہ ترقیاتی کاموں میں پوری طرح حصہ لے سکتا ہے۔

لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم پر زیادہ پیسہ صرف کرنے کا جو نتیجہ سامنے آیا ہے وہ یہ کہ گھریلو

زندگی اور کام کاج میں زبردست تبدیلی آئی ہے۔ ان میں سے بعض تبدیلیوں کو معاشرہ کافی اہمیت دے رہا ہے۔ مثال کے طور پر، بچوں کی پرورش میں آنے والے سدھار کو ماں کی زیادہ تعلیمی لیاقت سے جوڑ کر دیکھا جارہا ہے نہ کہ باپ کی۔ اس طرح کا معاملہ بچوں کی شرح پیدائش، شرح اموات، غذائیت، بیماری، اسکول میں کم عمری میں داخلہ اور اسکول میں زیادہ دنوں تک رہنے وغیرہ کے شعبوں میں دیکھا جارہا ہے۔

عورتوں کی تعلیم سے دوسری اچھی چیز یہ سامنے آرہی ہے کہ ان کے اندر اب بچوں کو پیدا کرنے کی صلاحیت میں کمی آرہی ہے۔ بعض معاشروں میں، خاص کر افریقہ میں، اسکول کے ابتدائی ایام بچوں کو پیدا کرنے کی صلاحیت پر کم اثر ڈالتے ہیں لیکن بعض جگہوں پر تعلیم کو بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت میں آنے والی کمی کے طور پر دیکھا جارہا ہے، اس کی وجہ سے ہر بڑھتے ہوئے سال میں اس میں مزید کمی آتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض ایسے بھی ثبوت ملے ہیں جن کے مطابق ہر بڑھتے ہوئے تعلیمی سال کے ساتھ ساتھ مردوں کی بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہورہا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں عورتوں اور لڑکیوں کو نشانہ بنانا خاصا اہم ہوجاتا ہے۔

بچے پیدا کرنے کی صلاحیت میں کمی کو اقتصادی اور سماجی مفاد کے نظر سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس سے انحصار کا بوجھ کم ہوتا ہے، جس کی وجہ سے قومی بچت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے آبادی کے تناسب کے حساب سے مزدوری کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو روزگار کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں، نتیجتاً فی کس آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اقتصادی ترقی پر ہونے والا اثر قابل غور ہوسکتا ہے، مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیائی ممالک سے آنے والی رپورٹوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بچے پیدا کرنے کی صلاحیت میں ہونے والی کمی کی وجہ سے ان ممالک میں فی کس آمدنی میں 2 فیصد سالانہ کا اضافہ ہوا ہے۔ ان ممالک میں عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے ہی اس قسم کی اقتصادی ترقی دیکھنے کو مل رہی ہے۔

تعلیم ایچ آئی وی/ایڈز سے بھی بچنے کا طریقہ ہے۔ پوری دنیا اور خاص کر افریقہ میں ایچ آئی وی/ایڈز کے تیزی سے بڑھنے کی وجہ سے اس کا برا اثر سب سے زیادہ لڑکیوں اور عورتوں پر ہی پڑا ہے۔ اس قسم کے بھی ثبوت ملے ہیں کہ نوجوان لڑکیاں اسکولوں سے اپنا نام اس لیے کٹوا لیتی ہیں تا کہ وہ اپنے بیمار والدین یا بھائی بہن کی دیکھ بھال کر سکیں۔ لڑکیوں کو بازار جانا پڑتا ہے، گھر کے کام کاج کرنے ہوتے ہیں اور اپنے اہل خانہ کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے انھیں جان لیوا وائرس سے خود کو بھی محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ 'سیکس' کے بارے میں افریقہ میں جس قسم کی بداعتقادیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ کافی اہم ہو جاتا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم تک رسائی ہو اور اپنے 'سیکس' کے بارے میں اچھی طرح جان سکیں، ساتھ ہی ایچ آئی وی/ایڈز اور 'سیکس' کے ذریعے پھیلنے والے دیگر وائرس کے بارے میں انھیں بنیادی تعلیم حاصل ہو۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عورتوں کی تعلیم کے درج ذیل فوائد ہیں :

- عورتوں کی خودمختاری اور جنسی برابری اور سماجی تبدیلی میں تعلیم ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔
- عورتوں کی تعلیم میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا ہے ویسے ویسے بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت، آبادی میں اضافہ اور شیر خوار بچوں کی موت میں کمی آتی ہے اور خاندان کی صحت میں بہتری آتی ہے۔
- لڑکیوں کی ثانوی درجے کی تعلیم میں اضافہ کا مطلب ہے محنت و مزدوری، گھریلو کام کاج، قومی آمدنی میں عورتوں کی شرکت میں اضافہ۔
- عورتوں کی کمانے کی صلاحیت میں اضافہ کی وجہ سے بچوں کی غذائیت پر بھی اس کا مثبت اثر پڑتا ہے۔
- تعلیم یافتہ ماؤں کے بچے، خاص کر بیٹیوں کا اسکول میں داخلہ یقینی ہو جاتا ہے

اور ان کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی امید بھی بڑھ جاتی ہے۔

- تعلیم یافتہ عورتیں سیاسی طور پر زیادہ سرگرم ہوتی ہیں اور انھیں اپنے قانونی حقوق اور ان کے استعمال کے بارے میں پورا علم ہوتا ہے۔

یہ تمام بالواسطہ اور بلاواسطہ فائدے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی مردوں کی بہ نسبت عورتوں کی اسکول تک رسائی کم ہوتی ہے، وہاں کا معاشرہ زوال پذیر ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں ایسے تعلیمی منصوبے تیار کرنے کی ضرورت ہے جس سے لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان تعلیمی میدان میں حائل خلیج کو پر کیا جا سکے اور عورتوں کی تعلیم کا بہتر سے بہتر انتظام کیا جا سکے۔

2. عالمی پیمانے پر عورتوں کی تعلیم

تاریخی طور پر عورتوں کو اسکول، خواندگی اور دیگر تعلیمی مواقع سے دور رکھا گیا ہے۔ سماجی، ثقافتی، اقتصادی اور حیاتیاتی اسباب کی بنا پر بہت سی خواتین کو بااثر طور پر بنیادی انسانی حق، یعنی تعلیم سے دور رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے جنسی خلیج پیدا ہوئی جو ایسے دور میں بھی موجود رہی جب اسکولوں میں داخلے کی شرح اور خواندگی اور تعلیم بالغاں میں اضافہ ہوا۔

موجودہ دور میں دنیا نے لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ اور عورتوں کی ناخواندگی کو کم کرنے کے لیے بہت سے اقدامات اٹھائے ہیں۔ بہت سے ممالک نے اور خاص کر شمالی ممالک نے اسکولوں میں سب کی یکساں طور پر رسائی کو ممکن بنایا ہے، خواتین کی ناخواندگی کی شرح کو تقریباً پوری طرح ختم کر دیا ہے اور تعلیمی نصاب اور نصابی کتابوں میں عورتوں کے متعلق موجود غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے اصلاحات کیے ہیں۔

بہت سے ممالک میں اور خاص کر جنوبی ممالک میں موجودہ دور میں بھی رائج تعلیمی نابرابری خواتین اور لڑکیوں کے حقوق حاصل کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے، سماجی اور اقتصادی ترقی کی راہ میں بھی یہ ایک بہت بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

- پوری دنیا میں 840 ملین لوگ آج بھی پوری طرح اپنی بھوک نہیں مٹا پاتے جب کہ 880 ملین نوجوان ناخواندہ ہیں۔ ان تمام لوگوں کی حالت ایک ہی جیسی ہے، خاص کر جنوبی ممالک میں۔ ناخواندہ افراد کی تعداد میں اگر ہم 130 ملین غیر اسکولی بچوں کو بھی شامل کرلیں تو دنیا کے ناخواندہ افراد کی یہ تعداد بڑھ کر ایک بلین ہو جاتی ہے۔
- دنیا کے ہر چھ بالغوں میں سے ایک ناخواندہ ہے، ان میں سے دو تہائی تعداد عورتوں کی ہے۔
- سب سہارا افریقہ میں افسوس ناک طور پر اسکولوں میں داخلے کی شرح 57 فیصد ہے جب کہ جنوبی ایشیا میں یہ شرح 84 فیصد ہے۔
- سب سہارا افریقہ، جنوبی ایشیا اور مغربی ایشیا کے غیر اسکولی بچوں کی تعداد کو اگر جوڑ لیا جائے تو یہ تعداد پوری دنیا کے ناخواندہ بچوں کی کل تعداد کی تین چوتھائی ہے۔
- اسکول میں ایک بار داخلہ لے لینے کے بعد افریقہ کے تین بچوں میں سے صرف ایک ہی کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ پرائمری اسکول کی تعلیم کو مکمل کر پائے گا، وہاں پر لڑکیوں کی حالت اور بھی بدتر ہے۔
- عرب ممالک میں 15 سے 24 سال کی 8.5 ملین خواتین کبھی بھی اسکول کا منہ نہیں دیکھتیں جب کہ اسکولوں میں داخلہ نہ لینے والے مردوں کی یہ تعداد 4.5 ملین ہے (یونیسکو 2003)۔
- ان ماؤں کے مقابلے جنھوں نے ثانوی یا اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کر رکھی ہے، غیر تعلیم یافتہ ماؤں کے بچوں کی کم غذائیت یا مرنے کی امید دوگنی ہو جاتی ہے۔
- پوری طرح سے ان ترقی پذیر ممالک میں جن کی آبادی 20 ملین ہے اور

جہاں پر شرح اموات پانچ سال تک کے 1000 بچوں میں سے 150 ہے، اگر وہاں پر لڑکیوں کو تعلیم کے لیے ایک سال اور مل جائے تو اس سے 60 ہزار بچے مرنے سے بچ جائیں گے۔

- بہت سے کم تر ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم میں بچوں اور نوجوانوں کی شرکت بہت ہی کم ہے۔ 1995 سے 1999 کے دوران سیرالیون میں پرائمری اسکول میں مجموعی داخلہ شرح خواتین کے لیے 41 تھی جب کہ مردوں کے لیے 59 تھی۔ انگولا میں یہ شرح خواتین کے لیے 88 اور مردوں کے لیے 95 تھی جب کہ نائیجر میں یہ شرح خواتین کے لیے 22 اور مردوں کے لیے 36 تھی (یونیسیف 2001)۔
- سکنڈری اسکول کی سطح پر یہ اعداد و شمار اور بھی چونکا دینے والے ہیں۔ سیرالیون میں اس سطح پر مجموعی داخلہ شرح خواتین کے لیے 13 اور مردوں کے لیے 22 تھی جب کہ نائیجر میں یہ شرح خواتین کے لیے 5 اور مردوں کے لیے 9 تھی۔ ایتھوپیا میں 1995 سے 1997 کے دوران سیکنڈری اسکول کی سطح پر یہ شرح خواتین کے لیے 10 اور مردوں کے لیے 14 تھی۔

حقوق انسانی کی خلاف ورزی کے طور پر عورتوں کی ناخواندگی :

سب سے کم ترقی یافتہ ممالک میں عورتوں کی شرح خواندگی 44.6 فیصد سے 53.1 فیصد کے درمیان ہے، عرب ممالک میں یہ شرح 53.1 فیصد، جنوبی ایشیا میں 46.6 فیصد، افریقہ میں 52.6 ہے جب کہ مشرقی ایشیا اور پیسیفک، لاطینی امریکہ اور نیوزی لینڈ میں یہ شرح 88 فیصد تک پہنچ چکی ہے۔

1995-1999 کے دوران سیرالیون میں عورتوں کی شرح خواندگی 18% تھی جب کہ

مردوں کی شرح خواندگی 45% تھی، انگولا میں عورتوں کی یہ شرح 29% اور مردوں کی 56% اور ناجیریا میں عورتوں کی شرح خواندگی 7% تھی جب کہ مردوں کی 21% (یونیسیف 2001)۔اس قسم کے اشاروں سے تعلیم اور ترقی میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں ناخواندگی کی شرح اب بھی بہت زیادہ ہے جہاں پر 42% عورتیں ناخواندہ ہیں، عراق میں 77%، یمن میں 75%، مراقش میں 64%، مصر میں 56%، الجیریا میں 43%، شام میں 40%، تیونس میں 39% عورتیں ناخواندہ ہیں۔ لبنان میں 20% عورتیں ناخواندہ ہیں جب کہ فلسطین اور عمان میں 16% عورتیں ناخواندہ ہیں۔ خلیجی ممالک میں یہ شرح ناخواندگی 17% سے 20% کے درمیان ہے۔ سعودی عرب میں 33% خواتین ناخواندہ ہیں۔

3. لڑکیوں کے اسکول نہ جانے کے اسباب

ان اسباب کا قریب سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ جنسی بنیاد پر تعلیمی نابرابری کی وجوہات عام طور پر تین درجے میں آتی ہیں :

3.1 سماجی واقتصادی عدم مساوات :

لڑکیوں کو ان کے تعلیمی حق کا استعمال نہ کرنے دینے میں سب سے بڑی رکاوٹ غریبی ہے۔ ہم کو اسکول جانے میں لگنے والی لاگت پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ اسکول کی فیس، اسکول جانے میں لگنے والے گاڑی کے کرایے، لباس اور کتابوں پر ہونے والے خرچ اس جنسی خلیج کو مزید بڑھاتے ہیں۔ وہ خاندان جو اپنے تمام بچوں کو تعلیم فراہم نہیں کر سکتے، وہاں پر لڑکیوں کو ہی گھر پر رکنا پڑتا ہے اور گھریلو کام کاج میں ہاتھ بٹانا پڑتا ہے۔ بہت سے ترقی پذیر معاشرے میں اب بھی والدین کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ لڑکیاں گھروں پر کام کریں اور گھریلوں کام میں ماں کی مدد کریں۔ اس سے ان لڑکیوں کو، جو اسکول جاتی ہیں، گھر پر اسکول کا کام کرنے کا بہت کم وقت ملتا ہے۔

بڑھتی ہوئی کھلی عالمی اقتصادیات میں، وہ ممالک جن کے یہاں شرح ناخواندگی بہت زیادہ ہے اور تعلیمی میدان میں جنسی تفریق بھی بہت ہے، ایسے ممالک کم مقابلے کے ہوتے ہیں کیوں کہ غیر ملکی سرمایہ داروں کو ایسے مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے جو ماہر اور تجربہ کار ہوں۔ دنیا کی بدلتی ہوئی صورت حال ان عورتوں کے لیے خاص چیلنج پیدا کر رہی ہے جو یا تو ناخواندہ ہیں یا کم تعلیم یافتہ ہیں۔ اقتصادیات کی برآمدات اور چھوٹی اور اوسط درجے کی سرمایہ کاری کی بڑھتی ہوئی اہمیت کی وجہ سے عورتوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا ہو رہے ہیں لیکن ان مواقع کا پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لیے ان عورتوں کا مناسب تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے۔

3.2 سماجی وثقافتی عقیدے ورسوم :

بہت سے معاشروں میں اور خاص کر غریب ممالک میں لڑکیوں کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے وہ اپنے شوہر کی خدمت کریں گی اور ماں کے کام انجام دیں گی، اسی لیے ان لڑکیوں کی زندگی کا خاص مقصد صرف شادی کرنا ہی رہ جاتا ہے۔ اس لیے انھیں کئی برسوں تک اسکول میں پڑھانے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ بہت سے دیہاتی طبقے اپنی لڑکیوں کو خاندان کی آمدنی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ زیادہ تر معاشرے خاموشی کے ساتھ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ''لڑکیوں کو تعلیم دینے کا مطلب ہے دوسرے آدمی کے باغ کی آبیاری کرنا'' لڑکی کو اپنی ہی فیملی میں مہمان سمجھا جاتا ہے۔

سماجی نظام لڑکیوں کی اس طرف رہنمائی کرتا ہے کہ وہ شادی کو اپنی زندگی کے سب سے اہم مقصد کی طرح دیکھیں اور اگر انھیں اچھا شوہر مل جاتا ہے، جو کہ ان کی اچھی دیکھ بھال کر سکے، تو انھیں کسی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ جو لڑکیاں اسکول جاتی ہیں، ان کی شادی پرائمری اسکول کے دوران یا پھر سیکنڈری اسکول کے ابتدائی ایام میں ہی کر دی جاتی ہے اور وہ جلد ہی حاملہ بھی ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے زیادہ تر لڑکیاں بہت جلد اسکول جانا چھوڑ دیتی ہیں۔ عام

طور پر، نوجوانوں کو بچوں کی پیدائش سے متعلق غلط جانکاریاں ہوتی ہیں اور لڑکیوں کے لیے یہ بات شرم کا باعث مانی جاتی ہے کہ وہ دستیاب طبی خدمات حاصل کرے، یہ تمام چیزیں نوجوانوں کے مفاد میں نہیں ہیں۔

بہت سے ایسے خاندان بھی موجود ہیں جنھیں تعلیم سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا ہے، خاص طور پر ان کے درمیان ایسے بچے بھی موجود ہیں جو یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی کوئی نوکری حاصل نہیں کر سکے، اسی لیے بہت سے والدین بچوں اور خاص کر لڑکیوں کو تعلیم دلانے کی اہمیت سے انکار کرتے ہیں۔

3.3 اسکول کا ماحول :

بہت سے معاملوں میں اسکول کا ماحول تعلیم کے موافق نہیں ہوتا، خاص کر لڑکیوں کے لیے۔ اس بات کے بھی ثبوت ملے ہیں کہ لڑکیوں کی ایک بڑی اکثریت ایام ماہواری میں اسکول جانا اس لیے بند کر دیتی ہے کیوں کہ اسکولوں میں ان کے لیے علاحدہ بیت الخلا کا انتظام نہیں ہوتا۔ جن اسکولوں میں اس طرح کا انتظام ہے ان میں یا تو دروازے نہیں لگے ہوتے یا پھر ان میں پانی کا انتظام نہیں ہوتا۔

لڑکیوں کے اسکول جانے میں ان کی حفاظت اور سیکورٹی ان کے تعلیم حاصل کرنے میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد گھر سے اسکول جاتے ہوئے اور اسکول سے گھر آتے ہوئے، راستے میں خود کو محفوظ نہیں سمجھتی۔ اپنے والدین کے ساتھ ساتھ ان لڑکیوں کو بھی عصمت دری، اغوا کیے جانے اور بعض معاملات میں جانوروں کے ذریعے حملہ کیے جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ جنگ علاقوں میں لڑائیاں چل رہی ہیں، وہاں پر بہت سے اسکول بند کیے جا چکے ہیں۔ لڑکیوں کے لیے اسکول کے اندر اور اسکول سے باہر حفاظت کا انتظام نہایت ضروری ہے۔

تعلیمی میدان میں جنسی جانبداری کو بہت سے ممالک میں بڑھاوا دیا جاتا ہے۔ اسکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں سے الگ الگ برتاؤ کیا جاتا ہے۔ جنس پر مبنی یہ امتیاز طلبا کے

ساتھ اساتذہ کے برتاؤ، موضوعات اور عنوانات سے متعلق ہوتا ہے، طلبا کو اس طرح کے موضوعات منتخب کرنے پر آمادہ کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ کتابوں میں بھی جنسی امتیاز کا سبق ہوتا ہے جس کے تحت ان طلبا کو معاشرے میں موجود ان امتیازات کے بارے میں تفصیلی جانکاری دی جاتی ہے۔ معاشرے میں بھی جنس پر مبنی فرق پر زور دیا جاتا ہے جس سے دو علاحدہ اقدار ابھر کر سامنے آتے ہیں جو لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے علاحدہ ہوتے ہیں، اس کی بنا پر دونوں جنس کو ایک دوسرے سے گفتگو کرنے اور ایک دوسرے کو قبول کرنے پر سخت پابندی عائد کی جاتی جس کی وجہ سے معاشرے میں کوئی سماجی تبدیلی رونما نہیں ہو پاتی۔

اسکولی لڑکیوں کو کئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے وہ کم عمری میں ہی اسکول چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ میں ان میں سے ان چار اہم رکاوٹوں پر توجہ مبذول کرانا چاہتی ہوں جو لڑکیوں اور خواتین کی راہ میں حائل ہیں۔

4.1 جنسی استحصال اور جنسی تشدد :

پوری دنیا کے مختلف اسکولوں میں جنسی استحصال پایا جاتا ہے۔ اسکولوں میں شاگردوں کو جنسی استحصال اور تشدد کا شکار بننا پڑ رہا ہے۔ اسکولی ماحول میں لڑکیوں کو بڑے پیمانے پر زبانی طور پر جنسی استحصال کا شکار بنایا جاتا ہے۔ جنسی استحصال اور جنسی تشدد کا یہ سلسلہ اپنے ساتھیوں، اساتذہ اور اسکول کے دیگر ملازموں کے ذریعے روا رکھا جاتا ہے۔

جنوبی افریقہ کے اسکولی نظام کے اندر رائج جنسی استحصال اور جنسی تشدد کا مطالعہ کرنے کے بعد 'ہیومن رائٹس واچ رپورٹ' کی مصنفہ ایریکا جارج لکھتی ہیں کہ "ملک بھر کے تمام اسکولوں میں روزانہ جنوبی افریقہ کی ہر ذات اور اقتصادی طبقے کی لڑکیوں کے ساتھ جنسی تشدد اور استحصال ہوتا ہے جو انھیں اپنے تعلیم حاصل کرنے کے حق کا استعمال کرنے سے محروم کرتی ہے۔"

ڈپارٹمنٹ آف جسٹس کے ذریعے 1996 میں کمیشن شدہ Gender Equity Task Team (GETT) نے جنسی نقطۂ نظر سے تعلیمی نظام کا تجزیہ کرنے کے بعد اس بات کی

نشاندہی کی تھی کہ اسکولوں میں جنسی تشدد کا مسئلہ نہایت سنگین اور پیچیدہ ہے۔ GETT رپورٹ نے یہ بھی بتایا کہ تشدد اور استحصال کا مشاہدہ، اساتذہ اور طلبا کے ذریعے دیگر طالبات کے ساتھ، کیا گیا لیکن اس بات کے اعداد و شمار بہت کم ملے کہ اسکولوں میں تشدد کس حد تک موجود ہے یا پھر اس تشدد کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔

بعد میں 1998 میں 'کمیونٹی انفارمیشن، ایمپاورمنٹ اینڈ ٹرانسپیرنسی (CIET)، افریقہ کے ذریعے کیے گئے ایک مطالعہ میں یہ پایا گیا کہ جوہانس برگ کی ہر تین لڑکیوں میں سے ایک لڑکی نے اسکول میں جنسی استحصال کا مشاہدہ کیا، لیکن ان میں سے صرف 36 فیصد لڑکیوں نے یہ کہا کہ انھوں نے اپنے ساتھ ہونے والے اس استحصال کے بارے میں کسی کے سامنے (کوئی ضروری نہیں کہ پولس کے پاس) رپورٹ درج کرائی۔

ہیومن رائٹس واچ کی طرف سے شائع ہونے والی سب سے نئی رپورٹ سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آج یہ مسئلہ کس حد تک طول پکڑ چکا ہے۔ اس قسم کی تحقیق کو غربت زدہ علاقوں میں اپنی توجہ زیادہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے، جہاں پر تعلیم حاصل کرنے کے لیے اور اسکولوں تک پہنچنے کے لیے لڑکیوں کو لمبی دوری طے کرنی پڑتی ہے، جو زیادہ تر پبلک ٹرانسپورٹ کا استعمال کرتی ہیں لیکن یہ بھی ان کے لیے غیر محفوظ اور خطرناک ہے۔

ہیومن رائٹس واچ نے یہ بھی پایا کہ بہت سے کم سہولت یافتہ اسکولوں میں اس بات کی نگرانی کا یا تو بالکل بھی کوئی انتظام نہیں ہے یا بہت کم ہے کہ اسکول کے احاطے میں اسکول جاری رہنے کے دوران یا پھر اسکول کے بند ہونے کے بعد کیا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کے ساتھ جنسی چھیڑ چھاڑ یا تو بیت الخلا میں ہوتا ہے یا پھر بیکار پڑے ہوئے کلاس روم میں، جہاں پر اس وقت اس کی نگرانی کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ اسکول کے احاطے میں شراب اور نشہ آور دواؤں کی موجودگی سے بھی جنسی استحصال کا یہ مسئلہ مزید سنگین ہو جاتا ہے۔

ان مسائل سے مقابلہ کرنے کے لیے سب سے کارآمد ہتھیار کیا ہیں؟ تعلیم۔ Global Campaign for Education کے مطابق غربت کے اس پہیہ کو روکنے کے لیے ایسے پیکج کی مداخلت کی ضرورت ہے جو پوری طرح منصوبہ بند ہو۔

4.2 کلاس روم میں جنسی امتیاز :

اسکولوں میں لڑکوں کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے اور اپنی شناخت کو قائم رکھنے کے زیادہ مواقع فراہم کیے جاتے ہیں جب کہ لڑکیاں اپنے آپ کو ایک محدود تحفظاتی ماحول میں گھرا ہوا پاتی ہیں اور خاموشی برتنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتی ہیں۔ اس فرق کو مشترکہ کلاس روم اور اسکولوں میں لڑکوں کے ذریعے جسمانی، زبانی اور تدریسی سطح پر قابض مقام کے طور پر بیان کیا جا سکتا ہے، اسکولوں کے زیادہ تر 'کام' مردوں کے ہوتے ہیں۔

مرد و خواتین شہری کے اقداری ماڈل جبھی بنتے ہیں جب بچے درجوں، سلسلوں اور اسکول کے عمل کے ذریعے آگے کو پیش قدمی کرتے ہیں۔ اسکول کی روایات (اجتماع یا اسمبلی، یونیفارم، مختلف پروگرام) کی مثالیں، تعظیم و آداب کی شکلیں، استاد اور شاگرد کے درمیان رشتے اور شاگردوں کے درمیان رشتے، نصابی مشمولات، یہ تمام چیزیں مرد و خواتین شہری کی شناخت کو قائم کرتی ہیں۔

اسکول کو ایک چھوٹا معاشرہ تصور کیا جاتا ہے، یہ ایک چھوٹی کائنات ہے جہاں وہی ضوابط و اقدار ہیں، اور جو سماجی عادتوں کے ذریعے شاگردوں کے برتاؤ کی تشکیل کرتے ہیں۔ اسکول کے اسٹاف کا ڈھانچہ شاگردوں کے سامنے ایک سماجی نظام کے اصول کو پیش کرتا ہے۔ اسکول میں بھی خواتین و عورت کی وہی شبیہ پیش کی جاتی ہے۔

مزید برآں یہ کہ، یہ اقداری ماڈل ہمیشہ سماجی مساوات کو فروغ نہیں دیتے۔ اصولی طور پر تعلیمی ماحول کو جمہوری اصولوں پر مبنی ہونا چاہیے اور اس سے مساوات کو فروغ ملنا چاہیے۔

4.3 جنس اور ٹکنالوجی :

جنسی سماجی نظام ٹکنالوجی کے ارد گرد ہوتے ہیں لیکن مساوی طور پر ٹکنالوجی بھی سماجی نظام اور خود جنس پر اثر انداز ہوتا ہے، ان کے اندر آہستہ آہستہ تبدیلی لاتا ہے اور بعض دفعہ ان کے اندر ایسی تبدیلیاں لاتا ہے جو پہلے کبھی دیکھی نہیں گئیں۔

تکنیکی علم (بنانا، دیکھ ریکھ) کو مردوں کا کام سمجھا جاتا ہے جب کہ عورتوں کا تکنیکی علم زیادہ عملی ہوتا ہے، لیکن اسے مناسب تکنیکی نہیں کہا جاتا۔

ڈیزائن، بناوٹ، تھوک اور کھدرے میں بیچنا، اور بجلی سے چلنے والے چولہوں کے معاملے میں بہت تھوڑے اختلاف کے ساتھ ان غلطیوں کو دہرایا جاتا ہے، اسے زیادہ تر معاشرے ٹکنالوجی کہہ کر پکارتے ہیں: چاہے وہ موٹر گاڑیاں ہوں، سائکلیں ہوں، آلات ہوں، کمپیوٹر ہوں یا پھر مائکروویو۔

درس وتدریس کا ماحول ہمیشہ علم حاصل کرنے کے لیے موافق نہیں ہوتا، خاص کر لڑکیوں کی سائنس، حساب اور تکنیکی کورسوں میں تعلیم کے معاملے میں۔ سائنس اور حساب کے بارے میں لڑکیاں عام طور پر یہ سوچتی ہیں کہ یہ ان کے لیے نہیں ہے، اس لیے سائنس پر مبنی موضوعات، جیسے انجینئرنگ میں ان کی کارکردگی بہت کمزور ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹیچر بھی لڑکیوں کو سائنس اور حساب جیسے موضوعات کا انتخاب کرنے میں ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔

4.4 مہاجرین اور خاص کر خواتین کے خلاف امتیاز :

OECD تعلیمی نظام کی وجہ سے بہت سے مہاجر بچے آوارہ گردی کرنے پر مجبور ہیں، جیسا کہ OECD ممالک میں تعلیمی نظام کی رپورٹ میں دکھایا گیا ہے۔

بہت سے ترقی یافتہ ممالک اپنے یہاں ہجرت کر کے آنے والوں بچوں کو تعلیم کے ذریعے اپنے معاشرے میں شامل کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ نئے OECD مطالعہ کے

مطابق OECD ممالک کے مہاجرین بچے تعلیمی کارکردگی میں اپنے ملک کے بچوں سے دو سال پیچھے ہیں اور سماجی واقتصادی اسباب کا شمار کرنے کے بعد بھی ان کے درمیان کافی فرق پایا جاتا ہے، خاص کر جب یہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ بہت سے ان ممالک میں جہاں پر دوسرے ممالک سے ہجرت کر کے لوگ آئے ہیں، ان میں بے روزگاری کی شرح ان کے آبائی ملک کی بہ نسبت دو سے تین گنی زیادہ ہے۔

ہجرت کر کے آنے والی لڑکیوں کی اسکولنگ پر ثقافتی اثرات زیادہ پڑتے ہیں۔ نئی زبان سیکھنا، دوسری ثقافتوں کو قبول کرنا اور میزبان ملک میں شمولیت اختیار کرنا ان کے لیے ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، خاص کر خواتین مہاجرین کے لیے جو نہ تو اپنے والدین کے ذریعے کلی طور پر قابل قبول ہیں اور نہ ہی میزبان ممالک کے ذریعے۔

رپورٹ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسکولی نظام میں مہاجر بچوں کے نتائج بڑے پیمانے پر مختلف ہوتے ہیں۔ بعض ممالک، جیسے کناڈا اور آسٹریلیا میں مہاجر بچوں کی کارکردگی آبائی بچوں کی طرح ہی ہے۔ لیکن دوسرے ممالک میں، جہاں اعلیٰ تعلیمی نظام ہے، وہاں پر یہ مہاجر بچے کافی پیچھے ہیں۔

رپورٹ سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ آسٹریا، بیلجیم، ڈنمارک، جرمنی، ناروے اور امریکہ میں دوسری نسل کے ایک تہائی سے زیادہ مہاجر بچے، جنھوں نے اپنا زیادہ تر اسکولی سال ان ممالک میں گزارا ہے، ان کی حسابیاتی کارکردگی PISA کے ذریعے کھینچی گئی معیاری لائن سے کافی نیچے ہے۔

اس کے علاوہ، بہت سے ممالک میں دوسری نسل کے مہاجر بچوں کی کارکردگی اتنی ہی خراب ہے جتنی کہ پہلی نسل کے مہاجر بچوں کی تھی۔ دوسری طرف ان ممالک میں جہاں مہاجرین کی تعداد کافی زیادہ ہے، وہاں پر دوسری نسل کے مہاجر بچوں کی کارکردگی آبائی بچوں کی کارکردگی کے کافی قریب ہے اور قومی اوسط کے قریب بھی ہے، خاص کر لڑکیوں کے

معاملے میں۔ اس قسم کے تمام ممالک میں مشترکہ طور پر بچپن کی تعلیم اور پرائمری سطح کی تعلیم میں زبان سکھانے کا بہترین پروگرام بنایا گیا ہے جس سے ان بچوں کے مقاصد، معیار اور احتسابی نظام کا واضح طور پر تعین ہوتا ہے۔

اس رپورٹ سے اس چیلنج کی بھی نشاندہی ہوتی ہے جو مہاجر آبادی کو میزبان معاشرے میں شامل کرنے کے لیے دی جانے والی تعلیم کو درپیش ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ مہاجر یوں ہی آتے رہیں گے بلکہ ان کی تعداد بڑھنے کی بھی امید ہے، خاص کر یوروپی ممالک کو طلبا کی آبادی کے تئیں بااثر سماجی و اقتصادی اور ثقافتی اقدامات کرنے ہوں گے تاکہ ان مہاجرین کو حقیقی معنوں میں اپنے معاشرے میں شامل کیا جاسکے اور جنسی مساوات کو یقینی بنایا جاسکے۔

5. **تعلیم حاصل کرنے کا حق :**

قانونی دستاویزات اور سیاسی عہد و پیمان

تعلیمی میدان میں جنسی مساوات کو حاصل کرنے کے لیے قانونی اور سیاسی عہد و پیمان واضح طور پر موجود ہیں، جسے زیادہ تر ممالک نے آزادانہ طور پر قبول کیا ہے۔ لہٰذا ''سب کے لیے تعلیم'' کے حق کو بین الاقوامی پیمانے پر قبول کیا گیا ہے۔

1948 میں اقوام متحدہ کے ذریعے اختیار کیا گیا حقوق انسانی کا عالمی اعلامیہ، حقوق انسانی کی نوعیت اور اس کی وسعت کو بیان کرتا ہے۔ بہت سے حقوق کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے حق کو بھی سبھی کے لیے تسلیم کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ، یہ بھی اعلان کیا گیا تھا کہ بنیادی تعلیم مفت اور لازمی ہونی چاہیے، ساتھ ہی مہارت کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم تک رسائی سب کے لیے مساوی ہونی چاہیے (دفعہ 26)۔

ان اقدامات کو حقیقت میں بدلنے کی کوششیں اب بھی جاری ہیں، جسے تب سے اب تک بہت سے بین الاقوامی کاموں میں شامل کیا جاچکا ہے۔ اس قدم نے دو راہیں اختیار کرلی ہیں :

1- پہلے راستے نے حقوق انسانی کی پابندی کے لیے ان معاہدوں کو دستاویز کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس طرح 1966 سے 1990 کے دوران بین الاقوامی پیمانے پر بہت سے عہد و پیمان کیے گئے اور بہت سی مجلسوں کا قیام عمل میں آیا، جن کے ذریعے حقوق انسانی کے تحفظ کے لیے مطلوبہ بہت سے بنیادی قوانین بنائے گئے، خاص کر ان ممالک میں جہاں تعلیم اور جنسی مساوات کا مسئلہ نہایت سنگین ہے۔

سب سے پہلے جو دو عہد و پیمان 1966 میں بنائے گئے وہ ہیں Internatinal Covenant on Civil and Political Rights (ICCPR) اور International Covenant on Economic, Social and Cultural Rights (ICESCR) جنھیں 1976 میں نافذ کیا گیا۔ ان دونوں میں لازمی اور مفت پرائمری تعلیم اور 1948 کے اعلامیہ کے مطابق غیر امتیازی تعلیم کا اہتمام ہے۔

تعلیمی حقوق اور جنسی مساوات کے لیے گذشتہ دنوں بنائے گئے دو کنونشن یوں ہیں Convention on the Elimination of All Forms of Discrimination Against Women (CEDAW, 1979) اور Convention on the Rights of the Child (CRC, 1989)۔

ان میں سے اول الذکر، CEDAW، جسے 1979 میں بنایا گیا اور 1981 میں نافذ کیا گیا تھا، کو 173 ممالک میں منظوری مل چکی ہے۔ پہلے کے دو معاہدوں کے برعکس CEDAW کو خاص طور پر جنس کو مدنظر رکھتے ہوئے بنایا گیا تھا۔ یہ تعلیم کے حقوق پر زور دیتا ہے جس کے تحت بنیادی، ثانوی، اعلیٰ تعلیم، غیر رسمی تعلیم، کھیل کود کی تعلیم اور خاندانی منصوبہ بندی کی تعلیم کا اہتمام ہے۔ اس میں بڑے پیمانے پر جنسی امتیاز کو ختم کرنے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ اس میں وظیفے کے مساوی مواقع، تعلیم کو جاری رکھنے، خواندگی، کھیل کود اور جسمانی تعلیم کو شامل کیا گیا ہے اور نصاب میں موجود غلط چیزوں کو ختم کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

1989 میں بنائے گئے CRC کو 1990 میں نافذ کیا گیا جسے 190 ممالک کی منظوری

حاصل ہوچکی ہے۔ یہ بچوں کے حقوق کو یقینی بناتا ہے اور تعلیمی حقوق کی گارنٹی کے اہتمام کو شامل کرتا ہے۔ پچھلے کنونشن کی طرح، اس میں بھی حقوق انسانی کی یقین دہانی کرائی گئی تاکہ جنس کی بنیاد پر کسی شخص سے کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔ اس میں مفت بنیادی تعلیم اور مالی امداد، حقوق انسانی کی تعلیم، جنسی تعلیم اور بچوں کی پیدائش سے متعلق اطلاعات، تعلیمی کاؤنسلنگ اور جنسی بیداری کے نصاب کو فروغ دینے جیسے اقدامات پر خاصا زور دیا گیا ہے۔

یہ ہر بچے کے حق کی دوبارہ یقین دہانی کراتا ہے، ''بغیر کسی قسم کے امتیاز کے'' (دفعہ 2/1) سے لے کر مفت اور لازمی پرائمری اسکولنگ (دفعہ 28/1a) تک اور کہتا ہے کہ تعلیم کے اعلیٰ درجات تک ''ہر بچے کی رسائی اور فراہمی'' (دفعہ 28/1b) ہونی چاہیے۔ مزید برآں، یہ بچے کی ''اقتصادی استحصال اور بچے کی تعلیم میں دخل اندازی کرنے والے کسی بھی کام'' سے تحفظ فراہم کرتا ہے (دفعہ 32/1)۔

منظوری کا عمل اس لیے اہم ہے کیوں کہ اس سے اس معاہدہ کو بین الاقوامی منظوری حاصل ہوتی ہے اور دنیا کے ممالک کو ان معاہدوں کو نافذ کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح، دنیا کے بیشتر ممالک، جنھوں نے ان معاہدوں کو اپنی منظوری عطا کردی ہے، انھیں قانونی طور پر جنسی مساوات کا انتظام کرنا پڑتا ہے اور ان معاہدوں میں درج ضابطوں کے مطابق تعلیم تک ہر شخص کی رسائی کو ممکن بنانا پڑتا ہے۔

2- حقوق انسانی کے ضابطوں کو پورا کرنے اور انھیں تحفظ فراہم کرنے کا دوسرا راستہ، اقوام متحدہ کے ذریعے بلائی گئی بین الاقوامی کانفرنس، کے اعلامیہ کو اضافی دستاویز کے طور پر استعمال کرنا ہے۔ ان کانفرنس کے نتائج درج ذیل ہیں :

(a) 1990 میں تھائی لینڈ کے جومتین نامی مقام پر ''World Conference on Education for All'' کے موقع پر دنیا کے لیڈروں نے یہ بات قبول کی کہ ''سب سے اہم ترجیح یہ تھی کہ لڑکیوں اور خواتین کے لیے تعلیم تک رسائی کو یقینی بنایا جائے اور ان کے تعلیمی

معیار میں بہتری لائی جائے اور ان تمام رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو ان کی سرگرم حصہ داری میں حائل ہیں۔'' اس کے لیے ایک آخری تاریخ طے کی گئی : عالمی پیمانے پر تعلیم تک رسائی اور بنیادی تعلیم کی تکمیل 2000 تک پوری کرلی جائے (UNESCO World Declaration on Education for All / EFA)۔

(b) 1993 میں ویانا کے حقوق انسانی کے عالمی کانفرنس کے موقع پر The Vienna Declaration and Programme of Action تیار کیا گیا، جو جنسی مساوات اور تعلیمی مساوات کے فروغ کے تئیں ریاستوں کی ذمہ داری پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔

(c) The International Conference on Population and Development (ICPD)، قاہرہ، 1994 : ضمیمہ 1 کے تمام شعبوں (''بین الاقوامی معاہدوں اور اعلامیوں کے ذریعے مختص تعلیمی حقوق اور جنسی مساوات) میں انیسواں اندراج، جو جنسی امور کے تئیں بڑھتی ہوئی بیداری کو ظاہر کرتا ہے۔

(d) The World Summit for Social Development، کوپین ہیگن، 1995۔ سماجی ترقی کے اس عالمی اجلاس میں اس بات پر اتفاق رائے ظاہر کیا گیا کہ ترقیاتی کاموں میں لوگوں کو مرکزی اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔ اس میں جو فیصلے لیے گئے وہ دس عہد و پیمان پر مبنی ہیں، جن میں سے دو جنسی تعلیم پر اثر ڈالتے ہیں۔ یہ ہیں: (a) عورت و مرد کے درمیان مساوات اور انصاف کو حاصل کرنا اور (b) تعلیم اور بنیادی صحت تک ہمہ گیر اور مساوی رسائی۔

(e) The Beijing Declaration and Platform for Action، 1995۔ کام کے ایجنڈے کے طور پر، اس پلیٹ فارم سے تمام حقوق انسانی کا استعمال اور اس کے تحفظ، اور اپنی پوری زندگی میں عورتوں کو ملنے والی بنیادی آزادی کو فروغ دیا گیا۔ جنس اور تعلیم سے متعلق بائیس اندراج ہیں جو تمام اہم امور کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان میں سے تمام نے

(مختلف طریقوں سے اور مختلف امور پر توجہ مرکوز کر کے) تعلیم میں جنسی مساوات کی از سرِ نو یقین دہانی کرائی، جنھیں حقوق انسانی کے ابتدائی کنونشن میں مختلف ممالک نے پورا کرنے کا وعدہ پہلے سے ہی کر رکھا ہے۔

(f) سینیگل کے ڈکر میں 2000 کے World Education Forum میں نئی آخری تاریخ طے کی گئی : 2015 تک تمام بچوں کو ''معیاری لازمی بنیادی تعلیم'' حاصل کر لینی چاہیے، اور شرکا ممالک نے ایک بار پھر تعلیم کے میدان میں موجود جنسی اختلافات پر تشویش کا اظہار کیا، اور اسے 2005 تک ختم کرنے کا اعادہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ عہد بھی کیا گیا کہ بالغوں کی ناخواندگی کو ختم کیا جائے گا، بچوں کی تعلیم اور اسکول سے باہر نوجوانوں کی تعلیم کے پروگرام میں اضافہ کیا جائے گا اور تعلیمی معیار میں مزید بہتری لائی جائے گی۔ یہاں پر ظاہر ہے کہ تمام بچوں میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں آتے ہیں۔

(g) United Nations Summit 2000 کے موقع پر مختلف ممالک کے سربراہوں نے دنیا سے غربت کو مٹانے کے لیے اپنے آٹھ میں سے درج ذیل دو مقاصد طے کیے :

مقصد 2. عالمگیر بنیادی تعلیم کو حاصل کرنا۔ ہدف : یہ یقینی بنایا گیا کہ 2015 تک دنیا کے تمام بچے، یعنی لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہی پرائمری اسکول کے مکمل کورس کو مکمل کرنے کے لائق ہوں گے۔

ہدف 3. جنسی مساوات کو فروغ دینا اور خواتین کو وسیع معنوں میں خود مختاری عطا کرنا اس صدی کا اہم مقصد ہے۔ ہدف : بنیادی اور ثانوی تعلیم سے جنسی اختلافات کو ختم کرنا، ترجیحی طور پر 2005 تک اور اس تفریق کو تمام سطحوں سے 2015 تک ختم کرنا۔

رضا کار تنظیموں اور تجارتی یونین کے ایک بین الاقوامی اتحاد، The Global Campaign for Education (1999) کے مطابق، ''چونکہ صحت و تندرستی میں بہتری لانے اور آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے تعلیم نہایت ضروری ہے اس لیے لڑکیوں کی تعلیم کا

مقصد صدی کے دیگر تمام ترقیاتی مقاصد کو متاثر کرتا ہے۔ لہٰذا اسے حاصل کرنے میں ناکامی کا مطلب ہوگا دیگر تمام مقاصد کا ناکام ہونا۔''

(h) مئی 2005 کے اردن کے World Economic Forum نے زیادہ تر ممالک میں تعلیمی اصلاح کی ترجیحات اور عالمگیر ثانوی تعلیم پر زور دیا۔ ان اسکولوں میں نصاب میں اصلاح کرنے کے لیے پیسہ مہیا کرایا جانا چاہیے تاکہ عالمی اقتصادیات کے بڑھتے ہوئے مطالبات کے مدنظر ایسے گریجویٹ پیدا کیے جا سکیں جو علم پر مبنی تمام صلاحیتوں سے لیس ہوں۔

حقوق انسانی کے عالمی اعلامیہ کے ذریعے جو تعلیمی عہد و پیمان کیے گئے تھے اس کی دوبارہ توثیق بعد کے سالوں میں بھی کی گئی۔ ان میں سب سے اہم UNESCO کے ذریعے 1960 کے عشرے میں بلائی گئی بہت سی علاقائی کانفرنس ہے۔ دنیا کے زیادہ تر ترقی پذیر ممالک میں ہمہ گیر بنیادی تعلیم کو حاصل کرنے کی تاریخ 1980 طے کی گئی۔ لیکن 1990 میں اس بات کا احساس ہوا کہ ابھی بہت سارا راستہ طے کرنا باقی ہے، لہٰذا تھائی لینڈ کے جومٹین میں اسی سال World Conference on Education for All کا انعقاد کیا گیا، جس میں اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ اس سلسلے میں ابھی ہمیں مزید کوشش کرنی ہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے شمال اور جنوب کے درمیان مضبوط اتفاق قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

6. تعلیمِ نسواں کے میدان میں بہتر کارکردگی اور جنسی تفریق میں کمی

ڈکر کے 'عمل کے لیے فریم ورک' اور 'صدی اعلامیہ' کے ساتھ ساتھ وہ قانونی ڈھانچہ جو تعلیمی میدان میں جنسی مساوات کو قائم کرتا ہے، اس نے تعلیم اور جنسی مقصد کو زیادہ رسمی طریقے سے ظاہر کیا۔

بیشتر ممالک اور خاص کر ترقی پذیر ممالک نے لڑکیوں کی تعلیم اور جنسی مساوات کو فروغ دینے کے لیے بہت سی پیش قدمیاں کی ہیں۔ یہاں پر میں ان میں سے چند پیش قدمیوں کا

ذکر کرنا چاہتی ہوں جو اسکولوں میں لڑکیوں کی حاضری یا انھیں اسکولوں میں برقرار رکھنے کے لیے کی گئی کوششوں سے اوپر کی چیز ہیں، لیکن یہ وہ ہیں جو لڑکیوں کے تعلیم کے بارے میں ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتی ہیں، ایک نئے دور کے آغاز کا اعلان کرتی ہیں اور جنس سے متعلق ہر قسم کے امتیازات کو ختم کرنے کا طریقہ بتاتی ہیں۔

1- NICIS : Nigerian Girls into Sciences (NIGIS) نائجیریا کی لڑکیوں کے لیے جونیئر سیکنڈری سطح پر عمل سے بھرپور کارکردگی پر مبنی ایک پروگرام ہے جس کا بنیادی مقصد نائجیریا کی لڑکیوں کے درمیان تعلیم کے بارے میں دلچسپی پیدا کرنا اور سائنس کی کارکردگی میں بہتری لانا ہے۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ سائنس میں عورتوں کی شرکت، دلچسپی اور اعتماد میں اضافہ کرنے کا طریقہ ہے ان کی تعلیم پر خاص توجہ دینا۔ NIGIS کے مطابق نائجیریا کے جونیئر سیکنڈری سائنس کے نصاب پر مبنی ایک تدریسی کتابچہ "Learn Scinence by Doing" کے نام سے تیار کیا گیا ہے۔ Learn Science by Doing یا LSD وہاں کے اسکولوں میں سائنس پڑھانے کا ایک گائڈ ہے۔

LSD کا تدریسی طریقہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ استاد پڑھاتے وقت بات اور چاک کا سہارا لے یا پھر تمام طلبا و طالبات کے ساتھ مل کر کسی چیز کو پیش کرے، یہ سرگرمی پر مبنی تعلیم ہے اور طالب علموں کے درمیان مہارت کو فروغ دینا ہے۔

جو اسکول LSD کے اس طریقے کو اپنا رہے ہیں، انھوں نے اسے خاص کر لڑکیوں کے لیے کافی فائدہ مند پایا کیوں کہ اس سے ان کے دوسرے کے ساتھ (a) باہمی ربط میں اضافہ ہوا، (b) ماحول کو اپنے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوا، (c) سائنس جیسے موضوع میں مہارت آئی اور (d) مثبت سائنسی رویوں میں اضافہ ہوا۔

2- Ngong Young Restore Hope : Training Centre for marginalized girls (Kenya) نگانگ علاقے میں رہنے والے لوگ خط افلاس سے

نیچے زندگی گزار رہے ہیں (فی گھر 220 امریکی ڈالر)۔ بہت ساری سماجی برائیوں، جیسے ڈرگس، کم عمری میں شادی اور جسم فروشی کی وجہ سے کم عمر کی لڑکیاں ابتدائی عمر میں حاملہ ہو جانے اور اسکول کی فیس جمع نہ کر پانے کے سبب اسکول چھوڑنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

اس سنٹر نے 200 نوجوان لڑکیوں اور ماؤں کو کمیونٹی پر مبنی ہیلتھ کیئر پروگراموں کی ٹریننگ، خاندانی زندگی کی تعلیم، انصاف اور امن کے تئیں بیداری اور آمدنی پیدا کرنے والی سرگرمیوں اور چھوٹی چھوٹے کارخانوں کی ان طبقوں کے اشتراک سے ترقی کے ذریعے انھیں لڑکیوں اور ماؤں کی بازآبادکاری کی کوشش کی ہے۔

3- دارالسلام (تنزانیہ) یونیورسٹی کے فیکلٹیز آف سائنسز اور انجینئرنگ میں طالبات کے لیے پری انٹری پروگرام۔ اس پروگرام کا مقصد فیکلٹیز آف سائنسز اور انجینئرنگ میں داخلہ سے متعلق جنسی عدم توازن کو ختم کرنا ہے۔ ان دونوں فیکلٹیز میں 1991 اور 1996 میں طالبات کا داخلہ 15% اور 4% رہا۔ اس رجحان کو دیکھتے ہوئے یونیورسٹی کی انسٹی ٹیوشنل ٹرانسفارمیشن پروگرام اسٹیرنگ کمیٹی نے ایسی اسٹریٹجی بنانے کا فیصلہ کیا جس سے طالبات کے داخلہ کی یہ تعداد بڑھ کر 50% ہو سکے۔ اس پروگرام کی معاونت دو سال تک FAWE نے کی۔

اس کورس نے خواتین کی تعداد 98-1997 تک کیمسٹری اور بایولوجی میں 70% تک کر دی۔ سب سے اہم بات یہ رہی کہ اس پروگرام نے طالبات کو اچھے انداز میں یونیورسٹی کے ماحول سے آشنا کرایا، ان کے لیے یونیورسٹی کے کیمپس میں رہنے کی راہ آسان کی، لائبریری کے استعمال اور لکچر کو سمجھنا آسان بنایا اور ان کی خود اعتمادی میں اضافہ کیا۔

4- لڑکیوں با اختیار بنانا

FAWE کی سب سے جدید مداخلت تین FAWE Centres of Excellence کی تشکیل ہے، ایک کینیا کا AIC کا جیاڈو گرلس اسکول، دوسرا تنزانیہ کے کیلوسا علاقے میں مگوگو

سیکنڈری اسکول اور تیسرا روانڈا میں کیگالی ہے۔ ان اسکولوں کو تکنیکی اور مادی دونوں قسم کی امداد فراہم کی گئی ہے جس میں خزانچی اسکیم کے ساتھ ایسے پروگرام بھی شامل کیے گئے ہیں جن کی وجہ سے لڑکیاں ان مراکز تک آسانی سے آجاتی ہیں۔

5- نیا عالمی چیلنج

2003 میں پوری دنیا میں تقریباً 37 مقامات پر مسلح جنگ لڑی جارہی تھی جس کی وجہ سے 12 ملین افراد دوسرے مقامات پر پناہ لینے کے لیے مجبور ہوئے جب کہ اس کی دوگنی تعداد، یعنی تقریباً 25 ملین افراد کے گھر اجڑ گئے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد ان بچوں کی بھی ہے جن کی عمر اسکول جانے کی ہے لیکن ان کے لیے کوئی اسکول نہیں ہے؛ اس لیے ایمرجنسی، جنگ اور بازآبادکاری کے وقت تعلیم کا اہتمام کیا گیا اور اس کا نام رکھا گیا Educating Children in Crisis۔

2000 کے Dakar Forum نے واقعتاً بین الاقوامی برادری کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ جنگ، قومی قدرتی آفات اور عدم استحکام کی حالت میں وہ تعلیم نظام کو دستیاب کرے گا، خاص کر ایسے پروگرام بنائے گا جس سے سمجھ بوجھ، امن اور رواداری کو بڑھاوا ملے۔ اس طرح کی تعلیم جو عام طور پر بین الاقوامی ایجنسیوں کے ذریعے فراہم کی جاتی ہے، اس کا مقصد لڑکیوں اور نوجوان عورتوں کو تحفظ فراہم کرنا ہے، جنسی امتیازات سے انھیں باہر نکالنا ہے لیکن اس میں بہت کم ایجنسیاں ہی سرگرم ہیں۔ Save the Children نامی تنظیم کی پہل کافی اہم ہے۔

Save the Children نے ان لاکھوں لڑکیوں اور لڑکوں کو تعلیمی مواقع فراہم کرنے کے لیے عالمی پیمانے پر ایک بڑے چیلنج کو قبول کیا ہے، جن لڑکے اور لڑکیوں کے اسکول ملکی بحران، جنگ و جدل اور قدرتی آفات کی وجہ سے متاثر ہوتے ہیں۔ بنیادی نقطہ کے طور پر

Save the Children فی الحال ان آٹھ ممالک پر اپنی توجہ مرکوز کررہا ہے جہاں حالیہ دنوں میں تباہ کاری ہوئی اور متاثرہ علاقوں کے تیس لاکھ بچوں کی تعلیم کا انتظام کررہا ہے۔

ان میں سے پہلے ترجیحی ممالک ہیں افغانستان، انگولا، جمہوریہ کانگو، انڈونیشیا، نیپال، سری لنکا، سوڈان اور یوگانڈا۔

اس کوشش کے ذریعے 'Save the Children' (بچوں کو بچاؤ) تنظیم بین الاقوامی برادری کو اس بات کے لیے آمادہ کرنا چاہتی ہے کہ وہ مزید لاکھوں لڑکیوں اور لڑکوں کو وسیع تعلیمی سہولیات فراہم کرے۔ اس کا مقصد تعلیم کی پہچان اس طرح بنانی ہے تاکہ یہ بچوں کے ساتھ ہونے والی چھیڑ چھاڑ اور انھیں نقصان پہنچانے سے روکنے کا ایک ذریعہ ثابت ہوسکے، اس کے علاوہ اس کا مقصد بچوں کو اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے مواقع بھی فراہم کرنا ہے۔

انڈونیشیا اور سری لنکا جہاں ہزاروں بچے، جن میں لڑکیاں بھی شامل ہیں، 26/دسمبر 2006 کو سنامی کی وجہ سے ہونے والی تباہ کاری کی وجہ سے اب بھی اپنے اپنے اسکولوں میں واپس نہیں آسکے ہیں۔ 'Save the Children' تنظیم متعدد ممالک کی حکومتوں سے مل کر ایک ایسا اسکولی ماحول تیار کرنے کی بھی کوشش کررہی ہے جہاں پر ان بچوں کی غیر رسمی تعلیم کا بندوبست کیا جاسکے جو بعض مجبوریوں کی وجہ سے اسکول نہیں جاسکتے۔

6- آخری عالمی اقتصادی فورم، جو 22-20/مئی 2006 کو مصر کے شرم ال شیخ میں منعقد ہوا، اس نے مصر کی طرف سے ایک تعلیمی پہل کی، جس کے تحت اطلاعات، ترسیل اور ٹکنالوجی کے ذریعے ملک میں اسکولی نظام میں بہتری لانے پر زور دیا گیا ہے۔ مصر کی یہ پیش قدمی چار جانب توجہ مرکوز کرے گی : یونیورسٹی سے قبل کی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، تاحیات تعلیم اور ای لرننگ انڈسٹری۔ اس میں جنسی نقطۂ نظر کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

7- جنسی مساوات کو فروغ دینے کے لیے 2004/2005 کے یونیسکو پروگرام میں مناسب سرگرمیوں کے ساتھ لائحۂ عمل کی چار کڑیاں تیار کی گئی ہیں :

- پہلی کڑی اس حصہ داری اور نیٹ ورک کی وکالت ہے جس کے ذریعے لڑکیوں کی تعلیم اور عورتوں کی خواندگی سے متعلق مزید بیداری پیدا کی جاسکے؛
- دوسری کڑی تعلیم میں جنسی نابرابری کی اصلی وجہ جاننے کے لیے تحقیق اور تجزیہ کرنا ہے؛
- تیسری کڑی اس جنسی خدمات کا اہتمام کرنا ہے جس میں اسکول کے لیے رہنمائی اور کاؤنسلنگ، اساتذہ کی ری اورینٹیشن اور ٹریننگ، لڑکیوں کے لیے پسندیدہ ماحول کا فروغ اور مناسب تعلیمی مواد کی فراہمی کی حوصلہ افزائی کرنا شامل ہیں؛
- چوتھی کڑی میتھمیٹکس، سائنس، انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی میں لڑکیوں اور خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے وسیع مواقع فراہم کرنا ہے۔

تعلیم کے حق سے متعلق ان تمام بیانات اور پہل نے تمام افراد کو نسل، جنس اور قومیت سے متعلق امتیازات کے بغیر سب کو اس سے مساوی طور پر مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔ گذشتہ برسوں میں حالانکہ جنسی مساوات کے مدعے پر کافی زور دیا گیا ہے، پھر بھی تعلیمی میدان میں جنسی مساوات کو پوری طرح حاصل کرنے سے ہم ابھی بھی بہت دور ہیں۔ اس لیے حالیہ دنوں کے ملینیم ڈیولپمنٹ مقاصد میں سے خصوصی اہمیت کی حامل تعلیمی میدان میں برابری و مساوات ہے۔

7. برابری سے مساوات کی طرف پیش رفت

تعلیمی میدان میں جنسی مساوات اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتی جب تک کہ مختلف معاشروں میں بڑے پیمانے پر تبدیلی رونما نہ ہو۔

جنسی برابری، جو تعلیم کے مختلف مراحل میں دونوں جنسوں کے مساوی شرکت کی طرف

اشارہ کرتی ہے، وہ ایک تعددی نظریہ ہے۔ اس کی علامات اعداد و شمار ہیں، مثال کے طور پر لڑکے اور لڑکیوں کے ذریعے پرائمری، سکنڈری اور اعلیٰ تعلیم میں متوازی طور پر شریک ہونے کی تعداد۔ یہ تبدیلی کے ایک حرکی اشارہ کے طور پر کام کرسکتا ہے اور جنسی مساوات کو حاصل کرنے کے پہلے قدم کو پیش کرتا ہے۔

لیکن جنسی برابری کو دکھانے والے اعداد و شمار کی کچھ حدود ہیں۔ پہلی چیز تو یہ کہ اگر ظاہری طور پر ایسا لگتا ہے کہ برابری کی طرف ہونے والی یہ پیش رفت مکمل ہوچکی ہے، تو ایسی حالت میں بعض دفعہ بجائے اس کے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے کے اسکولوں میں ان کے داخلے میں گراوٹ بھی ہوسکتی ہے۔ دوسری چیز یہ کہ اعدادی توازن پر زور دینے سے اس چیز کا پتہ نہیں چلتا کہ کس طریقے سے اس توازن کو پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور نہ ہی اس سے اس معیار کی تبدیلی کا پتہ چلتا ہے جو جنسی مساوات کو حاصل کرنے کے لیے پوری طرح ضروری ہیں۔

جنسی مساوات کا مطلب ہے خواتین اور مردوں کی طرف سے نکل کر آنے والے برابر نتائج، حالانکہ وہ اپنی شروعات مختلف سہولیات سے کرتے ہیں اور مختلف قیود میں بندھے ہوتے ہیں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ جسمانی صلاحیت اور سماجی شناخت کے اعتبار سے عورتیں مردوں سے کئی معنوں میں مختلف ہوتی ہیں۔ اس لیے عدم مساوات عورت و مرد کے درمیان طاقت کے نابرابر رشتوں اور ہر جنس کو تفویض کیے گئے مختلف رول سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے جنسی مساوات کے بارے میں اندازہ لگانے کا یہ مطلب ہونا چاہیے کہ جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہ جنسی مساوات اور خواتین کی خودمختاری کے حق میں ہیں یا نہیں۔

جنسی امتیازات سے مبرا معاشرے کی تشکیل کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ان تمام سماجی قوانین کو ختم کردیا جائے جس کی وجہ سے خواتین و مرد معاشرے میں نابرابری کے ساتھ

شرکت کرتے ہیں اور معاشرے میں دستیاب سہولیات سے بھی یکساں طور پر مستفید نہیں ہو پاتے۔

تعلیم کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ لڑکیوں اور لڑکوں کو اسکول جانے کے یکساں مواقع فراہم ہوں اور انھیں اس قسم کے تدریسی طریقے اور نصاب دستیاب ہوں جو محدود ذہنیت سے پوری طرح پاک ہوں اور ان کو ملنے والا اکیڈمک اور مینٹیشن اور کاؤنسلنگ جنسی تعصب سے مبرا ہو۔ بنیادی طور پر اس کا مطلب اسکولنگ، تعلیمی حصولیابیاں اور تعلیمی لیاقتوں کے یکساں نتائج ہیں اور مزید وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو اس کا مطلب ہے ایک جیسی لیاقتوں اور تجربے کی بنیاد پر نوکریوں اور کمانے کے یکساں مواقع فراہم ہوں۔

خلاصہ

تعلیمی پالیسیاں، جن کا تعلیم پر پوری طرح کنٹرول ہوتا ہے، وہ ہمیشہ لڑکیوں اور خواتین کے حق میں نہیں ہوتیں۔ اسکولی مقامات اور اسکولی ساز و سامان کی فراہمی، اور استادوں کی تقسیم اور تقرری اس طرح سے ہونی چاہیے کہ اس میں کسی قسم کا امتیاز نہ برتا جائے۔

غریبی کو دور کرنے کے لیے لڑکیوں کی تعلیم ضروری اور نہایت اہم ہے۔ فی الحال سب سے سنگین مسئلہ یہ ہے کہ جیسے جیسے تیسرا ملینیم آگے کو بڑھ رہا ہے، انفرادی طور پر، خاندان اور فرقے کی سطح پر، قومی اور عالمی سطح پر ہم اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ لڑکیاں، جو کہ بہت سے ممالک کا مستقبل ہیں، خاص کر سب سے کم ترقی یافتہ ممالک کی، وہ ٹیکنالوجی اور انفارمیشن کے میدان میں آگے کو بڑھتی ہوئی اس دنیا میں کہیں پیچھے نہ رہ جائیں۔

لڑکیوں کو نہ صرف یہ کہ اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کے گھروں کو منتظم اور برقرار رکھنے کے لیے پوری طرح شرکت کرنی چاہیے بلکہ سرگرم اور متحرک شہری کے طور پر اپنے ملک کی ترقی و خوشحالی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تعلیم میں حائل ہر قسم کی رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے تاکہ ان لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہو سکے جو سکنڈری اور پوسٹ

سیکنڈری سطح کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں، ساتھ ہی وہ ترقی کے لیے لازمی مہارت کو بھی حاصل کر سکیں۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پوری لگن سے محنت کی جائے اور غریبی کو مٹانے کے لیے تمام شعبہ ہائے زندگی سے منسلک افراد کی طرف سے مل کر کوشش کی جائے۔

مرد و عورت دونوں کے لیے پوری شہریت کے معیار کو حاصل کرنا ہی واحد مقصد نہیں ہے بلکہ اس بات پر توجہ دینے کی بھی ضرورت ہے کہ مرد و عورت کیسے تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ان کے نصاب میں کیا چیزیں شامل ہیں، وہ اس میں کیسے شرکت کر رہے ہیں اور تعلیم و تعلم کے کن طریقوں سے انھیں اس کے لیے آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ اپنی زندگی اور جس ماحول میں وہ گزر بسر کر رہے ہیں، اس پر مکمل قابو پانے کے لیے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو یکساں مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔

ظاہر ہے، جب لڑکیاں اور لڑکے اپنی حیثیت کو پہچاننے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اسکولی تعلیم حاصل کر لیں گے تو وہ خود اپنی زندگیوں پر کنٹرول حاصل کر سکیں گے اور خود کو با اختیار بنا سکیں، اپنے معاشرے کی سماجی اور اقتصادی ترقی میں ہاتھ بٹا سکیں گے اور جب وہ بڑے ہو جائیں گے تو سیاسی امور میں اہم فیصلہ لینے کے لائق بھی بن جائیں گے۔

مستحکم مستقبل کے لیے تعلیم کے ایک نئے نظریہ کے لیے روایتی طریقوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے اور لوگوں کے درمیان بڑے پیمانے پر بیداری پیدا کرنے، تنقیدی تجزیہ کرنے اور متعدد اداروں اور شعبوں کی مدد سے جنسی مساوات پر مبنی مستحکم ترقی کو ممکن بنانے کے لیے نئے ضابطوں کو نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔

جنسی مساوات کو ایک مقصد اور مستحکم ترقی کی شرط کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ رسمی تعلیم میں جنسی مساوات کو حاصل کرنا اقوام متحدہ نظام، ریاستی منصوبوں اور رضا کارانہ تنظیموں کی سرگرمیوں کا بھی مقصد ہے۔ یہ تمام ادارے جنسی حساسیت کے نظریوں اور مادوں پر اور تمام تعلیمی سرگرمیوں میں جنسی اتحاد کے نظریوں کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔

سوالات و مداخلات

لڑکیوں اور خواتین کے ساتھ اس طرح کا امتیاز کیسے برتا جا سکتا ہے؟

خضر :

1941 کے موسم خزاں کے دوران ہمارے اسکول میں 130 لڑکے اور صرف ایک لڑکی تھی۔ اب جب کہ ہائی اسکول اور یونیورسٹی سطح پر لڑکیوں میں تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور کامیابی کے بھی بہتر مواقع میسر ہوئے ہیں، پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے : میرے والد کے لیے یہ کیسے ممکن ہوا کہ، وہ اپنے زمانے میں اپنی بیٹیوں کے لیے بھی اس لیے فکر مند رہتے تھے کہ ہائی اسکول میں وہ کیسے کامیاب ہوں لیکن مالی استطاعت کے باوجود انھوں نے اپنی بیٹیوں کو یونیورسٹی میں نہیں بھیجا۔ اس سوال کا بار بار یہی جواب تھا کہ لڑکیوں کو شادی کرنی چاہیے اور ان کو تعلیم دلانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو خطوط لکھ سکیں اور انجیل اور دیگر کتابیں اور اخبارات پڑھ سکیں۔ کیا ایسا دوسرے ممالک میں بھی تھا، اور آخر یہ سب ہوا کیسے؟

بیلا ربی :

میرے خیال سے، بہت سے ممالک میں لڑکیوں اور خواتین کو مردوں کے برابر شہری نہیں مانا جاتا۔ وہ صرف فلاں شخص کی بیٹیاں یا فلاں شخص کی بیوی یا ماں ہوتی ہیں، لیکن اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کو حاصل کرنے والی شہری نہیں ہوتیں۔ ان کا مقام اپنی فیملی اور گھر میں ہی ہوتا ہے۔ جب وہ کام کرتی ہیں، تو ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ چھوٹے خاندانوں کی ضرورتوں کو پورا کریں، جس میں والدین، شوہر اور بچے بھی شامل ہیں۔

اس کے علاوہ جب ہم اسکولی سطح پر نظر ڈالتے ہیں اور نصابی کتابوں اور نصاب پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہی تعلیم دی جاتی ہے کہ لڑکیوں سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنی ماں کی

مدد کریں، اور یہ کہ شوہروں کو اپنی بیویوں کو پیٹنے کا حق حاصل ہے، یہ تعلیم بعض مذہبی کتابوں کے ذریعے بھی دی جاتی ہے، اور سب سے اوپر یہ کہ مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے۔ دراصل وہ اس لیے زندہ رہتی ہیں تاکہ دوسروں کو نام و نمود عطا کر سکیں، وہ خود اپنی زندگی نہیں جی رہی ہیں۔

ہمیں بعض امور پر مکرر غور و فکر کے لیے تیار رہنا چاہیے

تعلیم اور جنس کے امور پر تمام اعلامیے، کنونشن، خواتین کے ساتھ ہونے والے تمام طرح کے امتیازات کو ختم کرنے کی باتوں کا لب لباب یہی ہے کہ عورتوں کو ان کی جنس کے نظریہ سے نہیں دیکھا جانا چاہیے بلکہ انھیں ایک انسان اور شہری ہونے کے نظریہ سے دیکھا جانا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنس کی بنیاد پر بہت سے اختلافات موجود ہیں، لیکن عورت و مرد کو جنس سے متعلق ان اختلافات کے باوجود ایک ساتھ زندگی گزارنا چاہیے اور ایک ساتھ کام کرنا چاہیے تاکہ جنسی مساوات کے مقصد کو حاصل کیا جا سکے۔

ہمیں یہ معلوم ہے کہ گذشتہ صدی کے آغاز میں عورتیں کم تعلیم یافتہ ہوا کرتی تھیں، لیکن اب ہم 21 ویں صدی میں سانسیں لے رہے ہیں، اس لیے ہمیں اپنے حالات کا دوبارہ جائزہ لینے اور اس پر از سر نو غور کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ عالم کاری کا عمل ہماری دنیا میں تبدیلی لا رہا ہے؛ لیکن اس کے باوجود عورتیں اب بھی پیچھے ہیں، وہ اس بات کا انتظار کر رہی ہیں کہ زندہ رہنے میں مرد ان کی مدد کریں، خاص کر دیہاتی علاقوں میں۔ کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اصولی طور پر آپ کے پاس اچھا نظام اور مساوی حقوق ہو سکتے ہیں لیکن زمینی طور پر آپ کے پاس اب بھی بہت سے اختلافات ہوں گے۔ عورت بطور انجینئر، پروفیسر یا اٹارنی، آپ کی ساتھی ہو سکتی ہے لیکن پھر بھی مرد کے ذہن میں ہمیشہ یہی بات رہتی ہے کہ عورتیں ان کے برابر نہیں ہو سکتیں، صرف اس لیے کہ وہ خواتین ہیں۔ ہم خواتین ہیں اور ہمیں عورت ہونے پر ناز ہے، ہم برابر درجہ حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، صرف

کاغذوں پر نہیں بلکہ حقیقت میں بھی۔

اس حالت کو بدلنے کے لیے کیا عالمی سطح پر کوئی عملی قدم اٹھایا جارہا ہے؟

خوری :

میرا سوال پروفیسر بیلا ربی کی اس اپیل کی حمایت میں ہے کہ اس ناخفتہ حالت سے باہر نکلنے کے ذرائع اور طریقے ڈھونڈے جاسکیں : کیا عالمی سطح پر اس سلسلے میں ٹھوس اقدامات کیے جانے کے ثبوت ہیں؟ کیا ایسے گروہ اور ادارے موجود ہیں جو مناسب اقدام کررہے ہیں تاکہ موجودہ حالات میں بہتری لائی جاسکے؟ کیا اس کا تعلق صرف خواہش اور دعویٰ کرنے تک ہی محدود ہے یا پھر ہم نے پہلے سے ہی کوئی طریقہ ڈھونڈ نکالا ہے؟

ہر ملک کی عام ترقیاتی حالت ایک اہم رول ادا کرتی ہے

بیلا ربی :

یہ حقیقت کہ ہمیں صرف نظریوں اور خواہشوں تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ یہ امید بھی کرنی چاہیے کہ وسیع پس منظر میں حالات ضرور بدلیں گے۔ لیکن اگر ہم اس میں مشغول نہیں ہوں گے اور اس مقصد کو حاصل کرنے میں حصہ داری نہیں لیں گے تو کچھ بھی نہیں بدلے گا۔

مرد و عورت کے درمیان مساوات کے موضوع پر بہت سے بین الاقوامی سیمینار منعقد کیے جارہے ہیں اور بہت سے اہم دستاویز بھی پاس کیے جارہے ہیں؛ اس کے باوجود اس سلسلے میں ہمارے سامنے بہت سے اہم امور بھی آئے: اس لیے ہر ملک کی ترقیاتی حالت کے مدنظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو ملک جتنا ترقی یافتہ ہوگا وہاں پر اعلیٰ تعلیم کا معیار بھی بہتر ہوگا اور وہاں تک سب کی رسائی بھی ہوسکے گی۔ اس کی بہترین مثال مراقش ہے، جہاں پر 1990 کے عشرے میں دیہاتی علاقوں کی صرف 56 فیصد لڑکیاں ہی اسکول جاتی تھیں لیکن آج یہ فیصد بڑھ کر 90 ہوچکی ہے۔

لیکن دوسرا مسئلہ یہ ہے : ان لڑکیوں کو پرائمری اسکول کے چھ برسوں اور سیکنڈری اسکول کے چار برسوں تک اسکول میں کیسے برقرار رکھا جائے؟ ایک بار پھر یہ مسئلہ اقتصادی اور سماجی ترقی سے جڑا ہوا ہے : یعنی دستیاب اسکول اور اساتذہ کی تعداد، دیہاتی علاقوں میں ٹرانسپورٹ کا مسئلہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ آخر میں ثقافتی مسئلہ بھی اپنی جگہ برقرار ہے۔ والدین کو اسکولی نظام کے بارے میں یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ نوکری حاصل کرنے کا صرف یہی راستہ ہے۔ لیکن ان تمام چیزوں کو وہ بہت محدود ذہنیت سے دیکھتے ہیں۔

ہمیں عورتوں کی آواز میں طاقت اور مردوں کی مشترکہ جدوجہد کی ضرورت ہے

تعلیم کا ایشو ہر طرح سے ملک کی عام ترقیاتی حالت سے منسلک ہے، خاص کر اس کی جمہوری ترقی کے معاملے میں۔ لیکن ہم کسی بھی حالت میں جنسی برابری کے اپنے مقصد کو اس وقت تک حاصل نہیں کرسکتے جب تک کہ عورتوں کی طرف سے مضبوط آواز نہ اٹھائی جائے کیوں کہ اب تک تعلیم پر مردوں کی ہی حکمرانی رہی ہے۔ لیکن معاشرہ عورت اور مرد دونوں سے مل کر بنا ہے۔ اس کے علاوہ تمام نصاب، نصابی کتابوں وغیرہ میں عورت و مرد دونوں کی طرف سے تعلیم اور مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے ٹھوس تبدیلی ہونی چاہیے اور ہمارے معاشرے میں عورت و مرد کے درمیان طاقت کی متوازن تقسیم ہونی چاہیے۔

حضرت محمدؐ کی روایت اس سے بالکل مختلف تھی جو ہم نے بعد میں جاکر سیکھی

طاہر محمود :

پروفیسر بیلا ربی نے بالکل درست کہا کہ عورتیں اپنے شوہر کے گھر میں مسز فلاں وفلاں بن جاتی ہیں کیوں کہ ان کا تعلق مغرب کے روایتی مسلم خاندان سے ہے۔ لیکن آخر کار ایسا کیوں ہے؟ کیا ہم نے اسے مغرب سے ہو بہو نہیں قبول کرلیا ہے؟ یہ وہ روایت نہیں ہے جسے

ہمارے پیغمبر محمدؐ نے ہمارے لیے چھوڑا تھا۔ جیسا کہ ہم سبھی لوگ جانتے ہیں کہ سیدہ عائشہ صدیقہؓ، اپنے شوہر محمدؐ کے گھر میں شادی کے بعد بھی عائشہ بنت ابوبکر ہی رہیں اور وہ مسز محمدؐ نہیں بنیں۔ اور خود ان کی بیٹی، فاطمہؓ علیؓ سے شادی کے بعد بھی فاطمہ بنت محمدؐ ہی رہیں، مسز علیؓ کبھی نہیں بنیں۔ اس لیے اپنے معاشرے میں عورتوں کی زبوں حالی کے ہم خود ہی ذمہ دار ہیں۔

زبردست پیش رفت پہلے ہی ہو چکی ہے

پیامبر خضر ہمیں پہلے ہی یہ بتا چکے ہیں کہ 1941 میں ان کے والد نے اس سوال کا کیا جواب دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو یونیورسٹی کی طالبہ کیوں نہیں بنانا چاہتے تھے۔ 65 سال کے بعد آج بھی مسلم دنیا اور بہت سے غیر مسلم ممالک کے والدین یہی سوچتے ہیں کہ لڑکی کو آج یا کل دوسرے گھر میں جانا ہی ہے، اس لیے ان کی تعلیم پر پیسہ کیوں خرچ کیا جائے؟ کیا اس کا تعلق بالآخر دوسری فیملی سے نہیں ہے؟ کیا وہ یہاں پر مہمان نہیں ہے یا ایک ایسی چڑیا نہیں ہے جو پنجرہ کھلتے ہی اڑ جائے گی؟ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حالیہ دنوں میں زبردست پیش رفت ہوئی ہے۔ اس کا مشاہدہ سبھی کر رہے ہیں، یہاں تک کہ ہماری وسیروٹا کی تشکیل سے بھی اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔

ذہنیت میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے

بیلاربی :

ہمارا معاشرہ عورتوں کے خلاف ہونے والے استحصال سے کافی اثر قبول کر رہا ہے، صرف مراقش میں ہی نہیں، بلکہ بہت سے ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک میں بھی۔ اس لیے اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ ہم عورتوں کے خلاف ہونے والے اس امتیازی رویے کو ختم کرنے کے لیے پوری طرح کمربستہ ہو جائیں جس سے پورا معاشرہ متاثر ہو رہا ہے۔ فطری طور پر اس امتیاز کو مرد اتنی گہرائی سے محسوس نہیں کرتے جتنا کہ اپنی زندگی، اپنے ذہن اور اپنے باہمی

رشتوں کے دوران عورتیں کرتی ہیں۔ مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ ہم عورتیں آج نہ کل مسز فلاں بن جائیں گی بلکہ بطور فرد ہماری عزت واحترام کو بھی خطرہ لاحق ہے۔ ہم عورت کے روپ میں دکھائی دیتی ہیں۔ ہمیں جدید معاشرہ وغیرہ میں کہیں بھی پایا جاسکتا ہے۔ اور بعض دفعہ لوگ عورتوں کو اپنے درمیان میں پاکر خوش ہوتے ہیں، ایک پھول کی مانند جو انھیں خوشی فراہم کرتا ہے یا خوشبو دیتا ہے یا پھر عطر کے طور پر، جیسا کہ مجھے کبھی کبھار سننے کو ملتا ہے۔ لیکن صحیح معنوں میں یہی مسئلہ درپیش ہے۔ ہم اپنے آپ کو پھول یا عطر سے جوڑنا نہیں چاہتے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں ایک انسان کے طور پر پہچانا جائے۔ اس تنقید کو بار بار منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے، اس امید کے مدنظر کہ لوگوں کی سوچ میں تبدیلی آسکے گی۔ درحقیقت ہماری دنیا بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے، اس لیے ہم بھی اپنے دادا دادی کی دنیا میں رہنا نہیں چاہتے بلکہ ہم بھی اپنی موجودہ دنیا اور اپنے بچوں کی دنیا میں مصروف ہونا چاہتے ہیں۔

فکر وعمل میں تضاد

پوٹز :

پہلے ہم نے کمیونسٹ ممالک کے تعلیمی ماڈلس کے بارے میں مثبت باتیں کیں۔ مجھے روسی زبان کی قدیم زمانے سے چلی آرہی ایک درسی کتاب کے بارے میں یاد ہے جو میں اسکول میں استعمال کیا کرتا تھا۔ اس کتاب کے ایک صفحہ پر باپ کو ایک استاد کی شکل میں اور ماں کو انجینئر کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ لیکن جب آپ اس کتاب کے صفحے کو پلٹتے تو آپ کو وہ فیملی گھر پر بیٹھی ہوئی ملتی : باپ اپنے ہاتھوں میں اخبار لیے ہوئے لونگ روم میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ماں باورچی خانہ میں کھڑی ہوئی کھانا تیار کر رہی ہیں، مسز انجینئر۔ اس طرح حقیقت بعض شرائط کے ساتھ صرف ایک آئیڈیل تھی۔

بیلا ربی :

1975 میں میں انٹرنیشنل ویمنس ایئر کی تشکیلی کمیٹی میں تھی۔ دو تقریبات منعقد کی گئیں : جون/جولائی میں ایک سرکاری تقریب میکسیکو میں اور اکتوبر میں ماسکو میں ہی ان سوشلسٹ کمیونسٹوں وغیرہ کے لیے ایک اور متبادل تقریب منعقد کی گئی جو میکسیکو کی سرکاری تقریب کا بائیکاٹ کرنا چاہتے تھے۔ بعد والے کانفرنس کی تیار کرنے کے لیے مجھے عورتوں کے مضبوط گروپ کے ساتھ ماسکو میں مدعو کیا گیا۔ اس موقع پر ہمیں بہت سے اداروں اور اسکولوں کی سیر بھی کرائی گئی، مجھے یہ دیکھ کر کافی حیرانی ہوئی کہ لڑکے ٹیکنیکل کورس کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں جب کہ لڑکیاں عورتوں کے کام، جیسے کھانا پکانا اور سلائی وغیرہ سیکھ رہی ہیں۔ میرا ملک جو اس کی کافی تنقید کیا کرتا تھا، وہاں سے میں نے جو کچھ جانا، اس سے میں یہی سوچا کرتی تھی روس میں یہ سب بالکل مختلف ہوگا، لیکن وہاں بھی ایک بار پھر یہی صورت حال تھی۔ اس لیے واضح طور پر یہ ذہنیت سے جڑا ہوا ایک معاملہ ہے۔ حالانکہ اس وقت روسی پارلیمنٹ میں 30 فیصد سے زائد خواتین ڈپٹی تھیں، لیکن اس سے بھی کوئی زیادہ تبدیلی دکھائی نہیں دی۔ وہ عورت کے طور پر کام نہیں کر رہی تھیں بلکہ حکومتی نظام میں حاصل ہونے والے اختیارات کے مطابق کام کرنے میں مشغول تھیں۔

عورتوں کو خود ہی ذمہ داریاں قبول کرنی چاہئیں

صالحہ ایس محمود :

میں پروفیسر بیلا ربی کی اس بات سے پوری طرح متفق ہوں کہ عورتوں کے ساتھ استحصال ہوتا ہے اور انھیں حاشیہ پر لا کھڑا کیا جاتا ہے۔ مسئلہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ عورتوں بذات خود ایسی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتیں جو انھیں تحفظ فراہم کر سکے یا ان کا دفاع کر سکے۔ مثال کے طور پر آخر کار عورتیں کو اپنے شوہروں کا نام اپنے نام کے ساتھ جوڑنے کی کیا ضرورت ہے جب

اسلام میں اسے لازمی قرار نہیں دیا گیا ہے؟ پچھلے زمانے میں مسلم خاندانوں میں شادی کے بعد عورتیں اپنے شوہروں کا نام اختیار کرنے سے انکار کرتی تھیں۔ عرب دنیا کے اندر، مثال کے طور پر سعودی عرب میں شادی کے بعد عورتیں اپنا نام نہیں بدلتیں بلکہ اپنے والد کے نام پر قائم رہتی ہیں۔

عام طور پر، ہم عورتیں اس بات کی ذمہ داری قبول نہیں کرتیں کہ ہماری روایتوں نے ہمیں کیا عطا کیا ہے، بلکہ لاعلم ہی رہنا چاہتی ہیں اور اپنے بارے میں مردوں کو فیصلہ کرنے دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر شریعت میں ہمارے لیے وراثت کا قانون ہے جو ہمیں تحفظ فراہم کرتا ہے۔ پوری دنیا میں اگر دیکھا جائے تو 95 فیصد دولت پر مردوں کا کنٹرول ہے جب کہ سعودی عرب میں، جہاں کہ شریعت نافذ ہے، وہاں 40 فیصد دولت عورتوں کے قبضے میں ہے۔ اور ایسا اس لیے ہے کیوں کہ جب وراثت کے قانون کو صحیح طور پر نافذ کیا جائے گا تو عورتوں کو اپنے والد اور شوہر سے براہِ راست دولت و جائیداد ورثے میں ملے گی۔ اور یہ بھی پوری طرح واضح ہے کہ عورتوں کی تعلیم پر خرچ ایک اقتصادی چیز ہے؛ وہ کہتے بھی ہیں کہ جب آپ ایک مرد کو تعلیم دیتے ہیں تو آپ ایک شخص کو تعلیم یافتہ بناتے ہیں لیکن جب آپ ایک عورت کو تعلیم دیتے ہیں تو آپ پورے خاندان کو تعلیم یافتہ بناتے ہیں۔ اس لیے عورتوں کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔ لیکن کچھ حد تک عورتوں کو بھی خود اپنی زبوں حالی کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے۔

ہماری دنیا میں خواتین رضا کارانہ تنظیموں کا رول

بیلا ربی :

یہ حقیقت کہ عورتیں بڑی آسانی سے حالات و ماحول کے سامنے سپر ڈال دیتی ہیں، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خواتین رضا کارانہ تنظیموں اور ترقیاتی رضا کارانہ تنظیموں کو عورتوں کو

اپنے حقوق وفرائض کے تئیں بیدار کرنے کے لیے کتنا اہم رول ادا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ انھیں عورتوں کو سیاست میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لینے کے لیے آمادہ کرنا ہے۔ حالانکہ بعض دفعہ عورتیں یہ سوچتی ہیں کہ ان کے لیے بعض مقامات مخصوص ہیں، جب کہ دیگر مقامات مردوں کے لیے مخصوص ہیں، میرے خیال سے تمام مقامات کو مضبوطی بخشنے کے لیے ان میں مردوں اور عورتوں کی حصہ داری ضروری ہے۔

عورتوں کو بااختیار نہیں بنایا جارہا ہے

اقبال :

میں اب بھی جنسی تفریق کا مشاہدہ کرتی ہیوں لیکن وقت تیزی سے بدل رہا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ والدین کی سوچ میں بھی تبدیلیاں آرہی ہیں۔ مسئلہ کا ایک پہلو، مثال کے طور پر پاکستان میں، یہ حقیقت ہے کہ بہت سے لوگ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیرون ممالک چلے جاتے ہیں۔ کبھی وہ اپنی کمائی ہوئی رقم گھر بھیجتے ہیں اور کبھی نہیں بھیجتے۔ اگر مرد اپنے گھر پر پیسہ بھیجتا ہے تو یہ اس کی بیوی اور بچوں کو جاتا ہے، ایسی حالت میں والدین خود کو الگ تھلگ محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلاتے ہیں اور جب وہ تعلیم یافتہ ہوجاتی ہیں تو والدین کہتے ہیں، ''بیٹا اسی وقت تک بیٹا رہتا ہے جب تک اس کو بیوی نہ مل جائے لیکن بیٹی تمام عمر بیٹی ہی رہتی ہے۔'' میں نے ایسی کئی عورتوں کو دیکھا ہے جو اب تعلیم یافتہ ہوچکی ہیں اور وہ اپنے والدین اور فیملی کی مدد کررہی ہیں، یہاں تک کہ اپنے بھائیوں کی بھی مدد کررہی ہیں جو کچھ بھی کرنا نہیں چاہتے۔

لہٰذا بڑا سوال یہ نہیں ہے کہ انھیں تعلیم نہیں دی جارہی ہے بلکہ انھیں خود مختاری نہیں حاصل ہورہی ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہیں، کمارہی ہیں، اور اپنی کمائی کا کچھ حصہ اپنے والدین اور ان بھائی بہنوں پر خرچ کررہی ہیں جو کچھ نہیں کررہے ہیں۔ اس کے بعد ریاستوں نے بھی

لائحۂ عمل بنانے شروع کردیے ہیں۔ میرے ملک میں، کم از کم اس وقت، حکومت یہ کررہی ہے کہ جس لڑکی کی حاضری اسکول میں 80 فیصد تک پہنچ جاتی ہے، اسے ہر مہینے ریاست کی طرف سے 2 یورو ملتے ہیں، جو کہ یہاں پر بھلے ہی ایک چھوٹی رقم محسوس ہوتی ہو لیکن ہمارے ملک میں اس کی بڑی اہمیت ہے، کم از کم اس رقم سے اس کے اسکول آنے جانے کا خرچ نکل جاتا ہے کیوں کہ کتابیں، یونیفارمس اور کھانے کا انتظام بھی لڑکیوں کے لیے اسکول کی طرف سے مہیا کرایا جارہا ہے۔

جہاں تک بیوی کو مارنے کا تعلق ہے : تو مقدس قرآن میں کہا گیا ہے کہ ''مرد عورتوں کے محافظ اور نگراں ہیں'' (سورۃ 4,34)۔ اور وہاں پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی کمائی میں سے کچھ حصہ ان کو دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ اب عورتیں بھی کمارہی ہیں، اگر کوئی مار کھاتا ہے تو وہ مرد ہیں، جو کچھ نہیں کرتے۔

نئے فیملی کوڈ کے ذریعے مراقش میں وسیع تبدیلیاں

بیلاربی :

اس وقت ہم جس موضوع پر گفتگو کررہے ہیں، اس کے بارے میں ابھی بہت کچھ کہا جانا باقی ہے۔ لیکن اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے میں مراقش میں نئے فیملی کوڈ کا ذکر کرنا چاہوں گی جو حال ہی میں بنایا گیا ہے اور جس کی وجہ سے بڑے پیمانے پر تبدیلیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں، یہ ایک بہت ترقی پسند طریقہ ہے جو خواتین اور مردوں کو فیملی میں یکساں حقوق فراہم کررہا ہے۔ اور یہ صحیح معنوں میں ایک انقلابی حصولیابی ہے۔

لیکن اس کوڈ کو کیسے نافذ کیا جاسکے گا، اسے تمام لوگ کیسے سمجھ پائیں گے اور کیسے قبول کریں گے؟ اس مقصد کو حاصل کرنے میں ہمیں ابھی اور وقت لگے گا۔

جب آپ ایک لڑکی کو تعلیم دیتے ہیں تو آپ پوری سوسائٹی کو تعلیم یافتہ بناتے ہیں

جیسا کہ یہ کہاوت ہے، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، کہ جب آپ ایک لڑکے کو تعلیم دیتے ہیں تو آپ صرف ایک آدمی کو ہی تعلیم یافتہ بناتے ہیں لیکن ''جب آپ ایک لڑکی کو تعلیم دیتے ہیں تو آپ ایک خاندان کو تعلیم یافتہ بناتے ہیں''، میں اس میں یہ تبدیلی کرنا چاہتا ہوں، ''جب آپ کسی مرد یا عورت کو تعلیم دیتے ہیں تو آپ معاشرہ کو تعلیم یافتہ بناتے ہیں۔'' اس کا مطلب ہے، میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ جب آپ ایک لڑکی کو تعلیم دیتے ہیں تو آپ ایک خاندان کو تعلیم یافتہ بناتے ہیں، بالفاظ دیگر، میں لڑکی اور خاندان کے درمیان اس تعلق کے نظریہ کو پسند نہیں کرتا۔ جب آپ ایک لڑکی کو تعلیم دیتے ہیں تو آپ پورے معاشرے کو تعلیم یافتہ بناتے ہیں۔

وسطی ایشیا میں مذہبی تعلیم

گوگا ابرار وش خید یا طوف

1. تاریخی پس منظر

8 ویں صدی میں عربوں نے امودریا اور سرحد یا ندیوں کے درمیان واقع وسطی ازبیکستان کے علاقوں کو فتح کیا اور وہاں کے آبائی لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا شروع کیا۔ عربوں اور اسلام کے خلاف لڑائی کا سلسلہ ایک لمبے عرصے تک چلتا رہا، یہاں پر اپنی حکومت قائم کرنے اور اسلام کو اقتداری مذہب بنانے میں عربوں کو دو سو سال لگ گئے۔ بخارا اسلامی دانشوروں کا مرکز بنا۔ اسے 'عظیم الشان بخارا' کہا گیا جو کہ اسلام کے ستونوں میں سے ایک ستون بنا۔ یہاں پر بہت سے اسلامی اسکول قائم کیے گئے اور بعض مشہور اسلامی دانشوروں کی تربیت یہاں ہوئی۔ اس سلسلے میں صرف البخاری کا ذکر کرنا ہی کافی ہے جنھوں نے احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا جس کی اہمیت کبھی ختم نہیں ہوئی۔ حدیث کے اس مجموعے کی بارہ جلدیں ہیں جو اسلامی ممالک کے ہر عقیدت مند مسلم گھرانے میں دیکھنے کو مل جائیں گی۔ انھیں اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا اسکالر تصور کیا جاتا ہے۔

امیر تیمور نے رہنما مذہب کے طور پر اسلام کے رول کو تقویت بخشی۔ ان کی تمام فتوحات میں اسلام ایک اصولی نظریہ بنا۔ تیمور کے وقت سے ہی اسلام مذہب کے علاوہ بھی بہت کچھ بنا۔ وسطی ایشیا میں یہ زندگی جینے کا ایک طریقہ بنا۔ اسلامی اماموں کو گورنروں اور حکمرانوں سے بخشش لینے کی اجازت تھی جس کی بدولت وہ باثروت زمیندار اور طاقت ور سیاسی قوت میں تبدیل ہونے لگے۔ بخارا اسلام کی بالادستی کا مظہر تھا۔ شہری اور دیہاتی علاقوں میں موجود ہزاروں مسجدوں اور مذہبی اسکولوں کی نگرانی کی جاتی تاکہ اسلامی روایات پر عمل کیا جا سکے اور قرآنی قوانین کو نافذ کیا جا سکے۔ 15 ویں صدی میں صوفی تحریک کی ایک نئی شاخ وجود میں آئی

جس نے اسلام کے اثر کو مزید پھیلایا۔ خاندانی زندگی، شاعری، موسیقی، ادب اور سیاست میں اسلام کی ترجمانی پوری سرگرمی سے کی گئی۔

2 روس کی فتح اور سوویت اقتدار

روس کے ذریعے وسطی ایشیا کی فتح اسلام کی تباہی کا باعث بنی۔ زار انتظامیہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس علاقے میں اپنی طاقت کو مجتمع کرتے وقت کوئی اور بھی طاقت اس کا مقابلہ کر سکے۔ یہ خبر گرم کر کے کہ پان اسلامزم اور پان ٹرکزم سے خطرہ منڈلا رہا ہے، روسی انتظامیہ نے اسلامی قوتوں کی مالی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا۔ اسلامی مذہبی پیشواؤں سے ان کی زمینیں چھین لی گئیں اور انھیں ایک مفلوک الحال تنظیم میں تبدیل کر دیا گیا جو صرف رضا کارانہ طور پر حاصل ہونے والے عطیوں پر قائم تھی۔ زار انتظامیہ نے تمام پڑوسی ایشیائی ممالک سے ملنے والی سرحدوں کو بند کر دیا اور مقامی مسلمانوں کے ان کے غیر ملکی مسلم بھائیوں کے ساتھ مذہبی رشتوں کو ختم کر دیا۔ اسلامی پیشواؤں کو ان کے اعلیٰ مناصب سے ہٹا دیا گیا اور انھیں نوآبادیاتی حکومت کا خادم بنا دیا گیا۔

بعد میں سوویت پاور نے اپنے لامذہبی اصولوں کی بنیاد پر اسلام کے بارے میں یہ اعلان کر دیا کہ وہ اس کا نظریاتی دشمن ہے اور اس کو پوری طرح تباہ و برباد کرنے کے لیے جنگ کا اعلان کر دیا۔ ہزاروں مساجد کو مسمار کر دیا گیا اور ان مقامات کو کلبوں میں منتقل کر دیا گیا جہاں سے لامذہبی پروپیگنڈے کیے جاتے۔ تمام اسلامی اسکولوں کو بند کر دیا گیا اور مذہبی رسومات پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کے باوجود سوویت ڈکٹیٹرشپ اسلام کو شکست نہیں دے سکی۔ اسلام زیر زمین ہو گیا اور 'خاندانی مذہب' میں تبدیل ہو گیا، یعنی شہریوں کا نجی معاملہ بن گیا۔ یہ باقی رہا، یہ طریق زندگی بنا، ثقافتی زندگی پر اسی کی حکمرانی رہی جس کے ذریعے ملک کی روحانی ترقی ہوتی رہی۔ سوویت حکومت نے اسلام کو عالمگیر سوویت اقتدار، اس کے تعلیمی

نظام، یوروپی کلچر اور روسی روحانی زندگی سے بدلنے کی کوشش کی، لیکن اسلام باقی رہا اور اس بکواس جنگ میں اسے فتح بھی حاصل ہوئی۔

3. دوسری عالمی جنگ کے بعد ہونے والی تبدیلیاں

دوسری عالمی جنگ نے مذہب کے معاملے میں اور خاص کر اسلام کے معاملے میں سوویت ریاست کی پوزیشن میں زبردست تبدیلی پیدا کی۔ جنگ کے دوران اور مصیبت کی گھڑی میں، یعنی 1943 میں فوجی کارروائیوں اور گھریلو سطح پر مسلمانوں کی اس جنگ میں شرکت نہایت ضروری بن گئی۔ وسطی ایشیا کے مفتیات کی تخلیق ہوئی، نئی مسجدیں کھولی گئیں اور ہٹلرازم کے خلاف اس جنگ میں، اور مسلمانوں کی اس وطن پرست تحریک میں اسلام ایک بار پھر ایک روحانی منتظم بنا۔ میر عرب کے نام سے ایک نیا اسلامی اسکول بخارا میں کھولا گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سوویت حکومت نے عرب ممالک میں اپنا اثر و رسوخ پھیلانے کے لیے اسلام کو استعمال کیا۔ سیکڑوں طلبا کو مختلف اسلامی اسکولوں میں بھیجا گیا، جیسے الاظہر، مراقش اور عمان کے اسکول، تاکہ مذہبی دانشوروں کی ایک ایسی نسل تیار کی جا سکے جو سوویت حکومت کے فرمانبردار ہوں۔ انھیں 'ریڈ ملا' کہا جاتا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ پختہ مسلمان تھے۔ لیکن ساتھ ہی سوویت حکومت کی خدمت بھی کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے مشرقی عرب میں سوویت یونین کے اثر و رسوخ کو مضبوطی عطا کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ 1955 میں سوئیز نہر کا بحران پیدا ہونے سے قبل مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے ازبیکستان کا دورہ کیا۔ وہ مسجدوں کی تعداد، مذہبی پیشواؤں کی ٹریننگ اور مساجد کی خوبصورتی کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اس وقت کے وسطی ایشیا کے مسلمانوں کے مفتی، ایشان بوبوخم اور ان کے صاحبزادے ضیاء الدین بوبوخم کے ساتھ ہونے والی ان کی گفتگو نے 'ناصرازم' کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا اور اس کے بعد ناصر بھی سوویت یونین کے حامی بن گئے۔ اسلام کا استعمال سوویت سوشلزم کی بہترین مثال

کے طور پر ہونے لگا، ساتھ ہی اسلام ملک کی سماجی زندگی میں نیا رول ادا کرتے ہوئے تیزی سے پھیلنے لگا۔ لہٰذا اس وقت اس عمل کو روکنا نہایت مشکل تھا۔

4. ازبکستان کی آزادی، اسلامی اقدار کا پھیلاؤ اور اسلامی سیاست کاری کا رجحان

1991 میں ازبکستان کے ذریعے آزادی کا اعلان کر دیے جانے کے بعد اسلامی ترقی کے عمل کے کثیر مواقع ہاتھ لگے جس کی وجہ سے اسلام کا اثر نہ صرف سماجی زندگی پر پڑنے لگا بلکہ ملک کی سیاسی زندگی پر بھی۔ ازبکستان کے پہلے صدر تھے اسلوم کریموف، یعنی اسلام کریم یا مقدس اسلام۔ وہ ایک کمیونسٹ تھے اور سابق کمیونسٹ ری پبلک کے سرفہرست نمائندہ۔ لیکن انھوں نے معاشرہ اور ریاست کی روحانی تجدید میں مذہب کے اہم رول کو محسوس کیا۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انھوں نے بہت سے فیصلے کیے۔ آزادی حاصل کرنے کا عمل، لوگوں کو متحد کرنے کا عمل اور صحیح اسلامی اقدار کو پھیلانے کے لیے بھی انھوں نے اسلامی تعلیمات کا سہارا لیا۔ لوگوں کو ہر سال حج اور عمرہ کرنے کے لیے ریاست کی طرف سے رعایات دی جانے لگیں اور طیاروں کا انتظاموں کیا جانے لگا۔ سیکولر اور مذہبی تعلیمات پر مبنی مسلم پیشواؤں کی ایک نئی کھیپ تیار کرنے کے لیے سیکڑوں نئے مدرسے کھولے گئے، ہزاروں مسجدیں تعمیر کی گئیں اور اسلامی دانشوروں کو مسلم ممالک میں بھیجا گیا۔ بخارا ایک بار پھر اسلامی دینیات کا شاندار مرکز بن گیا۔

اسلامی تعلیمات فراہم کرنے کے لیے نئے ذرائع مختص کیے گئے اور نئی تاریخ رقم کی گئی جس میں ازبکستان کے ذریعے اسلام کے نفاذ اور فروغ کا ذکر کیا گیا۔ پہلی بار نقش بندی (متوفی 1389)، البخاری (متوفی 870) اور المرغنانی (متوفی 1197) جیسے بڑے اسلامی دانشوروں کی برسی دھوم دھام سے منائی جانے لگی۔ ان کے نام ازبکوں کے دل و دماغ پر ثبت ہونے لگے۔ اس کے علاوہ تاشقند میں ایک اسلامی یونیورسٹی قائم کی گئی جہاں پر عربی زبان

کے سیکڑوں ماہرین اسلامی موضوعات، عربی زبان اور مسلم تہذیب کا درس دیتے ہیں۔

لیکن ایک ناگہانی چیز واقع ہوئی۔ لوگوں کے بہت سے گروہ، جو کہ موجودہ حکومت سے مطمئن نہیں تھے، انھوں نے اقتصادی بحران کا فائدہ اٹھانا شروع کیا اور اپنے سیاسی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے اسلام کا سہارا لینا شروع کر دیا۔ میرے خیال سے جدید معاشرے میں مذہب کو ریاست سے علاحدہ کر دینا چاہیے اور موجودہ حکومت کا تختہ پلٹنے کے لیے چلائی جارہی سیاسی سرگرمیوں میں مذہب کو شامل نہیں ہونا چاہیے۔ پڑوسی ملک افغانستان میں چل رہی طالبان تحریک نے ازبکستانی سیاست میں اسلام کی مزید شمولیت پر اثر ڈالا ہے۔ ایسی کئی نئی سیاسی تنظیمیں منظر عام پر آئی ہیں جنھوں نے اسلامی پرچم کا استعمال کرنا شروع کر دیا ہے، حالانکہ ان کے بہت سے لیڈر مسلم مذہب کے بارے میں جانتے تک نہیں۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ شدت پسند غیر ملکی اسلامی تنظیموں نے سیاسی حالات کو خراب کرنے کے لیے ازبکستان کو وسطی ایشیا میں اپنی بنیاد کے طور پر کیسے استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا مقصد ازبکستان میں اسلامی خلافت قائم کرنا تھا۔

بہت سی سیاسی پارٹیاں، جیسے 'حزب التحریر الاسلامی'، 'اسلام لشکر لاری'، 'طوبی'، 'اسلامک رینا ساں پارٹی' اور وہابی تحریک ازبکستان میں وجود میں آئیں۔ اکے پروگرام اور مقاصد 'مسلم برادر ہوڈ' اور 'بعث پارٹی' جیسی مسلم سیاسی تنظیموں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ازبکستان میں 1995-2005 کے دوران پیچیدہ حالات پیدا ہو گئے تھے۔ پروپیگنڈہ پھیلانے والی اور دہشت گرد تنظیمیں افغانستان اور پاکستان کے فوجی کیمپوں سے تربیت حاصل کر رہی تھیں۔ اردن سے آنے والے بہت سے عربوں نے ازبکستان کے علاقائی مدرسوں میں داخلہ لے لیا اور خلافت قائم کرنے کے نظریہ کو پھیلانا شروع کر دیا۔ یہاں بھی اسی طرح کے دہشت گردانہ حملے ہونے لگے جیسے کہ آج کل عراق اور پاکستان میں ہو رہے ہیں۔

5. ازبیکستان : ایک کثیر اعتقادی ملک

ازبیکستان ایک کثیر اعتقادی ملک ہے اور برسر اقتدار حکومت تمام مذاہب اور عقائد کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتی ہے؛ ہر مذہب اور مسلک کے لیے ان کی مذہبی عبادتوں کے شرائط طے کیے گئے ہیں۔ ازبیکستان میں اس وقت 16 مذاہب اور مسلک کے ماننے والے افراد ہیں۔ دو مذاہب سب سے طاقت ور ہیں، اسلام اور روسی آرتھوڈاکس چرچ۔ اسلام کے دو مراکز ہیں: تاشقند اور بخارا۔ تقریباً دو ہزار تنظیمیں اور گیارہ اسکول ہیں۔ روسی آرتھوڈاکس چرچ کا مرکز تاشقند میں ہے۔ 31 علاقائی تنظیمیں ہیں، ایک Seminary اور تین Monasteries ہیں۔ ایوانجیلسٹ کے ذریعے چلائے جانے والے کئی اسکول ہیں۔ رومن کیتھولک چرچ کا مرکز تاشقند میں ہے اور اس کی چار علاقائی تنظیمیں ہیں۔ تاشقند کے مرکز میں پولش کیتھولک چرچ کی ایک شاندار عمارت ہے جو کہ کیتھولک رسومات، جیسے بپتسمہ اور شادی کی تقریبات کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ کوریائی پروٹیسٹینٹ چرچ کا بھی اثر ورسوخ بڑھ رہا ہے جس کی 61 علاقائی تنظیمیں ہیں۔ یہودیت کا بھی یہاں ایک مقام ہے اور پورے ازبیکستان میں کل 7 سائنوگاگ (یہودی عبادت گاہیں) ہیں۔

مذہبی رواداری کسی بھی ملک کی بنیادوں میں سے ایک ہوتی ہے۔ ازبیکستان میں مذہبی اختلافات کی بنیاد پر کبھی بھی کوئی فساد نہیں ہوا ہے لیکن حالیہ دنوں میں شدت پسند اسلامی تنظیموں اور ان کے دورِ وسطیٰ سے میل کھاتے نظریات اور جارحانہ فطرت کے منظر عام پر آنے سے متعدد مذہبی گروہوں اور ان کے نمائندوں کے درمیان موجود پرامن رواداری کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ آرتھوڈاکس Seminaries میں ازبیک زبان لازمی ہے، جب کہ اسلامی اسکولوں میں روسی زبان لازمی ہے۔ اسکولوں کے نصاب میں مذہبی تعلیم کے ایک نئے موضوع کو شامل کیا گیا ہے جس کے تحت طالب علموں کو مختلف مذاہب وعقائد، ان کی تاریخ، پس منظر اور

دنیاوی تہذیب کے ڈھانچے میں ان کے رول سے متعارف کرایا جاتا ہے۔

اسلامی شدت پسندی کے خلاف نہ صرف یہ کہ سخت رویہ اپنایا جانا چاہیے بلکہ اس لڑائی میں بیداری اور تعلیم کو بھی مرکزی کردار ادا کرنے دینا چاہیے۔ صدر کریموف کی ایک ڈگری کے مطابق کابنی وزرا کے ہاتھوں 7/اپریل 1999 کو تاشقند میں ایک اسلامی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کا خاص مقصد اسلامی تعلیم، اس کی تاریخ، شریعت اور فقہ کے میدان میں اعلیٰ تعلیم سے بہرہ مند ماہرین تیار کرنا ہے۔ اس کے تمام فیکلٹی ممبرس (اساتذہ) الاظہر یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرتے ہیں یا پھر مراقش، لبنان یا اردن سے۔

یونیورسٹی کے نصاب میں درج ذیل موضوعات شامل ہیں لیکن یہ نصاب ان ہی موضوعات تک محدود نہیں ہیں : دینیات، اسلامی تعلیمات، شریعت، بین الاقوامی اقتصادی روابط، کمپیوٹر سائنس، نیچرل سائنسز، جمہوری معاشرہ کی تشکیل کی تھیوری اور پریکٹس، فلسفہ، مشرقی لسانیات (عربی، فارسی)، انگریزی زبان اور فزیکل ٹریننگ۔

ڈپارٹمنٹ آف اسلام اسکالری ریسرچ میں درج ذیل موضوعات فراہم کیے جاتے ہیں : القرآن اور تفسیر، الحدیث، اسلامی تاریخ اور فلسفہ، شریعت، اور اسلامی تہذیب اور دنیاوی تہذیب میں اس کا ثقافتی تعاون۔

یونیورسٹی کی ایک بڑی لائبریری ہے جہاں پر قدیم اسلامی مخطوطات رکھے ہوئے ہیں جس سے طالب علموں کو اسلام کی بنیادی ترقی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یونیورسٹی کے لیے فخر کی بات 7ویں صدی میں حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھوں سے لکھا ہوا قرآن کا ایک قلمی نسخہ ہے۔

یہاں سے گریجویٹ کی ڈگری حاصل کرنے والی پہلی کلاس 2003 کی تھی، اس کے گریجویٹ پروقار نوکریاں حاصل کرتے ہیں، ان میں سے بہتوں کو غیر ممالک میں موجود ازبیکستان سفارت خانے میں ڈپلومیٹ کے طور پر بھی بھیجا جاتا ہے۔

سوالات و مداخلات

مدرسین کی نئی نسل کہاں سے آرہی ہے؟

شبستری :

اپنے مقالے میں پروفیسر خیدیاطوف نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ ازبیکستان کی یونیورسٹیوں میں اسلامی تعلیمات کا بھی انتظام ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان مدرسین کی نئی نسل آخر آتی کہاں سے ہے، ازبیکستان میں اسلامی درس دینے میں مشغول یہ لوگ سائنسی تعلیم کہاں سے حاصل کرتے ہیں، اپنے ہی ملک سے یا پھر کسی غیر ملک سے، اور اگر جواب موالخرالذکر ہے تو کس ملک سے؟

دیگر اسلامی ممالک کے ساتھ مختلف رشتے

خیدیاطوف :

دیگر اسلامی ممالک کے ساتھ رشتے بعض دفعہ کڑواہٹ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ سابق کمیونزم اس کی اہم وجہ تھی۔ مثال کے طور پر ابتدائی دور میں میں ایک مذہبی اکادمی میں استاد تھا اور جہاں پر آدھے طلبا چیچنس تھے۔ اور آج چیچنس کے بارے میں ہمیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ خاموشی کے ساتھ کمیونزم کو تمام عرب ممالک میں پھیلانے کے لیے ان کو استعمال کیا جارہا ہے۔ اس طرح اسلام کو بعض دفعہ تباہی کے ایک ذریعہ کے طور پر استعمال کیا گیا لیکن یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ ہم نے مزاحمت کا راستہ کیوں اختیار کیا۔ لیکن ان دنوں طاقت کے توازن کے اندر رہتے ہوئے آخری فیصلہ کا حق ماسکو کے پاس تھا۔

حدیث کے ذریعے اسلامی روایات

دوسری جانب روس میں بہت سے عظیم مسلم دانشور گزرے ہیں۔ انھوں نے قرآن کا

ترجمہ روسی زبان میں کیا اور ہم نے اسے ازبیک میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کام بہت مشکل ثابت ہوا کیوں کہ قرآنی نظریات و خیالات اور مشمولات کو ظاہر کرنے والے الفاظ ہماری زبان میں نہیں ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے اسلامی درس میں حدیث، حضرت عائشہؓ کی حدیث، بخاری، ترمذی اور دیگر ماخذ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اسلام کے مخصوص نظریات و خیالات کی دنیا میں داخل ہونے اور اسلامی روایات کے بارے میں سوچنے کا یہ بہترین طریقہ ہے، لغوی معنی میں ہی نہیں بلکہ صحیح معنوں میں۔ میرے خیال سے قرآن اور اسلامی تعلیمات میں اصل نکتہ ان کے اندرونی معنی ہیں۔ لہٰذا یہ ہمارے لیے ایک المیہ ہے کہ لاکھ کوششوں کے باوجود قرآن کو ازبیک زبان میں ترجمہ کرنا ممکن نہ ہوسکا کیوں کہ جدید ازبیک میں آپ کو وہ خیالات و تصورات نہیں مل پائیں گے جو 7 ویں صدی میں عثمانؓ کے زمانے میں رائج تھے۔

ہماری اسلامی یونیورسٹی میں مذہبی تعلیم کو اولیت

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سعودی عرب جیسے ملک کے ہمارے مراسم خوشگوار ہیں۔ حج اور عمرہ میں شرکت کرنے میں مدد پہنچانے کے لیے ہماری حکومت لوگوں کے لیے مفت ٹرانسپورٹ کا انتظام کرتی ہے۔ لہٰذا، میرے خیال سے مذہبی پیشوا کو جدید علوم سے بہرہ مند کرنا نہایت ضروری ہے۔ اماموں اور خطیبوں پر بھی یہ بات صادق آتی ہے؛ ان تمام افراد کی تعلیم اسلامی یونیورسٹی میں ہونی چاہیے تاکہ وہ اپنی زندگی میں ایک سیکولر اور سوچنے کے خدائی طریقے کو اختیار کرسکیں۔

وسطی ایشیا کے ساتھ روس کے شاندار تاریخی رشتے

خضر :

میں روس کا حمایتی نہیں ہوں لیکن وسطی ایشیا کے مسلمانوں اور روسیوں کے درمیان

رشتوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے یہ جاننا ہوگا کہ روس پر 200 سال تک مسلم تاتاریوں کا قبضہ تھا، اور کافی جدوجہد کے بعد روس کو آزادی نصیب ہوئی۔ دوسری بات ہمیں یہ ذہن نشیں کرنی ہوگی کہ روس اور ترکی نے ایک دوسرے پر حملہ کیا۔ یہ تذبذب کہ 'دولت عثمانیہ' ایک طرف خلافت کا مرکز تھی اور دوسری طرف اسلام کا، اس سے بڑی مشکلیں پیدا ہوئیں۔ روس کی طرف سے ان احساسات کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس، وسطی ایشیا کے لوگوں کے لیے روسی لوگ مغرب کی نمائندگی کرتے ہیں حالانکہ یہ لازمی طور پر درست نہیں ہے۔ ہم اس بات کو درکنار نہیں کرسکتے کہ یہ ایک رومن کیتھولک تھا جس نے سویڈن کے لوگوں کو روس کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا۔ لہٰذا روس کے لوگوں کے دوسرے افراد کے خلاف غصے کو اور ان کے ذاتی دفاع کے جذبے کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہے جنھوں نے ایک لمبے عرصے تک ان کے آبائی وطن پر قبضہ جمائے رکھا۔

مسلمانوں کے ساتھ عیسائی عربوں کی ہمدردی

دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ اس کی ایک نفسیاتی وضاحت یہ ہے کہ روسی باشندے خود کو قسطنطنیہ کا وارث سمجھتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کی روشنی میں ماسکو کو تیسرے روم کی شکل میں دیکھنا چاہیے جب کہ قسطنطنیہ کو دوسرا روم کہا جاتا ہے۔ اس طرح ایسے بہت سے تاریخی حقائق اور ان سے منسلک جذبات ہیں جن کی وجہ سے روسی افراد کا رویہ منفی دکھائی دیتا ہے۔

عیسائی عرب ہونے کے ناطے ہم لوگ فرانس اور روس جیسے سابق عیسائی ممالک کی احساس برتری کا شکار ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے تئیں معاندانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ عیسائی عرب ہونے کے ناطے ہم ان احساسات سے اتفاق نہیں کرسکتے: ہم خود کو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کا دوست سمجھتے ہیں بلکہ انھیں اپنا بھائی بھی مانتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب میں تریپولی میں موجود اپنے گھر جاتا ہوں، جو کہ سنیوں کا شہر ہے، تو عام طور پر میں اپنی گھڑی نہیں

دیکھتا کیوں کہ میرا گھر 'مسجد الدعوۃ' کے قریب ہے اور مجھے اذان کی آواز سے وقت کا پتہ چل جاتا ہے۔ اسی طرح جب رمضان کا مہینہ قریب آتا ہے تو ہمیں کافی خوشی حاصل ہوتی ہے کیوں کہ اس مہینے میں ہم اپنے مسلم بھائیوں کے ساتھ جمع ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر کھاتے ہیں۔ ہمیں ان کی دعوتوں کا انتظار رہتا ہے۔ اس طریقے سے میں نے ایک مجموعی تصویر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے نہ کہ روس کے رویے کو صحیح ٹھہرانے کی۔

ایک شاندار سائنسی روایت لیکن عملی طور پر کشیدہ تعلقات

خیدیا طوف :

عمومی طور پر روس کا اسلام کے ساتھ بہت اچھا رشتہ ہے لیکن وہ قرآن کے صحیح استعمال کو اس لیے ناپسند کرتے ہیں کیوں کہ یہ خود ان کے اصولوں کی نفی کرتا ہے۔ روسیوں نے عربی اور اسلامی تعلیمات کی ایک عالمگیر سائنسی روایت قائم کی ہے لیکن اسلامی ممالک کے ساتھ ان کا حقیقی رشتہ ان کے الگ برتاؤ کو ظاہر کرتا ہے۔

کیا سوویت یونین کے زوال کے بعد تعلیم کا معیار کم ہوا ہے؟

اقبال :

میں دو سوال کھڑا کرنا چاہتا ہوں : میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ سوویت یونین کے زوال اور ازبکستان کی آزادی کے بعد تعلیم کا معیار گھٹا ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو تعلیمی معیار میں کتنی کمی آئی ہے؟

کیا روسی زبان اور سیریلک رسم الخط کا استعمال اب بھی ہو رہا ہے؟

اس کے علاوہ میں یہ بھی محسوس کرتی ہوں کہ جب روس نے ازبکستان کو اپنے قبضہ میں لیا تھا تو فارسی کی جگہ سیریلک رسم الخط کو اپنا لیا تھا۔ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد کیا سیریلک رسم الخط کا استعمال اب بھی ہو رہا ہے اور تعلیم کس زبان میں دی جاتی ہے، روسی یا ازبیک میں؟

موزوں رسم الخط کی لمبی تلاش

خیدیاطوف :

سوویت حکومت کے دوران ہم نے مذہبی پیشواؤں کو میر عرب اکیڈمی میں تعلیم دی، جہاں پر میں ایک استاد ہوا کرتا تھا۔ چونکہ اس وقت ہر علاقے میں صرف ایک مسجد ہوا کرتی تھی اور طلبا کی تعداد بھی کم ہوا کرتی تھی، اس لیے یہ اکیڈمی ہی کافی تھی۔ لیکن اس وقت کے حالات کے برعکس آج پورے ملک میں 2 ہزار سے زائد مدرسے ہیں۔

فی الحال کون سا رسم الخط رائج ہے؟ اس سلسلے میں ہمیں یہ بات یاد رکھنی ہوگی کہ عربی کے حروف ترکی زبان کے لیے مناسب نہیں ہیں۔ 19 ویں صدی میں آذربائیجان کے لوگ عربی حروف کو ہٹانا چاہتے تھے۔ اکتوبر کے انقلاب کے بعد سوویت حکومت نے درج ذیل تجربے کروائے۔ ایک مقام پر انھوں نے دو اسکول کھولے — ایک اسکول عربی حروف کے ساتھ اور دوسرا اسکول لاطینی حروف کے ساتھ۔ 90 فیصد والدین نے اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں بھیجا جہاں لاطینی حروف متعارف کرائے گئے تھے۔ آخرکار مسلم مواخات کی تمام کڑیوں کو توڑنے کے لیے سیریلک رسم الخط کو رائج کیا گیا۔ لیکن سیریلک رسم الخط بھی ہماری ازبیک زبان کے لیے بالکل اجنبی ہے۔

آخرکار ازبیک زبان کے لیے لاطینی حروف کو اپنایا گیا

لہٰذا 1955 سے آغاز کر کے اور 2006 تک کے خاتمہ تک ہر چیز کو لاطینی حروف میں بدل دیا گیا۔ ترکی زبان نے، خاص کر مصطفیٰ کمال اتاترک کے زمانے میں، بڑی تیزی سے لاطینی حروف کو اپنا لیا لیکن یہ حروف درحقیقت عثمانی زبان میں متعارف کرائے گئے جہاں ہم ایک مختلف ترکی زبان کا استعمال کرتے ہیں؛ لیکن ہم نے بہت جلد یہ محسوس کیا کہ یہ ترکی لاطینی حرف ہمارے حرف کے لیے مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا دس برس تک ہم نے لاطینی حروف کا مطالعہ کیا تاکہ ازبیک زبان میں ان کے استعمال کا پتہ لگایا جا سکے۔

قابل احترام قدیم روایت اور جدیدکاری کی ضروری

خوری :

اسلامی ادارے اور مسلم اسکالرس کیا شاندار ماضی کی مشہور روایات کا حوالہ دیتے ہیں؟ اس کے علاوہ کمیونسٹ حکومت کے خاتمہ کے بعد موجودہ دنیا کی جدید طرز زندگی کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے شریعت یا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کیا وہ نئے راستے پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں؟

معاشرے کا اسلامائزیشن یا اسلام کا سیکولرائزیشن؟

خیدیاطوف :

دوسرے سوال کا جواب دینے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ازبیکستان میں جدیدکاری کا عمل سیکولر سوسائٹی کے اسلامائزیشن میں پوشیدہ ہے جب کہ دوسرے لوگ اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ یہ عمل اسلام کا سیکولرائزیشن کر دے گا۔ اگر آپ 100 لوگوں سے اس بارے میں سوال کریں گے اور ان کی رائے جاننے کی کوشش کریں گے تو آپ کو 100 الگ الگ جواب ملیں گے۔ اسی لیے اسلامی یونیورسٹی قائم کی گئی۔

لہٰذا اسلامی یونیورسٹی کا ہر کورس اور ہر سبق عربی زبان میں ہے۔ یہاں کی یہی صورت حال ہے کیوں کہ ہمارے ملک میں بہت سے عربی اسکول ہیں اور آپ اسلامی یونیورسٹی میں اس وقت تک داخلہ نہیں لے سکتے جب تک کہ آپ ان میں کسی ایک اسکول سے پاس نہ ہوں۔

بشتیہ :

میں نے یہی تاثر حاصل کیا کہ پروفیسر خیدیاطوف کی تاریخ میں گہری دلچسپی ہونے کی وجہ سے موجودہ حالات کے بارے میں ان کا نظریہ بالکل درست ہے بلکہ اس سے مقامی حالات کا بھی صحیح پتہ چلتا ہے۔ اور یہی وہ نظریہ فکر ہے جو بغیر کسی شک وشبہ کے اس گول میز

کانفرنس میں ہمارے مذاکرہ کو تقویت بخشتا ہے۔

سماجی اور تعلیمی میدان میں سوویت کی پیش قدمی کیا اسلام اس وراثت کو قبول کرتا ہے؟

گیبریل :

پروفیسر خید یاطوف 70 یا 80 سال کی جابرانہ سوویت حکومت کا ذکر کر رہے تھے۔ یہ وہ دور تھا جس کی تعلیم اور سماجی نظام کے متعلق بعض مثبت پہلو بھی تھے۔ میں پروفیسر خید یاطوف سے دو سوال پوچھنا چاہتا ہوں : ایک تاریخ نویس کے طور پر آپ اس نظریاتی ماضی سے کیسے نمٹیں گے اور آپ ان اداروں سے کیسے نمٹیں گے جسے کمیونزم نے تعلیم کے میدان میں چھوڑا ہے اور پبلک ہیلتھ کیئر کے میدان میں چھوڑے گئے اداروں سے بھی؟ کیا ایسے اسلامی ادارے موجود ہیں جو اس وراثت کو قبول کرنے کو تیار ہیں؟ ایک بار پھر ہمیں مابعد کمیونسٹ ممالک سے یہ بات سننے کو مل رہی ہے کہ بچوں سے متعلق بڑے سماجی مسائل ہیں جو کمیونسٹ دور حکومت میں سماجی اداروں میں زندگی بسر کر رہے تھے اور اب وہ گلی کوچوں میں گھومنے پر مجبور ہیں کیوں کہ ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

اسلام ایک لچکدار مذہب ہے اور وہ کسی بھی معاشرے میں اپنی راہ تلاش کر لیتا ہے

خیدیاطوف :

اسلام ایک نہایت لچکدار مذہب ہے اور کسی بھی حکومت کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکتا ہے۔ وہ کسی بھی دستیاب معاشرے میں اپنی راہ تلاش کر سکتا ہے۔ اور اسلام کے لیے یہ ہمیشہ اہم رہا ہے کہ وہ لوگوں کی روح اور پسند کے مطابق راہ تلاش کرے۔ جیسا کہ پہلے کہا

گیا، سوویت حکومت کے دوران اسلام ایک خاندانی مذہب بن گیا تھا۔ مثال کے طور پر میرے والد ایک کمیونسٹ تھے لیکن گھر پر وہ ایک مسلمان تھے۔ یہ واقعی ایک پیچیدہ حالت تھی۔

روسی مارکسزم کے تحت، کمیونزم کسی بھی دوسرے نظریہ کا سخت مخالف تھا اور اسی لیے ایک لمبے عرصے تک اسلام کا بھی سخت دشمن رہا۔ 1943 تک سوویت حکومت اسلامی طرز فکر سے لڑتی رہی لیکن اس کے بعد اسلام جزوی طور پر وطن پرستانہ جنگ کا ایک حصہ بن گیا۔ اور دوسری عالمی جنگ کے بعد اسلام عرب دنیا میں داخل ہونے اور اسے کمیونزم سے متاثر کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ ظاہر ہے، یہ عرب مالک کے لیے بہت خطرناک تھا۔ مثال کے طور پر صدام حسین اس وقت ماسکو میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور روسی زبان پوری چابک دستی سے بولتے تھے؛ وہ بغداد میں سرگرم KGB (روسی خفیہ ایجنسی) کے بہت سے لوگوں کو جانتے تھے۔

ایسے وقت میں، کمیونزم کے لیے یہ نہایت اہم تھا کہ وہ اس سمت میں اپنے اثرات کو پھیلائیں اور صحیح معنوں میں کمیونزم پر یہی وہ دباؤ تھا جس نے اسلام کے تئیں اس کے رویے میں تھوڑی نرمی پیدا کی۔ جس وقت سوئیز نہر کو قومیانے کی بات چل رہی تھی اور مغربی طاقتوں نے جمال عبدالناصر پر پابندی عائد کر رکھی تھی اس وقت سوویت حکومت نے ان کی حمایت کی۔ اور جب سوویت سفیر نے کرنل ناصر سے بینڈنگ میں ملاقات کی، اس وقت سوویت کے لوگوں نے اسلام کے تئیں اپنی چال بدل لی، صرف ازبکستان میں ہی نہیں بلکہ عالمی پیمانے پر۔ اسلامی تعلیمات کے مطالعے کے لیے دو بین الاقوامی مراکز ہیں : آکسفورڈ اور ماسکو۔ سوویتس نے اسلام کے ساتھ اپنے رشتوں میں کافی لچک دکھائی۔ مثال کے طور پر کمیونسٹ حکمرانوں نے پہلے جنرل ناصر کو منظوری نہیں دینی چاہی لیکن بعد میں انھوں نے محسوس کیا کہ یہ ان کی ایک غلطی تھی اور اس کے بعد انھوں نے عرب لیڈروں کے ماسکو آنے کی دعوت دینی شروع کر دی۔ اس سے اسلام کا سوویت حکومت کے ساتھ منفی تجربہ ہوا لیکن ساتھ ہی اسلام نے بعض مثبت چیزوں کا بھی مشاہدہ کیا۔

مذہبی تعلیم اور تشخص

محمد مجتہد شبستری

میرے مقالہ کا عنوان ہے ''مذہبی تعلیم اور شناخت''۔ اس سلسلے میں میں درج ذیل نقطوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں :

1. کیا ہم ایک طرف مذہبی تعلیم اور دوسری طرف ذاتی اور سماجی شناخت کے درمیان رشتوں کے بارے میں سوچ سکتے ہیں؟ اس سوال کا جائزہ لینے کے لیے میں سب سے پہلے شناخت کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ شناخت خود کو ایک سماجی شرط، تاریخی نظریہ کے طور پر پیش کرتی ہے جو کہ جدید دور میں منظر عام پر آیا ہے۔ ہم معاشرتی یا ذاتی شناخت کے بارے میں بات کرتے وقت معاشرہ یا فرد کے تعلق سے دو تاریخی تحریکوں کو مدنظر رکھتے ہیں، یہ دونوں تحریکیں اس شخص یا معاشرہ کے پرانے یا موجودہ حالات ہیں۔ اس لیے اس شناخت کی جانچ کا مطلب ہے یہ پتہ لگانا کہ ہم ماضی میں کیا تھے اور اب کیا ہیں۔

2. ہم لوگ شناخت کے بارے میں اس وقت بات کرنا چاہتے ہیں جب فطری لاشعوری شناخت سماجی یا ذاتی میدان میں تبدیلیوں کے ایک سنگین مسئلہ سے دوچار ہو۔ ایسی حالت میں معاشرے یا افراد اپنے آپ کو دوسری اشیا سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان اشیا کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کرسکیں۔ ظاہر ہے، اپنی یہ تعریف اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب 'دوسری چیز' کی بھی تعریف کی جاچکی ہو۔

3. لیکن مذہبی تعلیم سے ہماری مراد کیا ہے؟ مذہبی تعلیم کے دو الگ معنی ہوسکتے ہیں۔ ایک معنی تو وہ کوشش ہوسکتی ہے جس کا مقصد بچوں کو کسی ایک مذہب کے عقیدوں اور اصولوں کی طرف مائل کرنا اور مخصوص مذہبی رسوم و رواج سے واقف کرانا ہے۔ اس طرح کی تعلیم

ہمارے دور میں اور جدید اور نصف جدید معاشروں میں کامیاب نہیں ہوگی کیوں کہ جدید دور میں بار بار علمی اور سماجی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں جو مذہبی عقیدوں، اصولوں یا پابندیوں کی وضاحت کے استحکام میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں اور لوگوں کو بار بار اپنے مذہب کی نئی تعبیر و تشریح پیش کرنے کے لیے آمادہ کرتی ہیں، جس کا موازنہ اگر پہلے کی تعبیر و تشریح سے کیا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ بدعت ہے۔ اگر مذہبی تعلیم ایسے دی جاتی ہے تو ہم یہ امید ہرگز نہیں کرسکتے کہ اس کی بنیاد پر کسی بھی فرد واحد کے اندر ذاتی شناخت پیدا ہوسکتی ہے کیوں کہ ان مسلسل تبدیلیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مذہبی شناخت کی پائیداری کو ہمیشہ خطرہ لاحق ہوگا۔

لیکن مذہبی تعلیم کے دوسرے معنی بھی ہوسکتے ہیں۔ ہم بچوں کو اس طرح تعلیم یافتہ بنا سکتے ہیں کہ انھیں دنیا کے تئیں مذہبی روحانی نظریہ فکر کا تھوڑا بہت علم ہوجائے تاکہ وہ خدا کے سامنے دنیا کے ایک راز کے طور پر کھل سکیں اور سچائی کی زبردست خواہش کا تجربہ کرسکیں۔ ہم لوگ بچوں کو اس طرح کی فطرت سے واقف کرا سکتے ہیں اور انھیں یہ بتا سکتے ہیں کہ اس قسم کے اپنے اظہار اور سچائی کی چاہت کا اصل معنی کیا ہے۔ لیکن یہ تفصیلات کہ – مخصوص مذہب، مخصوص عقیدہ وغیرہ کے لیے یہ فیصلہ کیسے اور کن طریقوں سے لیا جاتا ہے – اسے ان نوجوان افراد کے لیے چھوڑ دینی چاہئیں جن کی تعلیم زیر بحث ہے۔

یہ کہنے کی کوئی بات نہیں ہے کہ مسلم یا عیسائی والدین اپنی روزمرہ کی زندگی میں مذہب کے پابند لوگ ہوں اور اپنی مذہبی عبادتوں کے ذریعے اپنے بچوں میں بالواسطہ طور پر اس روحانی جذبے کو پھونکنے کی کوشش کر رہے ہوں جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، مذہبی تعلیم ایک ایسی صورت حال کی طرف رہنمائی کرسکتی ہے جہاں پر کوئی شخص خود کو ایک مذہبی شخص سمجھ سکتا ہے اور اس طرح اسے ایک ذاتی روحانی طمانیت اور اتحاد نصیب ہوتا ہے۔ اگر ہم اسے 'ذاتی شناخت' کہیں تو 'دوسرا شخص' جو اس 'ذاتی شناخت' کا سامنا کرتا ہے وہ ہر کوئی دوسرا ہے جو سچائی کی موجودگی میں رہتا ہے۔ لیکن چونکہ کوئی بھی یہ

دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ پوری طرح سچا ہے اس لیے کوئی بھی دوسرے کے بارے میں پوری طرح نہیں جان سکتا کہ اس کا سچائی کے ساتھ کولی لینا دینا نہیں ہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو ذاتی مذہبی شناخت کا مقابلہ کسی انسان یا گروہ سے 'دوسری چیز' کے طور پر نہیں ہے۔ یہ شناخت ٹکراؤ کی طرف رہنمائی نہیں کرتی ہے اور ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس انسان کے لیے 'دوسری چیز' صرف خدا ہے، کیوں کہ یہی ایک ایسی ذات ہے جو پوری طرح سچائی میں موجود ہے۔ یہ اختلافات انسان اور خدا کے درمیان ایک حدی خط کھینچتے ہیں، اسی لیے ہمیں خود خدا بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

4. اہمیت کا حامل آخری نقطہ جس پر میں یہاں زور دینا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہمیں مذہبی تعلیم کے ذریعے ایک سماجی و سیاسی شناخت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اس نظریہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے :

(a) سماجی و سیاسی شناخت کو قائم کرنے کی کوشش اور یہ سوال کہ ہم ماضی میں کون تھے اور اب حال میں کون ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ہمیں 'دوسری چیز' کے طور پر دوسرے افراد اور انسانی گروہوں سے لڑانا چاہتی ہیں، بلکہ 'دوسری چیز' کے نظریہ کو مزید گہرا کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن یہ نظریہ فکر افراد اور تہذیبوں کے درمیان تصادم کا باعث بنتا ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمی طور پر یہ چیز آج کل متنازع فیہ ہے کہ کیا واقعی میں یہ کوئی سماجی و سیاسی شناخت ہے۔ تاریخی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ عملی طور پر تمام تہذیب یافتہ افراد آداب و ثقافت کے معاملے میں ایک دوسرے کو متاثر کرتے رہے ہیں، اور اسی لیے کسی بھی قسم کی سماجی و سیاسی شناخت کا وجود نہیں ہے، نہ ہی ان معنوں میں جیسا کہ ہم نے سب سے پہلے اس کے بارے میں جو تصور کیا تھا۔

(b) جب مذہب کا استعمال سماجی و سیاسی شناخت کو حاصل کرنے کے ایک ذریعہ کے طور پر کیا جاتا ہے تو مذہب ایک سیاسی نظریہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس قسم کا نظریہ شدہ مذہب اپنا روحانی اثر کھو دیتا ہے اور لوگوں کی زندگی کو بامعنی بنانے لائق نہیں رہ جاتا۔

اس قسم کا مذہب جہاں ایک طرف بے اعتقادی کو جنم دیتا ہے وہیں دوسری طرف دنیا کے افراد کے درمیان سیاسی تصادم کا بھی باعث بنتا ہے۔ لہٰذا خدا کے نام پر مختلف ممالک ایک دوسرے کی مخالفت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ ان کا مذہبی فریضہ ہے۔

غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے میں یہ بات دہرانا چاہتا ہوں کہ مذہب کی نظریہ سازی کے بارے میں میری وارننگ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عالمی پیمانے پر جس طرح ناانصافی اور غیر انسانیت کی بہت سی شکلیں موجود ہیں، مذہب کو بھی اسی طرح الگ تھلگ ہو جانا چاہیے۔ بلکہ مذہب کو سچائی کی آواز بلند کرنی چاہیے اور ہماری دنیا میں موجود ناانصافی اور غیر انسانیت کی تمام شکلوں کے خلاف پرزور احتجاج کرنا چاہیے۔ البتہ اس بات کی تعریف کرنے کا فیصلہ کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، خود لوگوں پر چھوڑ دینا چاہیے کہ کیا وہ مذہبی ہیں یا نہیں۔

سوالات و مداخلات

تعلیم ہماری بنیادی شناخت کو لاحق خطرات سے محفوظ رکھتی ہے

خوری :

شناخت سے متعلق سوال میں وہ حالت بھی شامل ہے جس میں ہماری شناخت پر حملہ کیے جانے کا خطرہ ہے۔ اسی لیے تعلیم کو اس لائق ہونا چاہیے کہ وہ دی گئی بنیادی شناخت کو نقطۂ آغاز کے طور پر اختیار کر سکے، جسے بعض مخصوص حالات میں مضبوط کیا جانا چاہیے، گہرا کیا جانا چاہیے یا پھر اس کا دفاع کیا جانا چاہیے۔ تعلیم کو اس لائق ہونا چاہیے کہ وہ محترم شناخت کو اس کی بنیادی ضروریات کے ساتھ یقینی بنائے اور فرد واحد کے اندر اس کے تسلسل اور سماجی شرائط کی گارنٹی دے تاکہ مسلمان ایک غیر اسلامی ملک میں اور عیسائی ایک غیر عیسائی ماحول میں اپنی شناخت کو برقرار رکھ سکیں اور ان ممالک میں مستقل طور پر رہنے میں انھیں کوئی دشواری نہ پیش آئے۔

بنیادی شناخت کو سمجھنے کے متعدد طریقے

شبستری :

لیکن بنیادی شناخت کا اصلی مطلب کیا ہے؟ جیسا کہ میرے پچھلے مقالہ میں بیان کیا گیا، اسے دو طرح سے سمجھا جا سکتا ہے: اول، کسی مذہب کے بنیادی عناصر کے خلاصہ کے طور پر اور اس کی مخصوص طرز زندگی۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کے لیے اس میں روزانہ پانچ وقت کی نمازیں شامل ہو سکتی ہیں۔ بنیادی شناخت کا حقیقی معنی کیا ہے، یہ کچھ مختلف بھی ہو سکتا ہے، جیسے میں خدا کے سامنے حاضر ہوتا ہوں اور اس کے بعد روزانہ پانچ وقت کی نماز پڑھنے کا فیصلہ کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی میں ان لوگوں کا احترام نہیں کرتا جو خدا میں یقین رکھتے ہیں لیکن پانچ وقت کی نماز نہیں پڑھتے، انھیں میں ''دوسروں'' کی طرح اجنبی سمجھتا ہوں۔

لہٰذا اسے بھی 'بنیادی شناخت' کہا جا سکتا ہے : کہ میں خدا کی عبادت کرتا ہوں اور مسلم ہونے کے ناطے اس کی طرف اپنے طریقے سے رجوع کرتا ہوں لیکن ان معنوں میں نہیں کہ مجھے دوسرے طریقے سے رجوع کرنے کی اجازت نہیں ہے اور عبادت کی کوئی دوسری شکل اور اپنے مسلک کو ظاہر کرنے کا طریقہ درست نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی لیے یہ میرا مذہبی طریقہ ہے جسے میں نے متعدد اسباب کی بنا پر منتخب کیا ہے۔ اور میں نے ایسا یہ سب جانتے ہوئے کیا ہے کہ دوسری لوگوں کا مذہبی طریقہ دوسرا ہو سکتا ہے جس کے ساتھ دوسروں کا کوئی تصادم نہیں ہے۔

جداگانہ طرز زندگی سماجی تصادم پیدا کر سکتی ہے

اسی وجہ سے اگر مسلم بچوں کو گھر پر اس قسم کی تعلیم نہیں دی گئی اور اپنی جداگانہ مذہبی طرز زندگی کے بارے میں نہیں بتایا گیا بلکہ ان کی تعلیم و تربیت وسیع النظری کے ساتھ کی گئی اور انھیں دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کے بارے میں بتایا گیا تو ہمیں ان مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، جیسا کہ آج کل ہم یورپ میں ان مسائل کا سامنا کر رہے ہیں جہاں پر ہمارے خیال سے ایک ایسے معاشرے کا وجود عمل میں آچکا ہے جو بہت سے افراد کو تفرقہ اور اندرونی تصادم کا پیغام دے رہا ہے۔

خوری :

یہاں پر سب سے اہم چیز مذہبی فرقوں کی حالت ہے جس میں مخصوص مشترکہ مسلک کے افراد ایک ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور خود سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ کس چیز کا تعلق ان کی اپنی مذہبی شناخت سے ہے - جو دوسرے مذاہب کے لوگوں سے مختلف ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو مذہبی لیڈروں، خطیبوں اور مذہبی تعلیم دینے والے استادوں سے پوچھا جاتا ہے کہ : ہمیں اس بابت کس نظریہ کی تبلیغ کرنی چاہیے کہ ایک مسلمان کو کیسا ہونا چاہیے؟ ایک

مسلم کی خاصیت کیا ہوتی ہے، مثال کے طور پر یورپ کے کثیر مسلکی معاشرے میں؟

اکثر اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کیوں کہ اس سے جڑے ہوئے لوگ اس قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے اور اپنے پیروکاروں کا جواب دینے کے لیے پہلے سے تیار نہیں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ عام طور پر لوگ دینیات کی تعلیم تشفی بخش طور پر حاصل نہیں کرتے تاکہ ان سوالات کا صحیح جواب دے سکیں؛ انھیں دوسروں سے مدد کی امید ہوتی ہے۔ اور یہ مدد تدریسی عمل اور اسکولوں کی مذہبی تعلیم وغیرہ سے ملتی ہے۔

ہمیں ان سوالوں کی گہرائی میں جانا پڑے گا اور نئے جوابات تلاش کرنے ہوں گے

شبستری :

میں ان مسائل کو خود اپنے تجربہ سے جانتا ہوں کیوں کہ یورپ میں میں نو سال تک رہا۔ اگر ہمیں ان مسائل کو حل کرنا ہے تو ہمیں ان کی گہرائی میں جانا پڑے گا : ہمیں ان طریقوں اور ذرائع کی تلاش کرنی ہوگی کہ ان خطیبوں اور مذہبی لیڈروں کو کیسے تعلیم دی جائے، خاص کر ان لوگوں کو جن سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ جدید یورپ میں مسلمانوں کو اہم باتیں بتائیں گے۔

مثال کے طور پر میں یہاں پر اس سوال کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو ہمارے مسلم بھائیوں نے اس وقت جرمنی میں ہم سے پوچھا تھا کہ گرمیوں میں ماہِ رمضان کی ترتیب کیسے کی جائے۔ ہمیں اس حقیقت کا سامنا کرنا ہوگا کہ گرمیوں میں مسلمانوں کو بعض دفعہ 18 گھنٹے کام کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے، اس کے ساتھ ہی انھیں رمضان کے دنوں میں روزہ کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک بڑی مشکل حالت تھی، لہٰذا ہم نے ان سے کہا کہ انھیں اسلامی ممالک کے 12 گھنٹے کے رات اور دن کے نظامِ اوقات کے مطابق روزہ کے اوقات کو ترتیب دینے کی اجازت ہے۔

کیا ہمیں یہاں پر جداگانہ اور آزاد شناختوں میں امتیاز نہیں کرنا چاہیے؟

گیبریل :

شاید یہ چیز بہتر ہوسکتی ہے کہ جداگانہ اور آزاد شناختوں میں امتیاز برتا جائے اور مجموعی شناخت کو پوری طرح ختم نہ کیا جائے بلکہ اس کی طرف یوں دیکھا جائے کہ شناخت کا مطلب ہے ایک آزاد شناخت۔ اس کے دو اسباب ہیں :

اول یہ کہ تمام مذہبی رسومات عارضی ہیں : وہ تاریخ میں نمودار ہوتی ہیں اور خدا کو ڈھونڈنے کے طریقے اور ذرائع بتاتی ہیں، لیکن اس کی کوئی حتمی مقدار نہیں ہوتی۔ اگر ہم اس چیز کو اپنے ذہن میں نہیں رکھیں گے تو شناخت کی تفصیلات پیش کرتے وقت ہم زیادہ اہمیت خطرات کو دیں گے۔

دوم یہ کہ ہر شناخت کا پتہ رسومات سے ہی چلتا ہے : اس کا انحصار زیادہ تر اس پر نہیں ہے کہ میں ان چیزوں کو تفصیلی طور پر کرتا ہوں؛ ہوسکتا ہے کہ خدا ہماری پوری زندگی کے دوران اختیار کیے گئے راستہ کے مطابق فیصلہ کرے، خاص کر اس بات پر کہ ساتھی انسانوں کے ساتھ ہمارا رشتہ کیسا رہا۔

مذہب اس وقت تک سماجی و سیاسی شناخت حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ اسے مختلف لبادے میں پیش نہ کیا جائے

شبستری :

ذاتی حلقہ سے لے کر ذاتی تعلیم کے حلقہ تک میں اس چیز کے ساتھ اتفاق کرسکتا ہوں کہ جو پہلے کہا گیا۔ اس معاملہ میں ہم آزاد شناخت کے بارے میں بھی بات کرسکتے ہیں۔ لیکن

میرے لیے اہم نقطہ سماجی وسیاسی میدان ہے : مذہب کو اس کے ساتھ نہیں جوڑا جانا چاہیے، بالفاظ دیگر میں ایسی سماجی وسیاسی شناخت کے بارے میں تصور نہیں کرسکتا جو مذہبی شناخت کے ذریعے حاصل کی گئی ہو چاہے مذہبی شناخت ایک آزاد شناخت ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ایک ایسی سماجی وسیاسی شناخت کے بارے میں نہیں سوچ سکتا جو مذہب پر مبنی ہو، اس کے ذریعے مذہب کی غلط بیانی کے بغیر اور مذہبی کتاب کے ذریعے سیاسی اور سماجی تصورات کو بیان کیے بغیر۔ اگر ہم اس حقیقت کی طرف اشارہ کریں کہ مذہبی کتاب میں یہ یا وہ لکھا ہے جس کا اطلاق براہِ راست سماجی زندگی پر ہوتا ہے تو یہ خطرناک ہوجاتا ہے کیوں کہ سماجی زندگی کا ہمیشہ سیاست اور سیاسی اقدام وغیرہ کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔ معاشرے میں مذہب دھکا پہنچا سکتا ہے، سیاست کے لیے بالواسطہ دھکا بھی؛ لیکن شناخت - ایک آزاد شناخت بھی - سماجی وسیاسی سیاق وسباق میں مذہب میں تحریف کیے بغیر مذہب پر مبنی نہیں ہوسکتی۔

لوگوں کو ایسی تعلیم دیجیے جو ان کی آزاد اور لچکدار شناخت کی طرف رہنمائی کرے

بیلا ربی :

گہرائی کے ساتھ اپنا مقالہ پیش کرنے کے لیے میں پروفیسر شبستری کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں، جو ہمیں کئی طرح کے سوالات اٹھانے میں مدد کرے گا۔ اس کے علاوہ میں شناخت کی تشکیل میں تعلیم کی اہمیت سے متعلق پروفیسر خوری کی تقریر سے اتفاق کرتی ہوں۔ وہ خاص کر غیر ممالک میں مسلم اقلیتی فرقے اور دیگر ممالک کے ساتھ مسلم ممالک میں عیسائی اقلیتی فرقے کی حالت کا ذکر کررہے تھے۔ میرے خیال سے بعض دفعہ ہم لوگوں کی رہنمائی اکھڑ اور محدود شناخت کی طرف کرتے ہیں اور اس طرح بچپن سے لے کر زندگی کے تمام مراحل تک کی

شناخت کے لیے مسلسل خطرہ پیدا کرتے ہیں۔ اسی لیے ہمیں سب سے زیادہ دلچسپی اس بات میں دکھانی چاہیے کہ ہم لوگوں کی رہنمائی لچکدار اور کھلی ہوئی شناخت کی طرف کریں کیوں کہ کوئی بھی شخص اس وقت تک اپنی شناخت کا تصور نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ دوسروں کی شناخت کا تصور نہ کرلے۔ اس طرح کی وسیع النظری اور اپنی اور دوسروں کی شناخت میں فرق کو پہچان کر ہی ہم دوسرے کے ساتھ ہل مل سکیں گے اور ان سے گفتگو کرسکیں گے۔

دنیا تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے جب کہ مذہب اپنی جگہ ساکت ہے

میں آپ لوگوں کو اپنے ایک تجربہ کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو مراقش اور دیگر ممالک میں اپنی تدریسی سرگرمیوں کے دوران مجھے ہوا : کہ زیادہ تر لوگوں نے یہی پایا کہ دنیا بڑی تیزی سے آگے کو بڑھ رہی ہے جب کہ دوسری طرف مذہب اپنی جگہ ساکت ہے۔ شاید مذہبی شخصیات اور ماہر دینیات دوسرے افراد کو اس بات کا زیادہ موقع نہیں دیتے کہ وہ اپنے تاثرات بیان کریں یا سوالات پوچھیں۔ اور اس وقت بھی جب وہ اپنے سوالات اٹھاتے ہیں تب انھیں ملحد قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس لیے وہ خود سے ہی یہ سوال پوچھنے لگتے ہیں کہ مذہب کو جدید اور اس دنیا کے موافق بنانے کے لیے وہ کیا کرسکتے ہیں۔ اور درحقیقت ہم سبھی جانتے ہیں اور بہت سے ماہر دینیات نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کے اندر تمام اقدار اور ضروریات کو سمونے کی صلاحیت موجود ہے۔ ہمیں نوجوان لوگوں کے بارے میں اور مذہب کے بارے میں ان کے خیالات وتصورات کے بارے میں زیادہ حساس اور تشویش مند ہونا چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ انھیں مذہب سے کیسے قریب کیا جاسکتا ہے۔

سماجی وسیاسی شناخت کا تصور آج کل متنازع بن گیا ہے

شبستری :

میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ایک ایرانی اور مصر یا آسٹریا کے کسی شخص کی اپنی

کوئی مخصوص سماجی وسیاسی شناخت ہونی چاہیے۔لیکن تعلیمی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے سبب سماجی وسیاسی شناخت کا یہ معاملہ موجودہ دور اور وقت میں اصلی طور پر متنازع بن گیا ہے۔لیکن کچھ لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اگر یہ تعلیمی طور پر قابل قبول ہے تو پھر کسی شخص کو متعدد تاریخی حقائق کی بنیاد پر ایک موزوں شناخت کو قائم نہیں کرنا چاہیے۔

اور ہمیں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مذہب کا استعمال نہیں کرنا چاہیے

ہمیں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مذہب کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔یہ مذہب کو اس کی سچی روح سے الگ کردے گا کیوں کہ یہ مذہب کو اس کے روحانی کاموں سے روک دے گا کیا خدا سے رابطہ قائم کرنا ہی مذہب کا اصل مقصد نہیں ہے؟ اس کا واسطہ خدائی کاموں سے ہے، یعنی یہ خدا کے بارے میں بتاتا ہے اور انسانوں کو خدا سے رابطہ کرنے کی تعلیم دیتا ہے - یعنی خدا سے ہمارا جو بھی تعلق ہے اسے سب سے افضل و برتر ہونا چاہیے تاکہ انسانی زندگی میں روحانی کام انجام دیے جاسکیں۔

آج کے دور میں اسلام کا احیا کیسا دکھائی دے گا اور اسے کس طرح وقوع پذیر ہونا چاہیے؟

پروفیسر بیلا ربی نے یہ بجا فرمایا کہ اسلام میں بھی مسلسل احیا اور اور اس کی از سر نو تعبیر و تشریح کی ضرورت ہے۔اور جب ہمارے عقل مند و دانشور حضرات یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے اندر تاریخ کے تمام ادوار کو اپنے موافق کرنے کی صلاحیت موجود ہے تو یہ بلا وجہ نہیں ہے۔لیکن اس اصلاح کو کیسے اور کس طریقہ سے وقوع پذیر ہونا چاہیے؟ مثال کے طور پر ایسے بہت سے افراد ہیں جو اسلام کی تشریح اپنے نقطۂ نظر سے کرتے ہیں، جیسے صوفی، فلسفی اور قانون داں۔ جب فلسفیوں نے قرآن کی روشنی میں فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کی، تب صوفیوں نے بھی قرآن کی روشنی میں تصوف کو سمجھنے کی کوشش کی۔اسی طرح قانون دانوں نے قانون کو قرآن کی روشنی

میں سمجھنے کی کوشش کی۔ان تمام افراد نے ایک مخصوص گوشے کو اونچا اٹھانے کی کوشش کی۔ہمیں اپنے ایام میں پیش رفت کیسے کرنی چاہیے؟ اپنے دور میں زندہ رہنے کے لیے بغیر کسی تفریق اور اندرونی تصادم کے، جیسا کہ پروفیسر خوری نے بیان کیا، ہمیں کس قسم کی تعبیر و تشریح پیش کرنی چاہیے؟

مذہب کی بنیاد پر قائم کی گئی شناخت فرقہ وارانہ تعصب کی طرف مائل کرسکتی ہے؟

بیلا ربی :

ایک بار پھر شناخت کی تعریف کے مسئلہ پر توجہ دلانے کے لیے میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ایسے بہت سے عناصر ہیں جو اس کی تعریف میں مدد کرسکتے ہیں : جیسے سماج وسیاسی عناصر، سماجی و ثقافتی عناصر، اور جیسا کہ میں اپنی طرف سے جوڑنا چاہتی ہوں، بین الاقوامی ماحولیات اور بین الاقوامی نظریات کے عناصر - اگر ہم صرف روحانی سمت اور مذہب پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے تو ہم مذہب کو ایک آلہ بنادیں گے اور ایک مخصوص شناخت کو قائم کریں گے، یعنی اکھڑ شناخت جو فرقہ وارانہ تعصب کی طرف مائل کرتی ہے اور ہم سبھی جانتے ہیں کہ فرقہ وارانہ تعصب کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

انصاف کی تعلیم کا حصول

انگیبورگ گیبریل

اپنے پچھلے تین اجلاس میں ہم نے موجودہ دنیا کے سیاسی حالات کے تحت انصاف رسانی سے متعلق اہم امور پر بحث کی۔ اس سال کے موضوع کے مطابق ہم اپنے نقطۂ نظر، اپنے نظریہ میں تبدیلی کر رہے ہیں۔ آج کل انصاف سے متعلق تعلیمی عمل کو سب سے بڑا خطرہ لاحق ہو گیا ہے، یہ ایک ایسی چیز ہے جسے ضرور سیکھا یا جانا چاہیے اور تدریس کے ذریعے اسے دوسروں تک پہنچایا جانا چاہیے۔ اس عمل میں ہم ایک ساتھ ہمیشہ شاگرد بھی بنے رہتے ہیں اور استاد بھی۔

انصاف کی یہ تدریس، جو کہ اس وقت خطرے میں ہے، اسے پہلے سے ہی Biblical-Christian اور کلاسیکی نسلی روایات میں شامل کیا جا چکا ہے، جسے میں یہاں پر شروعاتی نقطہ کے طور پر لے رہا ہوں۔ جیسا کہ ارسطو نے Nicomachean Ethics میں لکھا ہے کہ ''ہم یہ جاننے کے لیے تحقیق نہیں کرتے ہیں کہ اچھا ہونے کا صحیح مطلب کیا ہے بلکہ ایسا اچھا آدمی بننے کے لیے کرتے ہیں۔ ورنہ یہ بیکار ہوگا۔'' لہٰذا یہ بات بالکل واضح ہے کہ، بلیکل مقدس کتاب کے مطابق بھی، سوال سچائی کے بارے میں جانکاری کا نہیں ہے بلکہ وہ سماعت اور سوچ ہے جو عمل کی طرف مائل ہو۔ پچھلے سیمیسٹر میں میں اس موضوع پر ایک سیمینار کروا رہا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ ہم نے جدید عمل میں ایک قسم کا خالی نقطہ پایا ہے۔ سوچنا، عمل کرنے کے مساوی نہیں ہے، اسی لیے تعلیم کے عمل کے بعد اٹھنے والا سوال یوں ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس لیے میں نے پہلے ہی اشارہ کر دیا ہے کہ میں اسی موضوع پر گفتگو کروں گا۔ پہلے درجے میں میں ''سچائی کی تعلیم'' پر بلیکل اور فلسفیانہ اثرات کو موضوع بحث بناؤں گا۔

دوسرے درجے میں میں یہ سوال اٹھانے کی کوشش کروں گا کہ عالم کاری اور میڈیا کاری کی موجودہ صورت حال کے زیر اثر اس کے کیا معنی ہیں اور میں یہ کیوں محسوس کرتا ہوں کہ ہم عصر سوچ میں یہاں پر یہ بے ضرر خالی مقام کیوں نہیں ہے۔

1. انصاف کی تعلیم کے عمل حینِ حیات تک

انصاف کی تعلیم حاصل کرنا پوری طرح جانکاری کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہ تعلیم کے ایک مخصوص طریقے کا معاملہ ہے جو تمام لوگوں پر منحصر ہے۔

اگر ہم بلیکل کتابوں کی وسیع تفسیر و تشریح کو دو جملوں میں سمیٹنے کی کوشش کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جہاں یہ ایک طرف خدا کی پہچان اور اس کی عبادت ہے جس سے ان کا لینا دینا ہے، یا دوسرے الفاظ میں خدا سے پیار ہے، وہیں دوسری طرف یہ اپنے ساتھی انسانوں کے ساتھ سچائی سے پیش آنا یا دوسرے الفاظ میں پڑوسیوں سے پیار و محبت ہے۔ عیسائی مذہب کے یہ دو بنیادی احکامات ہیں۔ پیار و محبت کا لفظ یہاں پر ہمیں پریشان کر سکتا ہے کیوں کہ موجودہ دور میں اس لفظ کا استعمال بہت محدود معنوں میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پس منظر میں یہاں پر کسی احساس کو خطرہ نہیں لاحق ہے بلکہ یہ ایک ذاتی طور پر سیکھنے کا عمل ہے جو کہ خدا کے تخلیقی نظام کی پہچان کے ساتھ ساتھ جو کہ صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

ان تمام مذاہب میں جہاں پر خدا ایک ہے، سچائی ایک مرکزی اخلاقی طریقہ ہے۔ یہاں پر اس ضمن میں میں بعض مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں : تخلیق کی کہانی کے مطابق، خدا نے انسان کو اس لیے پیدا کیا ہے تا کہ ''وہ دنیا پر حکومت کر سکیں [.....] صحیح راستے پر چل کر'' (Wis 9:3) مثال کے طور پر خدا کی ایک شکل کے طور پر سچائی کو قائم کرنے کے لیے، جہاں پر تمام انسان ایک دوسرے کے ساتھ پر امن طور پر اور رواداری کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ چونکہ حقیقت بالکل الگ دکھائی دیتی ہے اس لیے بائبل (انجیل) کی ضمنی کتابوں میں جھوٹ

کے خلاف زبردست احتجاج پایا جاتا ہے۔ اس کی مثال Exodus کی وہ کہانیاں ہیں جو خدائی امداد کی ماڈل ہیں : خدا اپنے انسانوں کی چیخ و پکار سنتا ہے اور مصیبت کی گھڑی میں انھیں راستہ دکھاتا ہے۔ Psalms کی کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ عبادت کرنے والا خدا سے یہ التجا کرتا ہے کہ وہ اس شخص کے ساتھ انصاف کرے جو عبادت کر رہا ہے، اور اس کا مطلب ہے اس کی اس کے استحصال کرنے والے کے خلاف مدد کرنا۔ لیکن وہ اپنے گناہ کو بھی قبول کرتا ہے اور معافی کی درخواست کرتا ہے: ''اے خدا، اپنے غصے سے میری سرزنش مت کر، یا اپنے غصے سے میری تربیت مت کر'' (Ps 6:1; 38:1)۔ دس احکامات میں سے سات میں انسانی رشتوں کا صحیح طریقہ ہی موضوع ہے۔ انبیائے کرام لوگوں کو سچا رہنے اور جھوٹ کی تردید کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ مسیح کی اتباع میں جس ''عظیم سچائی'' کا مطالبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے ساتھی انسانوں کی مدد کرنا، خاص کر ایسے وقت میں جب وہ پریشانی میں مبتلا ہو۔ اس میں سچائی کی بقا کے لیے مصیبتیں برداشت کرنا بھی شامل ہے تاکہ ''برائی پر اچھائی کی جیت ہو سکے'' (Rm 12:21)۔

لہٰذا وہ سچائی کی دوسرے سے امید کی جاتی ہے یا پھر خود اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کی ایک اپیل ہے، اس سے مراد کسی خاص نظام کو حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد عمل ہے۔ ساتھ ہی یہ کبھی نہ ختم ہونے والا ایک عمل ہے۔ اس طریقے سے انسان ایک شخص میں تبدیل ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر انجیل کے نظریہ کے مطابق سچائی سیکھنے کا ایک عمل ہے، جو انسان کو ایک ایسی شکل میں بدل دیتا ہے جیسا کہ اس سے خدا کی شکل کے طور پر بننے کی امید کی جاتی ہے، یعنی ایک سچا شخص۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ بطور ایک شخص کے دوسروں کے ساتھ انصاف کرنے کی ٹریننگ کیسے دی جائے یا سامنے والے کے ساتھ سچا برتاؤ کیسے کیا جائے۔ یہ مصر کی اخلاقیات کا ایک ہم جنس نقطۂ نظر ہے : فرد کی تخلیق اپنی ذات کے بارے میں علم سے ہوتی ہے (''خود کو جانو'')، اعلیٰ خوبی کی شکل میں سچائی کا مقصد تربیت اور عادت کے ذریعے حاصل

کیا جاتا ہے جو اپنے اندر شجاعت، جدیدیت اور دانائی رکھتا ہے۔ جرمنی میں لفظ 'Tugend' (خوبی یا صفت) 'zu-etwas-taugen' سے اخذ کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے '..... کے لائق ہونا یا کسی چیز کے لیے بہتر ہونا'۔ انسانی زندگی کا مقصد وہ بننا ہے جو انسان بن سکتا ہے یا جیسا اسے ہونا چاہیے، ٹھیک اسی طرح جیسے دوسری چیزوں کو اس دنیا میں اپنا کام انجام دینا چاہیے۔ 13 ویں صدی میں تھامس ایکویناس نے ایک دینیاتی حوالے میں اس نظریۂ فکر کو استعمال کیا تھا : سچائی اور پیار کے سیکھنے کے عمل کے طور پر اخلاقیات، اس کا مرکزی کام کرتی ہے، یعنی Summa theologica۔ اس کا بنیادی اخلاقی ڈھانچہ یہ کہتا ہے کہ انفرادی انسان خدا کی طرف سے آتا ہے، دنیا سے ہو کر گزرتا ہے اور پھر خدا کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ یہ چھوٹا فارمولہ (میکس سیکلر کے مطابق) — ''خدا سے دنیا سے ہو کر گزرتے ہوئے دوبارہ خدا تک'' — انسانی زندگی اور دنیا کی ذمہ داری کے طور پر اخلاقی تعلیمی عمل کا انکشاف کرتا ہے۔ انسانوں کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے تاکہ وہ انسان بنیں اور خدا کے سامنے اس انسانیت کو بہترین شکل میں لائیں۔ سچائی اور تعلیم، تدریسی اور اخلاقی پیش رفت، یہ تمام چیزیں ایک دوسرے سے پوری طرح جڑی ہوئی ہیں جنھیں کبھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی اور سرگرمی کا مطلب سچائی کو بروئے کار لانا ہے، یعنی حق پرستی کی تعلیم حاصل کرنا۔ اس حرکی عمل میں، شعور اس وقت تک تیز ہوتا رہتا ہے جب تک کوئی فرد اخلاق سوال میں خود کو مصروف رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینیات میں اخلاقیات ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ قدیم زمانے میں اخلاقی زبان آج کی بہ نسبت زیادہ بیش قیمتی تھی۔ زبان کے فلسفہ کے مطابق، اظہار خیال کے طریقوں میں اختلاف کی سطح کو بعض میدان میں اعلیٰ ترقی یافتہ کلچر کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے؛ جب کہ موجودہ دور میں اخلاقی زبان کی زبوں حالی اور اخلاقی تصورات کی کم صداقت اس بات کا اشارہ ہے کہ انسانی رشتوں میں ہماری دلچسپی بہت کمزور پڑ چکی ہے یا پھر اس سلسلے میں ہماری معلومات میں کمی آئی ہے۔

پہلے کی طرح آج بھی ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں سچائی سے متعلق امور کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے، جسے ذمہ داری کے ساتھ طے کرنا چاہیے اور جسے اوریئنٹیشن، ضوابط اور ماڈلس کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں خدا، اپنے پڑوسی اور خود اپنے تئیں سچائی کی تعلیم ہی کسی شخص کی اخلاقی شناخت کو قائم کرتی ہے۔ یہ اس جانکاری میں مخفی ہے کہ ''خود اپنے کاموں کے تئیں ذمہ دار'' ہونا اور اسی کے مطابق کام کرنا۔ فرانسیسی فلسفی، پال ریکوئیر کا بھی یہی نظریہ تھا۔ "cogito, ergo sum" نہیں بلکہ "credo et ago, ergo sum"، جس کے تحت مذہب اور اخلاقی شناخت ایک دوسرے سے پوری طرح مربوط ہیں۔ اس طرح سچائی کی تعلیم کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے : یہ ایک سماجی تدریسی نظام ہے جو ایک شخص کو چیلنج کرتا ہے اور مکمل طور پر اس کی تشکیل کرتا ہے اور جس میں اس کے بنیادی وجود کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ پوری طرح جڑی ہوئی ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ نادستیابی کا پہلو اخلاقی تعلیم کے لیے موزوں ہے اور اس طرح اخلاقی تدریس کے لیے بھی، جو کہ اس شخص سے جڑا ہوا ہے۔ اس کا اظہار پلیٹو نے اپنے ''ڈائیلاگ مینن'' کے اختتام پر یوں کیا تھا : کوئی شخص یہ بحث کرسکتا ہے کہ سچائی اور سنجیدگی میں کیا چیز اچھی ہے، اسے خدائی مدد کے ذریعے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح بائبل میں بھی سرکشی کی ایک انوکھی شکل کو پیش کیا گیا ہے کہ سننے والے وہ حضرات جو نہیں سنتے ہیں اور نہ ہی سمجھتے ہیں اور انھوں نے جس چیز کو سچا اور درست پایا پھر بھی اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے ہیں (cf. Mt. 13:13 f.)۔

اسی لیے سچائی کی تعلیم، کبھی بھی خواہش کا معاملہ نہیں رہا بلکہ ایک ذاتی عمل رہا جو کہ تکنیکی اور اقتصادی عمل سے بالکل مختلف ہے۔ Hannah Arendt نے اپنی کتاب "Vita activa" میں 'پیداواری' اور 'اداکاری' کے درمیان ایک امتیاز قائم کیا ہے اور انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ موجودہ 'homo faber' میں 'اداکاری' کو اس کا صحیح مقام نہیں دیا گیا ہے۔ اسی طرح جرگن ہیبر ماس بھی ایک ترسیلی اور اشاراتی وجہ کے درمیان فرق کو بتاتا ہے، جس کے تحت

ہماری تکنیکی اور سائنسی دنیا میں مؤخرالذکر کو اتنی قوت حاصل ہوجاتی ہے کہ وہ حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے جیسے کہ یہی ترسیلی، اخلاقی وجہ ہو۔

بہرحال، انسانی سچائی اپنے آپ میں ہمیشہ نادرست رہتی ہے: اسے پوری طرح پردرستگی خدا کی حتمی حقیقت میں نصیب ہوگی۔ یہ جنت کی سلطنت کی خاصیت ہے جسے دنیاوی حالات میں محسوس نہیں کیا جاسکتا۔

2. ذاتی تعلیم بصورت معاشرتی تعلیم

چونکہ انصاف کی تعلیم کی نوعیت ذاتی ہے اس لیے گروہوں اور فرقوں کے درمیان یہ سماجی طور پر عمل میں آتا ہے۔ یہ فیملی، چرچ یا مسلک، اسکول اور یونیورسٹیز اور عوام پر صادق آتا ہے جہاں میڈیا ایک اہم ثالث کا رول ادا کرتا ہے۔ جہاں تک اخلاقی تعلیم کا عمل ہے تو یہ تمام سماجی عناصر نہایت اہمیت کے حامل ہیں، اس لیے ان کی تفتیش علاحدہ طور پر کی جانی چاہیے۔ اس موقع پر ایک چھوٹی تشریح۔

تہذیب اور انصاف کی تعلیم کے لیے فیملی ایک بنیادی مقام ہے۔ یہ چیز بار بار حیرت میں ڈالتی ہے کہ بچوں میں سچائی کا فطری طور پر احساس ہوتا ہے۔ یکا یک یہ کہنا کہ ''یہ غلط ہے'' سماجی ضابطے اور رواداری کی بنیادی خواہش کو ظاہر کرتا ہے۔ مذہبی روایات پر قائم فیملی میں ہی یہ ہوتا ہے کہ سچائی سے متعلق خیالات ایک فرد سے دوسرے فرد میں اجاگر کیے جاتے ہیں۔ ''جب آپ کے بچے آنے والے وقت میں آپ سے یہ پوچھتے ہیں کہ 'جن ڈگریوں اور آئین وقوانین کا حکم ہمارے خدا نے آپ کو دیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟' تب آپ کو اپنے بچے کو یہ کہنا چاہیے، [.....]'' (Dt 6:20 f.)۔

تہذیب سکھانے کا دوسرا مقام ہے اسکول، جو پیچیدہ معاشروں میں تعلیم کا وسیع تناظر پیش کرتے ہیں، آج یہ موضوع زیر بحث ہے کہ اسے کس حد تک اخلاقی تعلیم کو اپنے کنٹرول

میں لینا چاہیے یا یہ لے سکتا ہے۔ فیملی کی کمزوری کا نتیجہ وہ حالت ہوتی ہے جہاں اسکولوں کو نام نہاد سماجی تعلیم کے میدان میں بھی چیلنج درپیش ہوتا ہے : یہ باہمی رشتوں کی تشویش ہے جس کا زیادہ سے زیادہ مطالبہ میڈیا اور کثیر ثقافتی معاشرے کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

عیسائی عبادت گاہ ایک ایسا دوسرا مقام ہے جہاں انصاف کی تعلیم اعتدال پسندی کے ساتھ دی جاتی ہے۔ خاص کر ان عبادت گاہوں میں پابندی کے ساتھ بائبل کو پڑھنا انصاف کی تعلیم کی ایک اہم خاصیت ہے جو کہ بار بار پڑھی جاتی ہے اور یاد کی جاتی ہے۔ مختلف کہانیوں اور تذکروں کو سنانے کا عمل انفرادی زندگی سے متعلق حالت کے مطالبہ کو پورا کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ جب غریب Lazarus کی کہانی پڑھی جاتی ہے، جو ایک امیر آدمی کے دروازے پر پڑا ہوا ہے، تو سننے والا فوراً ہی اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہے کہ مادی اشیا کے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہے۔ مرنے کے بعد والی زندگی میں اس کے فوری انتقام کا سنگین اندیشہ، جس کا بیان اس کہانی میں ہے، مال و دولت کے نظریہ کے مطابق ہماری ذمہ داری کے سنگین پہلو کا انکشاف کرتا ہے (Lk 16:19-13)۔ انجیل کی تمام کتابوں میں ہمیں سچائی اور انصاف کی ایسی پرجوش اپیلیں ملتی ہیں۔ وہ خاص طور سے عیسائی پیغام کے پیغمبرانہ کردار کو پیش کرتی ہیں۔ لیکن پیش گوئی خدا سے بیگانگی اور ساتھی انسانوں کی تحقیر کی تنقید ہے۔ یہ کھلے عام برائی کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ جھوٹے پیغمبر ہیں جو کسی قسم کی طمانیت کی حمایت کرتے ہیں : وہ وہاں پر ''امن، امن'' چلاتے ہیں جہاں کوئی امن نہیں ہے اور نہ ہی الزام دور کرنے کی کوشش ہے (Ezek 22:28)۔ پیغمبر سچائی اور انصاف کا اعلان سیاسی حکومت اور سماجی رشتوں کے طور پر کرتے ہیں۔ سچائی حکمت کا تمام ہونا اور آخری ہونا (Wis 1:1) اور بین الاقوامی منظوری ہے : ''[.....] کیوں کہ یہ آپ کی فہم و فراست اور لوگوں کے تئیں ذکاوت کو دکھائے گا، جو جب ان تمام قوانین کو سنیں گے تو کہیں گے کہ 'واقعی یہ عظیم ملک ایک عقل مند اور ذکاوت والا شخص ہے!'' (Dt 4:6)۔ سچائی کوئی جسمانی طاقت نہیں ہے بلکہ بلندی کی شرط ہے۔

انصاف کو مطالعے اور عملی مثالوں کے ذریعے سیکھا جاتا ہے۔ ایک مخصوص طریقے سے یہ دماغ میں New Testament کے ذریعے آتی ہے، جس میں جیسس کو سچائی کے عملی اظہار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ ''خدا کی پارسائی'' ہے (2 Cor 5:21)۔ یہ وساطت کے ذاتی عنصر کو ایک نئے طریقے سے توجہ کا مرکز بناتا ہے۔ میں اس سیاق و سباق کے ذریعے نجات کے عیسائی نظریہ کی وضاحت نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ یہ خدا کی نقالی کی ایک شکل ہے جس سے یہاں پر مجھے دلچسپی ہے۔ Old Testament کی یہ ایک اہم شکل ہے : یہ معتقد کا کام ہے کہ وہ خدا کی نقالی اس کی سچائی میں کرے۔ عیسائی روحانی روایات میں یہ جیسس کو ودیعت کی گئی ہے : سچائی کی تعلیم اخلاقی مثالوں کی نقالی کے ذریعے ہوتی ہے۔ Mimesis کے خیال کی گہرائی کے ساتھ سائنسی تفتیش کی ضرورت ہوگی۔ کیا اس کا تعلق ہمارے بنیادی انسانی تجربہ سے نہیں ہے کہ ہم بنیادی طور پر الفاظ کے ذریعے نہیں سیکھتے ہیں بلکہ ہم ان لوگوں کے رسم و رواج کی نقالی کے ذریعے سیکھتے ہیں جو ہمارے لیے محترم و بزرگ افراد ہیں؟ یہ مقولہ کہ "verba docent, exempla trahunt" (الفاظ ہمیں سکھا سکتے ہیں، مثالیں متوجہ کرتی ہیں) پوری طرح موزوں ہے۔ اخلاقی عادات و اطوار الفاظ کے ذریعے ایک شخص سے دوسرے شخص میں نہیں جاتے بلکہ دوسروں کے ذریعے شعوری اور لاشعوری طور پر ایک دوسرے میں داخل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مجھے بتایا گیا، اسے جدید تعلیمی نظریات میں بڑے پیمانے پر رد کیا جاتا ہے۔ میرے خیال سے یہ صحیح ہے کیوں کہ مذکورہ نظریہ بہت زیادہ واقفیت کی طرف مائل ہے اور خود مختار فرد کو اپنے قدم کے طور پر لیتا ہے۔ لیکن کسی شخص کی خود اپنی سرگرمی اور اس طرح شعور کی تشکیل نہ صرف قواعد و ضوابط اور اقدار پر مبنی ہوتی ہے بلکہ دوسرے افراد پر بھی مبنی ہوتی ہے، جیسے والدین، استاد، بھائی اور بہن، اور وہ ماڈل جو مخصوص کلچر کا تعین کرتے ہیں۔ اس موضوع پر الگ سے تحقیق کرنا کافی دلچسپ ہوگا۔ اس کا اگلا قدم تبھی ممکن ہوگا جب نئے فرد سے اس کی سچائی کی فہم و فراست اور ایک دی گئی حالت میں توضیح اور بازتوضیح کے بارے میں

سوال کیا جائے۔ جیسا کہ امریکی سماجی فلسفی Michael Walzer نے بیان کیا ہے کہ یہ صرف افراد کے لیے ہی صحیح نہیں ہے بلکہ تہذیبوں اور مذہبوں کے لیے بھی صحیح ہے، اور ہماری یہ گفتگو بھی اسی طرح کے تعلیمی عمل کو ظاہر کر رہی ہے۔

3. عمل درآمدگی کی کوشش

ان عام مشاہدوں کے ذیل میں، میں موجودہ زندگی اور تعلیمی حالات کے تحت بھی ان کے معنی کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

آئندہ کی پیش رفت کے بارے میں آسٹریا کے بچوں کی نفسیات کے ماہر، ڈاکٹر میکس فریڈرک کا میں یہاں حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ ''اخلاقی فیصلہ کی مہارت، تشکیل شدہ شعور اور اندرونی آواز کی وساطت ایک خدائی مذہب کی پچاس سالہ متحدہ نمائندگی اور نظریاتی دلنشینی کے ذرائع سے ہوگی۔ [.....] کل کے بچے ہم عصر تہذیبی عناصر، جیسے فن تعمیر، موسیقی اور اس جیسی چیزوں کا تجربہ کریں گے کہ شاید یہ چیزیں دیرینہ زمانے کی ہیں، کیوں کہ تیزی سے بڑھتے ہوئے کل میں پرانے زمانے کی ایک صدی کل کے 50 سالوں کے برابر ہوگی۔''

اس بیان نے میرے لیے یہ بات سچ ثابت کردی کہ اخلاقی تعلیم کا مطلب بنیادی طور پر ذاتی اور سماجی تعلیم ہے۔ اگلے 50 برسوں میں ایک خدا کے ماننے والے تمام مذاہب کے چونکا دینے والے اتحاد سے الگ نئی زیادہ تکنیکی دنیا میں سچائی کی تعلیم کو میکانیکی طور پر کسی کے اندر داخل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے برخلاف یہ صحیح دکھائی دیتا ہے : مزید تکنیکیت کے مدنظر فیملی، مذہبی فرقے اور اسکول کو بنیاد حاصل ہوگی۔ جیسا کہ فریڈرک نے کہا – دونوں بیانات کے درمیان اندرونی رشتہ قائم کیے بغیر – بچوں کے مسائل بڑھ رہے ہیں، انھیں نامکمل تعلیم دینے کی وجہ سے وہ فہم وفراست کے لائق نہیں بنتے کیوں کہ ان کے اندر خود اپنے احساسات یا پھر دوسروں کے احساسات کو بیان کرنے کے صلاحیت نہیں پائی جاتی۔

میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ سوال کہ نئے تکنیکی اور ثقافتی حالات سچائی کی تعلیم پر کس طرح اثر ڈالیں گے، مستقبل کے لیے، نہایت اہم ہوتا جارہا ہے کیوں کہ سچائی کی تعلیم، اور عام طور پر اخلاق تعلیم آج کل زیادہ مشکل ہے اور ساتھ ہی پہلے کی بہ نسبت زیادہ اہم بھی ہے۔ اس سوال کے جواب میں میں یہاں پر درج ذیل مشاہدات کو بیان کرنا چاہتا ہوں :

1- جدید معاشرے میں تفریق پیدا کرنے کا عمل جزوی شعبوں کی طرف مائل کر رہا ہے، جیسے اقتصاد، سیاست، سائنس، اور پرائیویٹ شعبے مختلف میدانوں میں مختلف معیار کے نتائج پیش کرتے ہیں اور ان علاقوں میں لوگوں کے مختلف کردار ہیں۔ لیکن کیا سچائی ناقابل تقسیم نہیں ہے؟ یہ تمام میدانوں کو مربوط کرتی ہے اور اس طرح یہ ایک مجموعی دعویٰ کرتی ہے۔ اس طرح اخلاقی تعلیم میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ اقتصادیات، سائنس وغیرہ کے لکچرس میں اخلاقیات پر مبنی سوالات کے جواب بڑی دلچسپی کے ساتھ دیے جاتے ہیں۔ یہ ایشو کہ کیا اچھا ہے اور کیا صحیح ہے، اسے معاشرہ کے متعدد شعبوں میں اٹھایا جانا چاہیے، جس کی اپنی دلیلیں ہوتی ہیں۔ عیسائی اور دوسرے مذاہب کا یہاں پر ایک نہایت اہم کام ہے کہ انسانی اقدام کے طور پر وہ لوگوں کو سچائی کے تئیں حساس بنائیں اور ان کے سامنے تمام سوالات کا آسان دینے کا وعدہ نہ کریں جو کہ موجودہ پیچیدگی میں ممکن بھی نہیں ہے۔ اس کی برخلاف باتوں کا بھی ذکر کیا جانا چاہیے یہ تصور کرتے ہوئے – جیسا کہ درج بالا حوالہ میں بیان کیا گیا – کہ ذہنیت اور سچائی پر جدید ٹکنالوجی کا غلبہ ہو چکا ہے، اور انسان خود اپنا خالق بن گیا ہے اور اس نے اپنے غیر یقینی معیاروں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ایک سوال کے طور پر سچائی اور اس کے لیے جدوجہد تب مذہب اور غیر مادی دور کا بقیہ بن جاتی ہے، جس کا تعلق ماضی سے ہے، جیسے کہ "Codex Hammurabi" کا قانونی نظام، جو پتھروں پر کندہ ہے یا دس احکامات (Ten Commandments) میں مذکور ہے۔ اس فطرت کے مدنظر یہ ضروری ہے کہ سچائی کی تعلیم و تدریس کو مرکزی اخلاقی چیلنج کا ایجنڈا بنایا جائے۔

2- ترسیلی اطلاع کی مقدار، جو انٹرنیٹ کے ذریعے لامحدود تک بڑھ گئی ہے اور اس سے کہیں زیادہ ہے جس کا پیچھا انسان کر سکے، اس کے تحت عام اور فلسفیانہ تعلیم اور سب سے بڑھ کر اخلاقی تعلیم میں تیزی لانے کی ضرورت ہے۔ ماس میڈیا کے لیے یہ تصور کر لیجیے کہ اخلاقی ذکاوت کی اعلیٰ ڈگری۔ اسی لیے سچائی کی تعلیم ایک امدادی پروگرام کو شامل کرتی ہے تا کہ اطلاع کو کسی فرد واحد کی دنیاوی نظریہ میں داخل کیا جا سکے اور جو اس سے جڑی ہوئی ہو؛ کیوں کہ ہمیں اس کو انسان کے ذاتی تجربہ کی بنیاد ماننا پڑے گا کیوں کہ فرد اپنے اعمال کا بااثر ذریعہ ہے اور اپنے کاموں کے لیے جوابدہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ علم کی منتقلی کے تکنیکی امکانات اس بھرم کو بڑھاوا دیں گے کہ سچائی کی تعلیم و تدریس ماس میڈیا کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ الیکٹرانک تعلیم کو اسکولی تدریس کے نظام میں کس حد تک شامل کیا جا سکتا ہے؟ کیا اسکولوں میں جسمانی طور پر موجود استادوں کی اب بھی ضرورت ہے؟ میرے خیال سے خاص طور پر اخلاقیات کے میدان میں ذاتی تعلقات اور سماجی سیاق و سباق میں ترسیل، جیسا کہ فیملی، اسکول اور چرچ میں ہوتا ہے، کو ہمیشہ فیصلہ کن سمجھا جاتا رہے گا۔ یہاں بھی میڈیا کے رول کو تفصیلی طور پر سمجھنا چاہیے، جو کہ میری رائے میں ایک بااثر آلہ ہے، اگر میڈیا کی خدمات حاصل کرنے والے کسی خیال یا نظریہ کو اچھی طرح نہیں سمجھ پائے تو میڈیا کے پیغام کے ذریعے ہی اسے دور کیا جا سکتا ہے۔

3- معاشرہ کی ثقافتی اور مذہبی سرایت ہمیں زرخیز کر سکتی ہے، اگر ہم قانون اور انصاف کے متعدد اصولوں کی وضاحت میں کامیابی حاصل کر لیں اور قومی اور بین الاقوامی میدان میں ایک دوسرے کے عزم کو حاصل کر سکیں۔ دنیا چونکہ زندگی بسر کرنے کی ایک مشترکہ جگہ ہے اس لیے اسے زندگی کی ایک مشترکہ حالت کی ضرورت ہے، جیسے عالمی پیمانے پر منظور شدہ ضوابط، قوانین اور اقدار۔ یہی بات انفرادی معاشروں پر بھی صادق آتی ہے۔ یہاں پر بھی سچائی کی تعلیم خاص اہمیت کی حامل ہے۔ حقیقی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے سے یکسانیت نہیں

آتی۔ اگر اخلاقی تعلیم نہیں دی گئی تو سچائی کے بارے میں مختلف نظریات تصادم یا اخلاقی شدت پسندی پیدا کر سکتے ہیں۔ دونوں سماجی امن کو فروغ نہیں دیتے۔ کثرت ایک اعلیٰ اخلاقی ذکاوت کا مطالبہ کرتی ہے تا کہ رواداری اور تفریقی طریقے سے عوامی گفتگو کی جا سکے۔

میں اپنی تقریر کا خاتمہ موجودہ دور میں تین طریقے سے دی جانے والی سچائی کی تعلیم کے ذکر کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں:

- تصحیح : شعبوں میں معاشرے کی تقسیم، اطلاع کی کثرت، میکانیکی طور پر علم کی منتقلی، اور سچائی کے مختلف نظریات کی کثیر ثقافتیت مذہب کے سامنے اس چیلنج کے طور پر نمودار ہوتی ہے کہ عوامی تقریر میں سچائی کے مرکزی اصول کو شامل کیا جائے، اخلاقی ایشو کو ایجنڈا بنایا جائے اور پرائیویٹ شعبوں میں سچائی کی تعلیم کو فروغ دیا جائے۔

یہ ان تمام موضوعات پر صادق آتا ہے جن پر ہم نے اپنی اس میٹنگ میں مباحثہ کیا، جیسے بین الاقوامی انصاف اور رواداری، اور دوسرے موضوعات بھی، جیسے ایکولوجی، جنس کے معاملے، بایوٹکنالوجی وغیرہ۔ لہٰذا، ایک خدا کو ماننے والے مذہب کے سچائی و انصاف سے متعلق پیغام کو ہر دور کے سب سے بڑے مسئلہ کے طور پر بار بار اٹھایا جانا چاہیے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سیکھنا نہایت ضروری ہے۔ اخلاقیات کو حتمی طور پر ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنے شعور کو تعلیم دے سکیں اور اخلاقی معیاروں کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ ایک آدمی شاید ایک اچھا ٹیکنیشین اور ایک بدکار شخص ہو سکتا ہے، لیکن تمام خطا کاری کے باوجود سچائی کی تعلیم کے لیے اخلاقی عمل کی ضرورت ہے۔

- تنقید : اسلام اور عیسائیت پیغمبرانہ مذاہب ہیں۔ جدید ادراک میں پیش گوئی کا مطلب ہے وہ سماجی تنقید جو عوام کو سچائی کی تلاش کی طرف مائل کرتی ہے۔ یہ لبرل معاشرے میں آسان ہے جہاں پر بادشاہت والے ممالک کی بہ نسبت لوگوں کو اپنے حقوق کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی فرقے سچائی کی طرف راغب ہوتے ہیں

اوراس کی تعلیم دیتے ہیں۔ان سے یہ امید بھی کی جاتی ہے کہ وہ امن پسند طریقے سے بات چیت کے ذریعے اپنے اختلافی نظریات کو دور کریں۔جیسا کہ مذاہب کی تاریخ اور فلسفہ بھی یہ بتاتا ہے کہ پیش گوئی کسی بھی طرح نقصاندہ نہیں ہے۔لیکن یہ معاملہ جب گہراتا ہے تو مخاصمت پیدا ہوتی ہے۔اس کام کو پورا کرنے کے لیے کہ ''دنیا کے باشندے سچائی کی تعلیم حاصل کریں'' (Is 26:9) نہ صرف یہ کہ غلطیوں کو درست کیا جائے بلکہ بدکاری، تشدد اور بے باکی سے بھی سامنا کیا جائے۔

● تخلیقیت : ہم عصر دنیا میں تیزی سے ہونے والی تبدیلیاں اس بات کا مطالبہ کررہی ہیں کہ نئے حالات کے مطابق اشارے اور ڈھانچے، گفتگو اور اعمال بااثر ہو جائیں۔ساتھ ہی تمام بنیادی نئے چیلنجز، جن کی نشاندہی میں نے پہلے کی، ایک بنیادی اخلاقی تخلیقیت کی ضرورت ہے، جو تکنیکی اور اقتصادی میدانوں میں تخلیقیت کے مطابق ہو، جو اس پیش رفت کو بہتر انسانی طریقے سے انجام دیتی ہے۔اس کے تحت ان تمام نقطۂ نظر میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے جو دنیا کو الگ نظریے سے دیکھتے ہیں، اچھی آنکھوں سے، خدا کی آنکھ سے۔اگر بہت سے یا صرف چند لوگ اس دنیا کی اچھائیوں کو بنیادی طور پر اپنی دولت کے طور پر نہیں بلکہ ایک عام آدمی کی دولت جس کا تعلق خدا سے ہے، دیکھتے تو کیا دنیا اس سے بہتر نہیں ہوسکتی تھی؟ کیا دنیا اس وقت زیادہ پرامن جگہ نہیں بن سکتی تھی اگر بہت سارے یا چند افراد اپنے ساتھی انسانوں کو بنیادی طور پر خدا کی مخلوق کے طور پر دیکھتے اور انھیں اپنا دشمن، مخالف یا کافر نہیں سمجھتے؟ دنیا کے ماہرین کا ایک مطالعہ، the Global Governance Report کی تشکیل یوں کی گئی ہے : ''سب سے اہم تبدیلی جو انسان کرسکتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ دنیا کو اپنے دیکھنے کے طریقے میں تبدیلی لائے۔ہم مطالعوں، نوکریوں، پڑوسیوں، اور یہاں تک کہ ممالک اور جزیروں میں بھی تبدیلی لاسکتے ہیں لیکن پھر بھی زیادہ تر وہی رہتے ہیں جیسے کہ ہمیشہ تھے۔لیکن اپنے دیکھنے کے بنیادی طریقے میں تبدیلی لائیں پھر ہر ایک چیز بدل جائے گی ۔

جیسے ہماری ترجیحات، ہمارے اقدار، ہمارے فیصلے، ہمارے مقاصد۔مذہب کی تاریخ میں بار بار اس تصور نے نئی زندگی کی شروعات کی ہے [.....] دل کی تبدیلی، یعنی ایک 'metanoia' یعنی نئی آنکھوں سے دیکھیں اور نئے ذہن سے سمجھیں اور ان کی توانائیوں کو زندگی کے نئے طریقوں کی طرف موڑیں۔''

سچائی کی تعلیم بالکل اسی چیز کا مطالبہ کرتی ہے، اور میرے خیال سے ہمارے دونوں مذاہب میں تمام ضروری ذخائر موجود ہیں جن کا استعمال ہمیں خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے کرنا چاہیے، تاکہ تمام پیش رفت ایک ایسی پیش رفت ثابت ہوسکے جو انسانی ہو۔

سوالات و مداخلات

سچائی یا انصاف کا مطلب کیا ہے، کیا یہ نظریات کی جائز قسم ہے؟

صالحہ ایس محمود :

اگر ہم سچائی کے معاملہ کو اٹھائیں تو ہمیں سب سے پہلے یہ جاننا ہوگا کہ سچائی کا اصل مطلب کیا ہے۔ لہٰذا کیا ہمیں سب سے پہلے اس کی واضح تعریف جاننے کی ضرورت نہیں ہے کہ سچائی کا اصلی مطلب کیا ہے؟

گیبریل :

ہمیں اس حقیقت سے کنارہ کش ہونا پڑے گا کہ دوسرا وہ شخص ہے جسے اپنی زندگی میں مخصوص مواقع حاصل ہیں۔ مثال کے طور پر جان رالس (John Rawls) تعمیری طور پر یہ کہتے ہوئے اس معاملہ پر پہنچتے ہیں : یہ تصور کیجئے کہ آپ ایک مخصوص کمرے میں موجود ہیں اور جب آپ اس کمرہ کو چھوڑتے ہیں، تو آپ کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ کیا ہونے جارہے ہیں - کیا آپ کسی افریقی ملک میں ایک کسان ہونے جارہے ہیں یا پھر لاطینی امریکہ کے کسی ملک میں کوئی عورت۔ اسی لیے یہاں پر جو مسئلہ درپیش ہے وہ ایک ضابطہ کی تشکیل ہے جسے ہم اب بھی صحیح پائیں گے، اس کے باوجود کہ ہم نے اس مقام کو چھوڑ دیا ہے جس میں ہم رہنے کے عادی ہو چکے تھے۔

خیالات کی اسی تبدیلی کو میں نے اپنی تقریر میں بیان کیا : اگر ہم خود سے یہ سوال کرتے ہوئے دنیا کی طرف دیکھ سکیں کہ کیا ہم یہاں اور وہاں پر مختلف حالات میں زندگی گزار سکتے ہیں، تو ہم اس کا جواب جان سکتے ہیں کہ سچائی کا اصل مطلب کیا ہے۔ اور میں یہ سوچتا ہوں کہ لوگ کچھ اختلافات کو برداشت کرتے ہیں۔ دنیا میں ہر کوئی امیر آدمی نہیں بن سکتا اور ہم شاید ایسا بننے کی خواہش بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن بچوں میں پیدائشی طور پر سچائی کی فہم ہوتی

ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کے پاس بچوں کا ایک گروپ ہے اور کچھ چیز صحیح طریقے سے انجام نہیں پا رہی ہے، تو وہ کہتے ہیں، ''لیکن یہ درست نہیں ہے!''۔ ہم میں سے تمام لوگ اس بنیادی سچائی کی سمجھ رکھتے ہیں اور جب ہم یہ پوچھنے کی طرف بڑھتے ہیں کہ سچائی کیسے سیکھی جاسکتی ہے تو شاید ہمیں اس کی واضح تعریف کی ضرورت نہیں پڑتی۔

ظاہر ہے کہ مسئلہ اب بھی اپنی جگہ بنا ہوا ہے، جس کا میں نے اب تک جواب نہیں دیا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم یہ سوال پوچھنا شروع کرتے ہیں کہ سچائی کا صحیح مطلب کیا ہے تو اس وقت ہم ایک ناانصافی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ ہمیں اس کے ساتھ کیسا ردعمل ظاہر کرنا چاہیے؟ ناانصافی کی حالت میں تشدد کی کس حد تک اجازت ہے؟ حالانکہ عیسائی روایت میں ہمارے پاس عدم تشدد کا موقع ہوتا ہے لیکن یہ بالکل آسان نہیں ہے کہ ''برائی پر اچھائی سے جیت حاصل کریں'' (Rm 12:21) اور اس کا کوئی عام حل نکالیں۔

بشتیہ :

اس موقع پر میں 1996 سے ہونے والی ایرانی آسٹریائی کانفرنس کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس میں سچائی کے اس بڑے مسئلہ پر بحث ہوتی رہی ہے اور جس کی وجہ سے ہمیں اس پر گہرائی سے غور کرنے کا موقع ملا۔ اس کی آخری کانفرنس ''امن اور انصاف اور موجودہ دور میں اس کے خطرات'' (تہران، 2003) عنوان پر ہوئی اور ایک بار پھر دونوں کانفرنس زبانوں، یعنی فارسی اور جرمن کے ساتھ ساتھ عربی میں بھی شائع ہوئی۔ لہٰذا دس برسوں سے ہم اپنے ایرانی دوستوں کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں اور عیسائی اور اسلامی نظریہ کے مطابق انصاف یا سچائی سے متعلق اس پورے سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مساوات اور انصاف ایک دوسرے سے کس طرح جڑے ہوئے ہیں؟

بیلا ربی :

اگر ہم اس نظریاتی موضوع پر گفتگو کرتے رہیں تو، مجھے سچائی اور مساوات یا مساوات

اور انصاف کے درمیان تعلق کے بارے میں مزید جانکاری حاصل کرنے میں خوشی ہوگی :
اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں نظریات کے بارے میں کافی غلط فہمیاں ہیں۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ مساوات کا معنی وہی ہے جو کہ انصاف کا۔ یا کیا ہم انصاف کو وہ اہم اصول مان سکتے ہیں جو ہمیں یہ سمجھانے کے لائق ہو کہ مساوات کا صحیح مطلب کیا ہے؟ میرے خیال سے ان دونوں نظریات کی وضاحت ضروری ہے۔

گیبریل :

میرے خیال سے اس بات پر ہمارا اتفاق ہوسکتا ہے کہ مساوات کی شناخت انصاف کے ساتھ نہیں کی جاسکتی۔ لیکن لوگ کس چیز میں برابر ہیں اور کس چیز میں نابرابر؟ اور کون سی نابرابریاں صحیح ہیں اور کنہیں صحیح نہیں گردانا جاسکتا؟

مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے تمام انسان بطور انسان برابر ہیں جن کی تخلیق خدا نے کی ہے۔ اس طرح انھیں بنیادی عظمت حاصل ہے اور یہ تمام ممکنہ اختلافات سے پہلے آتی ہے۔ پھر بھی ایک بڑی بحث موجود ہے: کیا چیز پہلے آتی ہے، اختلاف یا مساوات؟ چاہے وہ مرد یا عورت کا تذکرہ ہو یا مذاہب کا تذکرہ۔ اول یہ کہ کیا ہم سبھی برابر ہیں یا مثال کے طور پر، اپنے مذہب کی وجہ سے نابرابر؟ میرے خیال سے برابری کا ایک واضح موقع ہونا چاہیے۔

لیکن پھر، یہ اختلافات کس حد تک ہوسکتے ہیں یا پھر یہ کون سی سماجی تشکیل اختیار کرسکتے ہیں، سچائی سے متعلق مذاکرہ میں اس کی تعریف نہیں کی گئی ہے۔ یہ واقعی ایک کافی مشکل فلسفیانہ مسئلہ ہے: یہ تمام اخلاقی نظریات فطری سائنس کے علم سے بالکل مختلف ہیں۔ اخلاقی سوالات ہمیشہ کچھ نہ کچھ ایسے موضوعات چھوڑ جاتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ ہم ہمیشہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اخلاقی طور پر صحیح ہے اور یہ اخلاقی طور پر غلط – اور یہ درست ہے اور یہ نادرست۔

ہم سچائی کی تعلیم کیسے حاصل کرسکتے ہیں؟

خوری :

اگر ہم پروفیسر گیبریل کے مقالہ کے عنوان کی طرف رجوع کریں تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ یہ سچائی کی تعلیم پر ہے۔ مجھے اس کے بارے میں مزید جاننے میں خوشی ہوگی کہ وہ شرائط یا ماحول کیا ہیں جن میں کوئی سچائی کا صحیح فہم حاصل کرتا ہے اور سچائی کی پریکٹس کا احساس کرتا ہے۔ کیا سچائی کی تعلیم ہم سب سے پہلے اسکول میں، یا جیسا کہ میں سوچتا ہوں، فیملی میں حاصل کرتے ہیں؟

اگر میں فیملی کے بارے میں یہ سوچوں کہ یہ بنیادی ماحول ہے، تو میرے ذہن میں بہت سی سطحیں آتی ہیں : اول، یہاں پر آپ سچائی کی پریکٹس سیکھتے ہیں، اور سچائی کی نامکمل شکل بھی۔ دوم، باہمی اتفاق کے ذریعے عام سچائی پر غلبہ حاصل کرنا بھی آپ فیملی میں سیکھتے ہیں۔ سوم، عام سچائی اور باہمی اتفاق پر محبت، ذات سے مبرا محبت کے ذریعے آپ غلبہ حاصل کرنا سیکھتے ہیں۔ میری رائے میں، یہ سچائی کی تعلیم حاصل کرنے کے شروعاتی اقدام ہیں، یہاں تک کہ معاشرے کے دائرہ کار میں اور بین الاقوامی رشتوں میں۔

ساتھ ساتھ خاندانوں اور اسکول کے تمام تر مسائل

گیبریل :

میں نے اپنے مقالے میں اسے شامل کیا تھا لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے اسے چھوڑ دیا کیوں کہ میں نے سوچا کہ ہم اس بات کو آسانی سے لے سکتے ہیں کہ فیملی سوشلائزیشن کی بنیادی جگہ ہے۔ اس کے بعد میں نے اس مسئلہ کے کنارہ کشی اختیار کرلی کہ آج کل نامکمل خاندانوں میں سچائی کی یہ تعلیم میڈیا کے اثر کی وجہ سے پریشان کن بن چکی ہے۔ اگر یہ واقعی ہوتا ہے کہ فیملی بچوں کے سوشلائزیشن میں اپنے بنیادی رول کو کھوتی ہے تو معاشرہ کا بنیادی

عنصر ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد یہ کام اسکولوں کو کرنا پڑ سکتا ہے لیکن یہ بھی اس کے ساتھ بہت محدود طریقے سے انصاف کر سکتے ہیں : کیوں کہ یہاں پر ہمیں سماجی تعلیم کی ایک بہت ہلکی جھلک دیکھنے کو ملے گی۔ دراصل، اس کے متعدد مضبوط اصول ہیں جو کہ تعلیم کے میدان میں بکھرے ہوئے ہیں : جب میڈیا کا اثر زیادہ پڑنے لگتا ہے تو کوئی بھی شخص حقیقت میں نہیں جانتا ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ ایسی حالت میں ہم لوگوں کو اس قابل کیسے بنا سکتے ہیں کہ وہ ایک اخلاقی شناخت حاصل کریں، یعنی ایک کھلی ہوئی اور لچکداری شناخت جو خیالات کے قدیم نظام میں جکڑی ہوئی نہ ہو بلکہ دوسروں لوگوں کے ساتھ مباحثہ کے لیے کھلی ہو؟ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہی سچائی کی تعلیم کی بنیادی اہمیت ہے۔

درستی کی تلاش کے لیے ہماری ارضی حالت میں نادرستی کی بھی ضرورت ہے

بشتیہ :

یہ جاننے میں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، مذکورہ بالا غیر یقینیت اور موجودہ دور میں بچوں کے سوشلائزیشن سے متعلق تمام مسائل ہمیں اس حقیقت کو یاد دلا سکتے ہیں کہ یہاں پر ہمارے ارضی حالات ہیں، ہم اب بھی اپنے راستے میں ہیں اور ابھی مکمل نہیں ہیں اور ہم ابھی اپنی منزل پر نہیں پہنچے ہیں۔ اس حالت میں ہمیں درستی کی تلاش کی ضرورت ہے اور نادرستی کی ہمت بھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نادرستی کے ساتھ یوں ہی چپکے رہیں۔ ایسا کرنے پر ہم ایک خطرناک نظریہ کو جنم دیں گے، یہ چھوڑ کر کہ ہمیں درستی کی تلاش نہیں کرنی ہے۔ اس شرط پر کہ ہمارے دماغ میں درستی کا ایک نظریہ ہے اور ہم اسے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، تب جو کچھ نادرست ہے اسی کے ذریعے ہم درست تک پہنچ سکتے ہیں۔ جیسا کہ پال نے کہا ہے کہ ''ہم صرف جزوی طور پر جانتے ہیں، لیکن جب مکمل حاصل ہو جاتا ہے، تو جزوی ختم ہو جاتا ہے'' (1 Cor 13:9 f.)۔ ورنہ اخیر میں ہم حقیقت کے نیچے دب جائیں گے کیوں کہ ان ارضی حالات میں ہم یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مکمل یا درستی کو حاصل کرنے کے اپنے

راستے میں ہم اب بھی نامکمل ہیں۔

عیسائی ہونے کے ناطے ہمیں جیسس نے یہ حکم دیا ہے کہ ''اسی لیے تم بالکل مکمل یا درست ہو جاؤ جیسا کہ تمہارا باپ مکمل اور درست ہے'' (Mt 5:48)۔ لیکن اس کے بغیر کیسے خدائی حکم کے ماتحت رہ سکتا ہوں کہ صرف اس کے لیے جدوجہد کر کے ہی میں اسے پورا کرنے کے لائق ہو جاؤں گا۔ اگر مجھے صحیح مشورہ دیا جائے تو، یہ اسلام کے لیے بھی فیصلہ کن ہے، جب مسلمان روز بروز عبادت کر رہے ہیں، ''ہم اسی کے لیے عبادت کرتے ہیں، اور اسی کی مدد چاہتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا'' (آیت 1,5 f.)، اور لگاتار اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ''[.....] خدا سب کی نگہبانی کرتا ہے، اور وہ تمام چیزوں سے باخبر ہے۔'' (آیت 3,73)۔

اینی ماری شیمل نے ہمیں جس طرح سمجھایا ہے، یہ ایک تعجب خیز حقیقت ہے کہ تمام صوفیوں سے برتر، مسلمان یہ جانتا ہے کہ خدا کا راستہ لامحدود طور پر دور ہے۔ لیکن سچائی مومن یہ جانتا ہے کہ اس راستے کا لامحدود خدا میں ہے۔ لامحدود راستے کی علامت سے خدا کے لامحدود کو سمجھنا واقعی دلچسپ ہے۔ بالفاظ دیگر، اس تصور کے ساتھ کہ دماغ میں کیا مکمل ہے، میرے خیال سے ہم تمام کو نامکمل ہونے کی ضرورت ہے، یعنی ہم اب بھی راستے میں ہیں اور مکمل کی تلاش کر رہے ہیں۔

مکمل نہ ہونے کی آڑ میں ہمیں کچھ غلط نہیں کرنا چاہیے

صالحہ ایس محمود :

ہمیں کافی محتاط ہونا پڑے گا اور یہ نہیں بھولنا ہوگا کہ مکمل نہ ہونے کی آڑ میں ہم کوئی غلطی نہ کریں۔ بلکہ ہمیں اس حقیقت کو قبول کرنا چاہیے کہ ہم مکمل ہو سکتے ہیں اور یہ کہ ہم مکمل یا درستی کی تلاش کرنے کے قابل ہیں۔ اس لیے اسے ہمت کی ضرورت نہیں ہے، اسے صرف یہ قبول کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم نامکمل (نادرست) ہیں۔

استاد ہونے میں مثال کا رول

ماربو :

پہلے پروفیسر گیبریل نے جو کچھ کہا میں اس میں اسکول کے رول کے حوالے سے کچھ جوڑنا چاہتا ہوں کہ استاد ہونے کی صورت میں مثال کے رول کو درکنار کر دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ جدید تعلیمی نظریوں میں بھی۔ دراصل، یہ ایک حیرت ناک چیز ہے اور ہمیں اس کے اسباب پر بھی غور کرنا چاہیے۔

گیبریل :

ہم عصر ثقافتی منظر نامہ میں دو خالی مقامات ہیں : خودمختار، خود اعتماد فرد کا اعلیٰ معیار تاکہ دوسرے گوشے اس کے اندر داخل نہ ہوسکیں۔ اسی سے جڑا ہوا دوسرا عنصر بھی ہے، یعنی ذاتی فروغ کی ڈائنمک فطرت کو درکنار کر دیا جاتا ہے اور ایک قدیم گوشہ تک محدود کر دیا جاتا ہے جو کہ سائنسی اصولوں سے جڑا ہوا ہے۔ بلاشبہ، بایوٹیکنالوجی، یوتھانیشیا وغیرہ کے میدان میں ہم ان اصولوں کا استقبال کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ اہم ہے۔ دوسرے جز کو نکارا نہیں جانا چاہیے، یعنی اخلاقی اقدار کے میدان میں ذاتی فروغ جو کہ مذہبی تعلیم کے لیے بھی ضروری ہے۔ اس گوشہ کے بارے میں بعض چیزیں بڑی پرجوش اور تحریک فراہم کرنے والی ہیں : کہ ہم ان کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے، کہ حل کے لیے کوئی واضح نقوش نہیں ہیں، جو کہ ہمیشہ کے لیے صحیح ہوں، لیکن خدا تک پہنچنے اور خدا میں ضم ہونے کا تاعمر کا ایک راستہ ہے؛ ایک ایسا راستہ جو کبھی بھی سر نہیں کیا گیا اور جہاں پر ہمیں مکمل یا درست ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور شاید ذاتی مثال کا یہ گوشہ اب بھی کثیر ثقافتی اور کثیر مذہبی شرائط میں جکڑا ہوا ہے۔

ایک بہت اچھی مثال جو میں نے ایک اخبار میں پڑھی : ایک بوڑھی عورت ہمیشہ غیر ملکیوں سے خائف رہتی ہے کیوں کہ وہ غیر ملکی زبان بولتے ہیں۔ لیکن ایک دن جب وہ ایک

سڑک پر غش کھا کر گر گئی تو ایک ترکی کی ایک فیملی نے اسے سہارا دیا، اس کا ہاتھ تھاما اور ایمبولینس کو بلایا جب کہ ادھر سے گزرنے والے افراد میں سے کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ ایسی حالت میں ایک اخلاقی تعلیم کا عمل کام کرتا ہے — اس ترکی فیملی کے فطری برتاؤ کے ذریعے۔ یہ بوڑھی عورت اب دنیا کو دوسرے نظریہ سے دیکھے گی کیوں کہ اس فیملی نے ایسا کام کیا۔ یہ ہماری روزمرہ زندگی کا عمل ہے جو کہ دلچسپ ہوگا۔

انسانی حقوق کی تعلیم

ارمگارڈ ماربو

عالمی پیمانے پر مختلف طریقوں سے حقوق انسانی کا استحصال اب بھی انسانیت کے لیے سب سے بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ 1948 میں حقوق انسانی کے متعدد بین الاقوامی اور علاقائی کنونشن کے تحت حقوق انسانی کے عالمگیر اعلامیہ کے منظر عام پر آچکنے کے بعد بھی یہ صورت حال بنی ہوئی ہے اور حقوق انسانی کے تحفظ اور احترام کے لیے اب بھی بڑی تعداد میں اعلامیوں اور پروگراموں کو نافذ کرنے کا عمل جاری ہے۔ ان اختلافات کے باوجود یو این سکریٹری جنرل کوفی عنان نے 2001 میں کہا تھا:

''بین الاقوامی برادری ابھی پابندی کے ایک دور سے نکلی ہی ہے۔ اسے اب نفاذ کے دور میں داخل ہوجانا چاہیے جس میں وہ ان تمام خواہشوں اور ذرائع کو متحرک کرے گی جس کی اسے اپنے ذریعے کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے کے لیے ضرورت پڑے گی۔''

اس کے لیے حقیقت میں پہلے سے ہی وہ تمام میکانزم اور طریق عمل موجود ہیں جو حقوق انسانی سے متعلق مختلف آلۂ کار کے ذریعے ان حقوق کی تعمیل کی نگرانی کرتے ہیں اور جو اس کے نفاذ میں مدد کریں گے۔ وہ اپنی توجہ ریاست کی رپورٹ پر مرکوز کرتے ہیں کیوں کہ ریاستی پارٹیوں کو پابندی کے ساتھ ان مانیٹرنگ تنظیموں کو اپنی رپورٹ پیش کرنی ہوتی ہے جن کی تشکیل آزاد ماہر کمیٹی کے طور پر کی جاتی ہے اور جن کا کام کنونشن کے ذریعے پاس کیے گئے حقوق پر تعمیل کرانا اور انھیں نافذ کرانا ہوتا ہے۔ بعض حقوق انسانی کنونشن میں کسی فرد کے ذریعے کی گئی شکایتوں کو سننے کی سہولت بھی دستیاب ہوتی ہے یا پھر دوسرے طریق عمل کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حقوق انسانی کنونشن کی حکم عدولی کا مطلب ہوتا ہے بین الاقوامی قوانین کی خلاف

ورزی کرنا جس کی سماعت ہاگ کے انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں ہوسکتی ہے۔

بہر حال یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ آلۂ کار ان بین الاقوامی حقوق کو تسلی بخش طور پر نافذ نہیں کرتے۔ اسی لیے اس سے منسلک تمام افراد کی مجموعی شرکت اور بڑے پیمانے پر اس کے تئیں بیداری پیدا کرنے کو کافی اہمیت عطا کی گئی ہے۔ حقوق انسانی کو تبھی نافذ کیا جاسکتا ہے جب ایک ایسا 'حقوق انسانی کلچر' پیدا کیا جائے جو ہر فرد واحد کی ذمہ داری کو اپیل کرتا ہو۔

1. اقوام متحدہ کی انسانی حقوق سے متعلق دہائی

اقوام متحدہ نے اسی لیے ''حقوق انسانی کی تعلیم کا عشرہ'' (1995-2004) کا اعلان کیا۔ اس کا مقصد عالمی پیمانے پر حقوق انسانی کے نفاذ کے علم کو فروغ دینا ہے۔ حقوق انسانی کی تعلیم میں بڑے پیمانے پر کی گئی کوششوں سے ''بڑے پیمانے پر حقوق انسانی کے عالمگیر اعلامیہ (Universal Declaration of Human Rights, UDHR) کے طور طریقوں، نظریات اور اقدار کے بارے میں بیداری اور سمجھ بوجھ'' پیدا ہوگی۔ حقوق انسان کی تعلیم کے حق کو UDHR کے آرٹیکل 26 سے اخذ کیا جاسکتا ہے، جس کے مطابق ''ہر شخص کو تعلیم کا حق حاصل ہے۔ [.....] تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کا مکمل فروغ اور حقوق انسانی اور بنیادی آزادی کے تئیں احترام میں اضافہ ہونا چاہیے۔ [.....]۔''

اقوام متحدہ کے ایکشن پلان کے مطابق حقوق انسانی کی تعلیم کی تشریح اس طرح کی جانی چاہیے ''ٹریننگ، پرچار اور اطلاعاتی کوششیں، جس کا مقصد علم اور مہارت کی تعلیم کے ذریعے حقوق انسانی کے ایک ہمہ گیر کلچر کی تشکیل اور عادات و اطوار میں تبدیلی لانا ہے جس کی سمت درج ذیل ہو:

(a) حقوق انسانی اور بنیادی آزادی کے تئیں احترام کے جذبے کو تقویت بخشنا؛

(b) انسانی شخصیت کا مکمل نکھار اور اس کے وقار کا شعور؛

(c) تمام ممالک، آبائی لوگوں اور نسلی، قومی، مسلکی، مذہبی اور لسانی گروہوں کے

درمیان فہم وشعور، رواداری، جنسی برابری اور دوستی کو فروغ دینا[.....]۔''

پوری طرح سے مستحکم حقوق انسانی کی تعلیم کا مقصد ہے ایک ایسے کلچر کو قائم کرنا جس میں حقوق انسانی کو اچھی طرح سمجھا جاسکے، اس کا دفاع کیا جاسکے اور اس کا احترام کیا جاسکے۔ اس کے ذریعے لوگوں کی ضرورتوں اور اغراض کو اور انفرادی شخص کے ان کے سماجی ماحول سے جڑی ہوئی مہارت اور خواہشات کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ اس لیے حقوق انسانی کی تعلیم مختلف مقامات پر مختلف شکلیں اختیار کرسکتی ہے۔ حقوق انسانی کی تعلیم کے مختلف پس منظر میں اس کے نتائج بھی مختلف ہوسکتے ہیں۔ یہ بات نہایت اہم ہے کہ حقوق انسانی کی تعلیم ایک ایسا منظر نامہ پیش کرے جس میں حقوق انسانی کے معیار کی بنیاد پر خود اپنے اعمال وافعال کو پرکھا جاسکے۔

حقوق انسانی کے اصول اور طریق عمل کی فہم وفراست لوگوں کو اس لائق بناتی ہے کہ وہ اضافی طور پر فیصلہ لینے کے اس عمل میں شرکت کرسکیں جس سے ان کی زندگیوں کا تعین ہوتا ہے۔ حقوق انسانی کی تعلیم کو یہ واضح کرنے کے قابل ہونا چاہیے کہ حقوق انسانی کے اصول اور طریق عمل لوگوں پر مرکوز انسانی، سماجی اور اقتصادی ترقی کو حاصل کرنے کا ذریعہ کیوں ہے۔ اس بنیاد پر عالمی پیمانے کا 'حقوق انسانی کلچر' لوگوں کو – فرد واحد کے طور پر یا ایک گروہ کے طور پر – اس لائق بنائے گا کہ وہ سماجی تبدیلیوں کی خواہش کرسکیں اور اپنے حقوق انسانی کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

تمام تہذیبوں اور مذاہب میں انسانی وقار کو مرکزی اہمیت عطا کی گئی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہر فرد واحد کے حقوق کا تحفظ، جو کہ حقوق انسانی کے نظریہ میں بھی پوشیدہ ہے، متعدد تہذیبوں کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ لیکن روزمرہ زندگی میں انفرادی حقوق کے نفاذ اور ان پر تعمیل کا امکان ترجیحی طور پر شاذونادر ہی نظر آتا ہے۔

مغربی صنعتی ممالک نے نام نہاد پہلی نسل کے حقوق انسانی، یعنی بنیادی حقوق اور بنیادی آزادی کی اہمیت پر خاص زور دیا ہے۔ ترقی پذیر ممالک نے دوسری نسل کے حقوق انسانی،

یعنی اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق اور تیسری نسل کے حقوق انسانی، جیسے بین الاقوامی ترقی، امن اور ماحولیاتی تحفظ کے حقوق کو خاص اہمیت دی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، خاص طور پر تہران کے حقوق انسانی کے عالمی کانفرنس (1968) اور ویانا کے کانفرنس (1993) میں اس بات کی کوششیں کی گئیں کہ تمام اختلافات اور تفریقی لائنوں کو ختم کردیا جائے اور حقوق انسانی کا ہمہ گیر نظام تیار کیا جائے۔ تہران کے کانفرنس میں جہاں ایک طرف عوامی اور سیاسی حقوق، اور اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق کے درمیان موجود رشتے کی نشاندہی کی گئی وہیں دوسری طرف 1993 کے ویانا کانفرنس میں حقوق انسانی کی ہمہ گیریت اور نام نہاد کلچرل روابط پر بحث کی گئی۔ اس بحث کے تحت ثقافتی خصوصیت اور سماج کے انوکھے پن کی شناخت کے ساتھ حقوق انسانی کی ہمہ گیریت کو متحد کرنے کی کوشش کی گئی۔ حقوق انسانی کی ویانا عالمی کانفرنس کے آرٹیکل 5 میں اس کی وضاحت حتمی طور پر یوں کی گئی ہے، ''[.....] جہاں ایک طرف قومی اور علاقائی خصوصیات کی اہمیت اور متعدد تاریخی، ثقافتی اور مذہبی پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے، وہیں سیاسی اقتصادی اور ثقافتی نظاموں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تمام ریاستوں کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام حقوق انسانی اور بنیادی آزادیوں کو فروغ دیں اور ان کا تحفظ کریں۔''

اس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ریاستوں کے ذریعے ثقافتی خصوصیات کے حوالے سے حقوق انسانی کی خلاف ورزی کو بالکل برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے تحت کسی بھی نمائندہ حکومتی نظام کے ذریعے ثقافت اور مذہب کے غلط استعمال اور آلہ کاری کا خاتمہ ہوجانا چاہیے۔

حقوق انسانی کی ہمہ گیر تصدیق کی لازمی بنیاد یہ حقیقت ہے کہ ان کا وجود مخصوص سیاسی، سماجی اور مذہبی مغربی نظام سے عمل میں آیا ہے لیکن پوری دنیا میں اس کے تنازعات اور مسائل کو بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اس کا تعلق 'اقتدار اعلیٰ والی ریاست' کے پھیلاؤ سے ہے جو کہ

انسان کے باہمی وجود کی ایک تنظیمی شکل ہے اور جسے مختلف تہذیب وثقافت اور مذاہب کے مدنظر پوری دنیا میں مقبولیت حاصل ہورہی ہے۔

اسلامی ممالک میں بھی 'امت' کو حقیقت میں مسلم برادری کی تنظیمی شکل کے طور پر نہیں دیکھا جاتا بلکہ زیادہ تر ممالک کا وجود خود اپنے لیے 'سلطنت' کے قیام کے تحت عمل میں آیا ہے۔ اس کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ باہری طور پر ایک ایسا اقتدار اعلی جو بین الاقوامی روابط میں مساوی حقوق کے ایک اداکار کے طور پر ہے بلکہ اندرونی طور پر وہ مکمل اختیارات کا مالک ہے، اسے انفرادی حکمرانی حاصل ہے اور وہ اپنے علاقے میں طاقت کا استعمال لوگوں پر کرتا ہے۔

طاقت کے استعمال میں یہ اجارہ داری انسانی وجود کے لیے خطرہ بھی ہے۔ اس لیے بادشاہی طرز حکومت کو اختیار کرنا غیر مستحکم ہوگا کیوں کہ اس میں حقوق انسانی کے نظریہ کو قبول نہیں کیا جاتا۔ اس طرح کے ممالک میں ہونے والے تشدد اور ایذا رسانی کے بے شمار تجربے کی بدولت یہ نظریہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ جدید ریاستوں کے ذریعے پیدا ہونے والے خطرات اور ناانصافی کے مخصوص تجربے پوری دنیا میں ایک ہی جیسے ہیں اور یہ تمام کلچر سے آزاد ہیں، جیسے ظلم وجبر، بنیادی آزادی مہیا نہ کرنا، پولس کی جابرانہ حکومت یا پھر طریق عمل کی بنیادی گارنٹی سے انکار۔

اس کے علاوہ اس پر بھی سب کا اتفاق ہو چکا ہے کہ بین الاقوامی حقوق انسانی کا نظام پوری طرح لچک دار ہے جس میں مخصوص ثقافتی امتیازات کو شامل کیا جاسکتا ہے اور ان پر غور کیا جاسکتا ہے۔ صرف کچھ ہی انسانی حقوق کو مطلق اور غیر منفک قرار دیا گیا ہے، جیسے اذیت دینے، غلامی اور مجرمانہ افعال کو روکنا۔ لیکن حقوق انسانی کے بڑے حصے کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ مختلف ریاستوں کو بعض پابندیاں عائد کرنے اور آہستہ روی کے ساتھ ان کو پورا کرنے میں آسانی ہوگی۔

اس لیے حقوق انسانی کی تعلیم کے ڈھانچے کے تحت اس کی بڑی اہمیت ہے کہ ایک بڑا

عوامی گروہ ان قوانین کو سراہے۔ اس کا مقصد صرف حقوق انسانی کی تبلیغ کرنا نہیں ہے بلکہ حقوق انسانی کی مانیٹرنگ تنظیموں کے ذریعے عملی طور پر اس کو نافذ کرنا بھی ہے۔ خاص کر جائز پابندیوں کی شرائط کو پورا کرنا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ منظور شدہ پابندیوں اور ان کے غلط استعمال کے درمیان امتیاز کو یقینی بنایا جاسکے۔

3. انسانی سیکورٹی

حقوق انسانی کی تعلیم کے مدنظر حال ہی میں انسانی سیکورٹی کے مسئلہ پر بھی خاصا زور دیا گیا ہے۔ اس کی نشاندہی یو این ڈیولپمنٹ پروگرام (UNDP) کی ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹ 1994 میں کی گئی تھی کہ ترقی کے لیے انسانی سیکورٹی کا معاملہ ایک فیصلہ کن جز ہے۔ انسانی سیکورٹی کے بغیر نہ تو امن قائم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی ترقی ممکن ہوسکتی ہے۔ اس کے مدنظر 'انسانی سیکورٹی' کے نظریہ کی شناخت سب سے اوپر اٹھ کر 'خواہش سے چھٹکارہ' اور 'خوف سے چھٹکارہ' کے طور پر کی گئی تھی۔

تفصیلی طور پر دیکھا جائے تو انسانی سیکورٹی میں خاص طور پر جو چیزیں شامل ہیں وہ ہیں : انفرادی سیکورٹی، اقتصادی سیکورٹی، ماحولیاتی سیکورٹی اور سیاسی سیکورٹی۔ ان گوشوں کی شناخت بنیادی طور پر موجودہ انسانی حقوق کے ساتھ کی گئی ہے۔ ''انسانی سیکورٹی، انسانی حقوق اور انسانی ترقی کے تصورات ایک دوسرے کو ڈھکے ہوئے ہیں، ایک دوسرے کو مضبوطی عطا کررہے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے عارضی ہیں۔''

بعض ممالک نے کناڈا کی قیادت میں ایک بین الاقوامی 'ہومن سیکورٹی نیٹ ورک' کی تشکیل کی ہے۔ 2001 میں پناہ گزینوں کے سابق یو این ہائی کمشنر، سداکو اوگاتا اور اقتصادیات کے لیے نوبل انعام یافتہ، امرتیہ سین کی مشترکہ چیئرمین شپ میں ایک 'کمیشن آن ہیومن سیکورٹی' کی تشکیل ہوئی جس کا کام انسانی سیکورٹی امور سے متعلق ہونے والی پیش رفت کے بارے میں مسلسل رپورٹ دینا ہے۔

مختلف ممالک کے ذریعے انسانی سیکورٹی کی طرف دی جانے والی لگاتار توجہ کا اثر اقوام متحدہ پر بھی پڑا اور اس نے مجموعی سیکورٹی کے معاملے میں بہت سے اقدامات اٹھانے شروع کر دیے۔ جب کہ اس سے پہلے سیکورٹی کا معاملہ صرف ان ہی ممالک سے جڑا ہوا تھا جو باہری خطرات کے مدنظر اپنے علاقوں کا دفاع کرنے میں لگے ہوئے تھے، ان ممالک کے اندر بھی بڑی تیزی سے ملکی خطے کے لیے خطرہ پیدا ہونے لگا تھا جس سے بین الاقوامی سیکورٹی کو بھی خطرہ لاحق تھا، اسی لیے اس قسم کے ممالک کو ان خطروں پر ردعمل کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا۔ لیکن یہ منظر نامہ اب بھی اپنے ابتدائی دور میں ہے اور اقوام متحدہ اور اس کی سیکورٹی کونسل کے ڈھانچے میں ترمیم کر کے ''تحفظ کی ذمہ داری'' کو شامل کرنے کی تجویز پر اب بھی پوری طرح غور نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن 60 ویں برسی کے عالمی اجلاس کے موقع پر حقوق انسانی کے امور اور انسانی سیکورٹی کے مسئلہ اور ''خوف سے آزادی اور خواہش سے چھٹکارہ'' کے امور سے نمٹنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کی رپورٹ نے پہلے ہی حقوق انسانی کے معاملے میں بین الاقوامی سیکورٹی کی نشاندہی کر دی تھی۔

حقوق انسانی کو سیکورٹی کے ایشوز سے جوڑنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ حقوق انسانی کی خلاف ورزی کو انسانی سیکورٹی کے لیے خطرہ قرار دے دیا گیا۔ فوجی تصادم کے بہت سے اسباب اور نتائج ہیں۔ اس لیے حقوق انسانی کی خلاف ورزی کو دونوں طرح استعمال کیا جا سکتا ہے، یعنی موجودہ تصادم کی علامت اور بہت جلد پھوٹ پڑنے والی لڑائی کی ایک وارننگ کے طور پر۔ اس لیے اس سوال پر غور کرنا بہت کم ممکن ہوگا کہ مختلف ممالک اپنے اندرونی معاملوں میں عوام کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں، جس میں دوسرے ممالک اور ممالک کے مجموعوں کو مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ حقوق انسانی کی تعلیم کے ذریعے سیکورٹی اور سیاست کے گوشوں پر بھی توجہ دی جائے گی۔

4. انفرادی حقوق

انسانی حقوق بعض دفعہ متضاد ہوتے ہیں اس لیے ان میں توازن پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ عیسائی – مسلم مذاکرہ کے تحت میں دو مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں : اظہار رائے کی آزادی کا حق اور غریبی سے چھٹکارہ پانے کا حق۔

4.1 اظہار رائے کی آزادی :

UN Covenant on Civil and Political Rights کے آرٹیکل 19، par.1 کے مطابق ہر شخص کو ''بغیر کسی مداخلت کے خیالات کے اظہار'' کا حق حاصل ہوگا۔ اظہار رائے کی آزادی کے حق کی par.2 میں بھی گارنٹی دی گئی ہے جس میں یہ بھی شامل ہوگا: ''تمام قسم کی اطلاعات اور خیالات کی خواہش کرنے، حاصل کرنے اور دوسروں کے ساتھ اسے بانٹنے کی آزادی، جس میں کوئی بھی حد نہیں ہوگی چاہے وہ زبانی ہو، تحریر کی شکل میں ہو، پرنٹ کی شکل میں ہو، آرٹ کی شکل میں ہو یا پھر اپنی پسند کے کسی بھی میڈیا کے ذریعے ہو۔''

اس سلسلے میں UN Covenant واضح طور پر کسی بھی مداخلت کے بغیر اپنی رائے قائم کرنے کے حق اور اظہار رائے کی آزادی کے درمیان خط امتیاز قائم کرتا ہے۔ اول الذکر میں جہاں کسی بھی پابندی کی گنجائش نہیں ہے وہیں اظہار رائے کے حق میں بعض پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ ''خاص مہربانی'' اور ''خاص ذمہ داری'' جو کہ اس حق سے جڑے ہوئے ہیں، اس میں بعض قانونی پابندیاں عائد ہو سکتی ہیں جن کی ضرورت درج ذیل کے مدنظر ہو :

(a) دوسروں کے حقوق یا وقار کا احترام؛ یا

(b) نیشنل سیکورٹی، عوامی نظم و نسق، قومی صحت یا عوامی ضابطہ اخلاق کا تحفظ۔

اس پس منظر میں حقوق انسانی کی تعلیم کا کام اس حق سے متعلق تمام اہم مشمولات کو شامل کرنا اور شرائط یا پابندیوں کو پوری تفصیل کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ اس حقیقت کے مدنظر کہ ان کی تفصیلی اور عمومی تشکیل نہیں ہوئی ہے، کسی شخص کو ان کا ٹھیک ٹھیک مواد حاصل نہیں ہو

پائے گا اور خاص کر اس درستگی کے ساتھ تو بالکل بھی نہیں جو اس کے غلط استعمال سے روکنے کے لیے ضروری ہے۔ یہاں پر اہم چیز یہ ہے کہ بین الاقوامی معیاروں کے بارے میں بتایا جائے۔

اظہار رائے کی آزادی کے سلسلے میں یہ بات تو یقینی ہے کہ ثقافتی اختلافات ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ حال ہی میں ڈنمارک کے کارٹون والے معاملے میں یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے، جس کے تحت ڈنمارک کے ایک اخبار میں حضرت محمدؐ کا ایک کارٹون شائع کرنے کی وجہ سے پوری اسلامی دنیا میں زبردست احتجاج ہوئے۔ اس کی اشاعت سے جڑے افراد اپنی اس ضد پر اڑے رہے کہ یہ اظہار رائے کی آزادی کے حق کا استعمال ہے، لیکن دوسری طرف اس سے مسلمانوں کے مذہبی اعتقاد کو زبردست صدمہ پہنچا جو کہ ان کے مذہب کے بانی کی شان میں ایک بڑی گستاخی تھی۔

اسی لیے اظہار رائے کی آزادی کے قوانین اتنے لچکدار بنائے گئے ہیں تاکہ اس میں دوسروں کے حقوق کا احترام کیا جا سکے اور متعدد معاشروں کے ثقافتی اختلافات کو بھی شامل کیا جا سکے۔ مغربی معاشروں میں مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا رواج عام ہے۔ اسی لیے، حقوق انسانی کی یوروپی عدالت، جو کہ اس آزادی کی وضاحت تفصیل کے ساتھ کرتی ہے، نے بھی آسٹریائی عدالت کے ذریعے ایک فلم کو ضبط کیے جانے پر غور و خوض کیا تھا اس لیے نہیں کہ اس میں اظہار رائے کے خیال کی خلاف ورزی کی گئی تھی بلکہ اس فلم میں خدا، جیسس اور میری کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اہم بات یہ ہے کہ اس عمل کو تحفظ فراہم کیا جانا چاہیے، یعنی حق انسانی کی حدود کی نگرانی ایک قانونی عمل کے ذریعے کی جانی چاہیے۔ اسی طرح اظہار رائے کی آزادی کا حق بھی اس طرح محدود ہونا چاہیے کہ اس کا تجزیہ آزاد اداروں کے ذریعے کیا جا سکے، چاہے وہ عدالت کے ذریعے ہو یا پھر آزاد کمیشن کے ذریعے۔ اس سلسلے میں اٹھائے گئے تمام اقدامات کی پوری طرح جانچ ہونی چاہیے۔

یہاں پر یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ حقوق انسانی اور بنیادی آزادی کے یوروپی کنونشن کے برخلاف عوامی اور سیاسی حقوق کے اقوام متحدہ کے عہد و پیمان میں ریاستوں کی یہ ذمہ داریاں بھی شامل ہیں کہ وہ اس قسم کی رائے کے اظہار کے خلاف قدم اٹھائیں جو حقوق انسانی اور دیگر مشترکہ اقدار کے خلاف ہوں۔ اقوام متحدہ کے عہد و پیمان کے آرٹیکل 20 کے مطابق قانون کی مدد سے ریاستوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ''جنگ کے لیے کسی بھی قسم کے پروپیگنڈے'' اور امتیاز، عداوت یا تشدد پر مبنی قومی، نسلی یا مذہبی منافرت کی وکالت کرنے'' کے خلاف سخت قدم اٹھائے۔ اقوام متحدہ کا یہ کنونشن نسلی امتیازات کی تمام شکلوں کے خاتمہ کی بھی بات کرتا ہے۔

حقوق انسانی کی ایک یوروپی عدالت نے ایک صحافی کو اس لیے برخاست کر دیا تھا کیوں کہ اس نے ٹی وی پر ایک شدت پسند گروہ کے انٹرویو کو نشر کیا تھا جس میں نسلی تعصب اور غیر انسانی باتیں کی گئی تھیں، یوروپی عدالت نے اس عمل کو اطلاع کی آزادی اور بغیر کسی مداخلت کے اظہار رائے کی آزادی کی خلاف ورزی بتایا تھا۔ اس نشریہ کو درست ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی کہ اس کو نشر کرنے کی اطلاع پہلے ہی دے دی گئی تھی کہ اس میں غیر جانب داری سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن مناسب تنقید اور غیر جانبداری کے بغیر ٹی وی پر پیش کیے گئے اس انٹرویو کو اظہار رائے کی آزادی کے طور پر درست نہیں گردانا جا سکتا۔

جب دوسروں کے حقوق کے ساتھ ساتھ فرد واحد کے حقوق کا موازنہ کرنے کی بات آتی ہے تو یہ معیاروں کا سوال نہیں ہے جنھیں ایک ہی طرح تمام ممالک میں نافذ کیا جا سکتا ہے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ الگ الگ ممالک کے سماجی حالات کیا ہیں، ان کا اندازہ کرنا۔ یوروپی ممالک کے ہم جنس کلچر پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ ایک ہی ملک میں، مختلف قومی اقدامات اظہار رائے کی آزادی کو محدود کرتے ہیں جو کہ ضروری اور اہم تصور کیے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مختلف سماجی پس منظر میں ایک ہی قانون کے مختلف قانونی نتائج سامنے آ سکتے ہیں اور اس

میں کسی کو مخالفت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی لیے حقوق انسانی کی تعلیم کے ڈھانچے میں حقوق انسانی کی جانچ کے دونوں سماجی پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہے : ایک جانب حقوق انسانی کے ذریعے محفوظ شدہ اظہار رائے کی آزادی کے مشمولات اور اس کے مقاصد، اور دوسری جانب ان قانونی ضابطوں اور شرائط کی پاسداری جو حقوق انسانی کی حد کا تعین کرنے کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں تاکہ عوام کی حفاظت کی جاسکے اور ایک دوسرے کے خلاف بہت سے انسانی حقوق کی نگرانی کی جاسکے اور ان کا اندازہ لگایا جاسکے۔

4.2 کوئی محتاج نہ ہو

غریبی آج کل سب سے بڑا مسئلہ جو پوری انسانیت کو درپیش ہے۔ تقریباً تمام تر UN Millenium Development Goals اسی سوال کے اردگرد گھوم رہے ہیں کہ کیسے اس دنیا میں بنیادی ضروریات کی چیزوں کی مناسب تقسیم کو ممکن بنایا جاسکے اور انسانوں کو دستیاب مواقع میں اضافہ کیا جاسکے۔ حقوق انسانی کے نقطۂ نظر سے خواہش سے آزادی کے حق کو زیادہ تر اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق کے نظریہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر Internationl Covenant on Economic, Social and Cultural Rights کے آرٹیکل 11 میں یہ مذکور ہے :

''1. موجودہ عہد و پیمان کی تمام ریاستی پارٹیاں ہر شخص کی معیار زندگی اور اس کے خاندان کی معیار زندگی کے حق کو تسلیم کرتی ہیں، جن میں وافر کھانا، لباس اور مکان اور زندگی کی حالت میں مسلسل بہتری بھی شامل ہیں۔ تمام ریاستیں اس حق پر عمل درآمد کرنے کے لیے مناسب اقدام اٹھائیں گی اور اس حق کو تسلیم کرنے کے تحت بلاشرط منظوری پر مبنی بین الاقوامی باہمی تعاون کو بنیادی اہمیت دیں گی۔''

ریاستوں کی ان ہی ذمہ داریوں کے تحت ''زندگی کے حق'' کو کافی اہمیت دی جارہی ہے

جو عام طور پر اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق پر مبنی ہے۔ پہلی نسل کے حق انسانی کے طور پر زندگی کا حق نفاذ کے بہترین مواقع فراہم کرے گا اور کسی ایک ملک کی اقتصادی اور مالی حالت پر کم منحصر ہوگا۔ لیکن آج کل زندگی کے اس حق کو عام طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔

UN Covenant 1 کے معاہدہ کی مانیٹرنگ کمیٹی نے غذا کے حق سے متعلق میں اس ضمن میں اور اس سے متعلق انسانی حقوق کے دیگر امور کی بابت General Comment (1999 کے نمبر 12) پر درج ذیل ذمہ داریاں سونپیں ہیں :

(1) ''احترام کرنے'' کی ذمہ داری، یعنی مناسب غذا تک رسائی کا حق اور ان اقدامات سے دور رہنا جو اس قسم کی رسائی سے روک سکتی ہیں،

(2) ''حفاظت کرنے'' کی ذمہ داری، یعنی وہ اقدامات کرنا جو اس بات کو یقینی بنائیں کہ غذا تک رسائی میں کوئی تیسری پارٹی حائل نہ ہو یا اسے محدود نہ کرے، چاہے وہ فرد واحد ہوں یا پھر کمپنیاں،

(3) ''پورا کرنے'' (یا ''فراہم کرنے'') کی ذمہ داری، یعنی ریاستیں ایسے کام ضروری کریں جن سے لوگوں کی رسائی غذا تک ہو سکے، لوگ انھیں استعمال کر سکیں، اور ریاستیں لوگوں کو زندگی کی بنیاد فراہم کر سکیں جس میں غذائی سامان کا تحفظ بھی شامل ہے،

(4) ''فراہم کرنے'' کی ذمہ داری میں لوگوں کو یا پھر گروہوں کو غذا فراہم کرنا ہے جو اپنے غذائی حق کو اپنے طور پر استعمال نہیں کر سکتے۔ اس میں قدرتی یا دیگر آفات کے متاثرین بھی شامل ہیں۔

ان ناتشفی بخش ریاستی رپورٹوں کی تنقید کرنے کے بعد اس کمیٹی نے آخر کار اپریل 2000 میں ایک اسپیشل رابطہ کار کو نامزد کیا اور اسے خود اپنے آپ ریاستوں کا دورہ کر کے، قومی ذمہ داریوں کے بارے میں رپورٹ کرنے کی آزادی عطا کی اور ساتھ ہی اس عمل کو بہتر اور بااثر بنانے کے لیے تفصیل کے ساتھ اپنی تجویز پیش کرنے کی بھی آزادی عطا کی۔

حقوق انسانی کی تعلیم کے سلسلے میں ہمیں اس حقیقت کا ذکر کرنا ہوگا کہ غذا حاصل کرنے کا حق اور مناسب طرز زندگی بنیادی طور پر اپنے حق کے ساتھ ساتھ اپنی ریاست کو بھی پیش کرتی ہے۔ یہ صرف دنیاوی مال و دولت کے سیاسی دعوے کا ہی سوال نہیں ہے بلکہ یہ ہر ایک کا حق ہے کہ اس کے آبائی ملک کے ذریعے ان ذمہ داریوں اور ان حقوق کا احترام کیا جانا چاہیے۔

یہ نہایت اہم ہے کیوں کہ اس پر بہت سی تحقیقات ہو چکی ہے کہ غریبی کی وجہ اور بنیاد کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ مسئلہ صرف اشیا، بنیادی طور پر غذا کی عدم دستیابی کا ہی نہیں ہے بلکہ مختلف ممالک میں اس میں رخنہ اندازی اور خسارہ اس سے بھی سنگین مسئلہ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صنعتی ممالک ان ذمہ داریوں سے آزاد ہیں۔ بلکہ اس بنیاد پر ترقی پذیر ممالک کی بہتری کو مدنظر رکھتے ہوئے واضح اور تفصیلی تجویزیں پیش کی جانی چاہئیں۔

اس سلسلے میں، ایک اہم قدم انفرادی حقوق انسانی کے نفاذ میں کارگر ثابت ہوسکتا ہے۔ دیگر ماہرین کے ساتھ ساتھ یہ اقتصادیات کے نوبل انعام یافتہ امرتیہ سین تھے، جو اس نتیجہ پر پہنچے۔

متعدد مطالعوں اور تاریخی تحقیق کی بنیاد پر ضروریات اور اور بھوک کو ختم کرنے کے لیے انھوں نے درج ذیل شرائط کو ضروری قرار دیا :

1. UN Covenant on Civil and Political Rights، آرٹیکل 25 کے تحت عوامی امور میں شرکت کرنے کا حق، اور

2. UN Covenant کے آرٹیکل 19 کے تحت اظہار رائے کی آزادی۔

انھوں نے اس کی وضاحت اس حقیقت کے تحت کی کہ غریبی کی اصلی وجہ اشیا اور غذا کی کمی نہیں ہے بلکہ اس کی اصل وجہ ان کی صحیح تقسیم نہ ہونا ہے۔ دنیا میں وافر مقدار میں غذائی اجناس ہیں اس لیے کوئی بھی آدمی بھوکا نہیں مرسکتا۔ لیکن غیر جمہوری ممالک میں ان کی صحیح تقسیم نہیں ہو پاتی۔ اور یہ کوئی اتفاق نہیں ہے یا اس وجہ سے نہیں ہے کہ زیادہ تر جمہوری ممالک ماحولیاتی طور پر موافق علاقوں میں ہیں؛ اس کا لینا دینا مکمل پاور سے بھی ہے۔ چونکہ غریبی

بنیادی طور پر تقسیم کا مسئلہ ہے، غیر جمہوری حکمراں بڑی آسانی سے جو کچھ دستیاب ہے اسے غلط طریقے سے تقسیم کر سکتے ہیں۔ عام طور پر، غریب ممالک میں بھی ان حکمرانوں کو ضروریات یا بھوک سے واسطہ نہیں پڑتا ہے۔ لیکن جمہوری ممالک میں انھیں پورے ملک کے سامنے جوابدہ ہونا پڑتا ہے اور اسی لیے وہ غذائی اجناس کی صحیح تقسیم کو یقینی بناتے ہیں۔

اس طرح، سین نے فوری طور پر اس کی وضاحت پیش کی کہ کس طرح متعدد حقوق انسانی طبقے ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں۔

5. پیش قدمی

حقوق انسانی کی تعلیم کے اقوام متحدہ کی دہائی کے ڈھانچے میں بہت سی پہل کی گئی۔ مثال کے طور پر ''ہیومن سیکورٹی نیٹ ورک'' کو مالی میں 2003 میں پیش کیا گیا جو کہ "Understanding Human Rights" کے عنوان سے حقوق انسانی کی تعلیم کا ایک کتابچہ ہے، جسے متعدد زبانوں میں ترجمہ کیا گیا، جیسے عربی، چینی اور روسی زبان۔ حقوق انسانی اور جمہوری کے گراز کے یوروپی ٹریننگ اور ریسرچ سنٹر نے اس کتابچہ کی ایڈیٹنگ کی ہے۔ اس کا انگریزی میں دوسرا ایڈیشن پہلے ہی 2006 میں شائع ہو چکا ہے۔

آسٹریا کے حقوق انسانی کے Ludwig Boltzman Institute نے حقوق انسانی کی تحقیق اور تعلیم کے لیے خود کو وقف کر رکھا ہے۔ یہ ادارہ یوروپی یونین کے 25 ممالک کی تقریباً 40 یونیورسٹیوں کے اشتراک سے حقوق انسانی اور جمہوریت میں یورپ کی ماسٹر ڈگری عطا کرتا ہے۔

نچلی سطح پر بھی کچھ پیش قدمی کی گئی، جیسے منظم کمیونٹی کی سطح پر، علاقائی فرقوں اور اوسط درجے کے شہروں کی سطح پر۔ مثال کے طور پر ''حقوق انسانی کی تعلیم کے لیے عوامی تحریک'' کا ذکر کرنا اہم ہے جس کی پہل پر بہت سے شہروں نے خود کو "Human Rights Cities" یا "Human Rights Communities" کہنا شروع کیا، جیسے روساریو (ارجنٹینا)، تھیز

(سینیگل)، ناگپور (ہندوستان)، کاٹی (مالی)، دیناج پور (بنگلہ دیش)، ابرہ (فلپائن) اور گراز (آسٹریا)۔ دوسری پہل 1998 میں Saint-Denis میں ہوئی جہاں پر "European Charter for Safegaurding of Human Rights in the City" کو اختیار کیا گیا۔ دریں اثنا، 21 ممالک کے 235 شہروں نے، خاص کر Mediterranian علاقوں نے اس چارٹر پر دستخط کیے۔ اس میں بین الاقوامی حقوق انسانی پر مبنی سیاسی ذمہ داریاں شامل ہیں اور یہ علاقائی اداروں کے قیام اور حقوق انسانی کے تحفظ کے عمل کی ترغیب دیتا ہے، مثال کے طور پر حقوق انسانی کا صلاح کار بورڈ یا پھر نام نہاد ''حقوق انسانی بیلنس شیٹ''۔ اس پر دستخط کرنے والے شہروں کی وقفے وقفے پر میٹنگ ہوتی ہے جس میں وہ اپنے ''اچھے اعمال'' کے بارے میں اپنے تجربات ایک دوسرے کو بتاتے ہیں۔ علاقائی سطح پر حقوق انسانی کو فروغ دینے کی اسٹریٹجی کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے حقوق انسانی سے متعلق مسائل پر بحث کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مزید برآں، اس سلسلے میں اساتذہ، اہل کاروں، پولس، صحت اور سماجی کارکنان، پڑوسی تنظیمیں اور رضا کار تنظیموں کی ٹریننگ بھی اہم رول ادا کرتی ہے۔

بعض علاقوں میں، خاص کر ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں اسکولوں میں حقوق انسانی کی تعلیم کو تیز کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ بات اب واضح ہو چکی ہے کہ حقوق انسانی کا ایشو ہر ملک کے سیاسی تجربہ سے پوری طرح جڑا ہوا ہے کیوں کہ اسی کے تحت حقوق انسانی کی تعلیم کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔

6. خلاصہ : کیا حاصل کیا جا سکتا ہے؟

حقوق انسانی کی تعلیم کا خاص مقصد کیا ہے، اور بین ثقافتی پس منظر میں کیا حاصل کیا جا سکتا ہے؟ سب سے پہلے یہ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس کے تئیں حساس بنائے جائے۔ مرکزی حقوق انسانی طبقے، اقدار اور اصول کے بارے میں علم کا پرچار،

ساتھ ہی فرد واحد، ریاستوں اور ریاستوں کے مجموعوں کے فرائض اور ذمہ داریوں کے بارے میں بیداری پیدا کرنا اس سلسلے میں ایک اہم قدم ہے جس سے بین الاقوامی طور پر حقوق انسانی میں اصلاح کی جا سکتی ہے۔ ہر انسان کو اس لائق بنایا جانا چاہیے کہ وہ حقوق انسانی کی خلاف ورزی کو پہچان سکے اور اس کا مشاہدہ کر سکے۔

دوسرے یہ کہ، حقوق انسانی کی خلاف ورزی کے اسباب کی جانچ کی جا سکتی ہے۔ زندگی کے مختلف سیاق وسباق میں یہ چیزیں خود کو مختلف طریقے سے پیش کرتی ہیں اور انھیں آسانی سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اہم چیز لوگوں کے اندر ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنا ہے اور عمل کے امکانات کی تلاش کرنا ہے۔ یہ روزمرہ زندگی اور عادات واطوار میں واقع ہو سکتا ہے اور ان قومی یا بین الاقوامی اداروں کے ذریعے کیا جا سکتا ہے جو حقوق انسانی کو فروغ دے رہے ہیں۔ اس کے لیے متبادل یا رضا کارانہ تنظیموں کی رپورٹیں جو بین الاقوامی حقوق انسانی کی نگراں کمیٹیوں کو مخاطب کی گئی ہیں، وہ اطلاعات کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ انھیں بڑی تیزی سے انٹرنیٹ کے ذریعے پھیلا دیا جاتا ہے جو مخصوص تنظیموں یا ذمہ دار اداروں یا پھر انٹرنیشنل پبلک کے بارے میں بیداری پیدا کر سکتی ہیں۔

مجموعی طور پر حقوق انسانی کی تعلیم حکومتوں کو یہ یاد دلانے میں مدد کرتی ہے کہ انھوں نے بین الاقوامی سطح پر جو وعدے کیے ہیں انھیں پورا کرنا ہے اور انھیں اس کے لیے جوابدہ بناتی ہے۔ جزوی طور پر نامکمل بین الاقوامی ذمہ داریوں کے نفاذ کے مدنظر بین الاقوامی طور پر محصور حقوق انسانی کو ایک مطلع سول سوسائٹی کی ضرورت ہے جو مختلف سطحوں پر اس کی تکمیل کر سکے۔

حقوق انسانی کا نظریہ ایک اخلاقی، سیاسی اور قانونی نظام کو پیش کرتا ہے جو اپنے آپ کو زندگی کے احترام کے لیے وقف کرتا ہے اور انسانی وقار کے اردگرد مرکوز رہتا ہے۔ اسی لیے متعدد ثقافتی اور مذہبی روایات کے سیاق وسباق میں مسائل کے حل کا پتہ لگانا چاہیے جو پاور پر مبنی نہ ہو بلکہ عام طور پر منظور شدہ قوانین کے مطابق ہو۔ حقوق انسانی کی تعلیم، حقوق انسانی کے احترام کی بنیاد پر تنازعات کا حل نکالنے کی تدبیر پیش کرتی ہے۔

سوالات و مداخلات

حقوق انسانی کو آخر کون یقینی بناتا ہے؟

صالحہ ایس محمود :

میں ڈاکٹر ماربو کی اس دور اندیش وضاحت سے کافی خوش ہوں، مجھے یقین ہے کہ بہت سی چیلنجنگ توضیحات اور سوالات کا جواب دینے کی ضرورت ہے۔ آخر حقوق انسانی کی گارنٹی کون دیتا ہے؟ کون ان کا تحفظ کرتا ہے؟ بار بار یہ کہا گیا کہ ریاست ہی انسانی حقوق فراہم کرتی ہے اور وہی اس کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ ساتھ ہی ریاستوں کو طاقت کا استعمال کرنے کی خودمختاری بھی حاصل ہے۔ لہٰذا اس میں بنیادی تضاد ہے کہ کون انسانی حقوق کو یقینی بناتا ہے اور اسے فراہم کرتا ہے۔

کیا غریبی کو مٹانے کا بہترین طریقہ جمہوریت ہے؟

امرتیہ سین بھی یہی کہتے ہیں کہ غریبی اور ناانصافی کو مٹانے کے لیے جمہوریت سب سے اچھا طریقہ ہونا چاہیے اور یہ کہ جمہوری معاشروں کا واسطہ بھوک سے نہیں پڑتا۔ پھر مثال کے طور پر، ہم اس کی وضاحت کیسے کر سکتے ہیں کہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت، یعنی ہندوستان میں بھوک مری ہے؟ اور یہ بھی کہ امیر ترین جمہوریت میں، یعنی امریکہ میں 35 ملین باشندے ہر رات بھوکے سو جاتے ہیں؟ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جمہوریت اس کا جواب نہیں ہو سکتی۔ اقتصادیات میں امرتیہ سین کی مہارت ہونے کے باوجود ہمیں اب بھی ذیلی جواب ڈھونڈنے ہوں گے۔

بھوک خاص طور پر تقسیم کا مسئلہ ہے

ماربو :

امرتیہ سین کے بیان پر یہ اعتراض تو فطری ہے۔ لیکن امرتیہ سین نے بھی یہ بات مانی

ہے کہ قحط سالی کی حالت میں، جیسا کہ انھوں نے چین کی مثال دی ہے کہ یہاں پر زبردست قحط سالی کی وجہ سے ایک بار 30 ملین افراد جان بحق ہو گئے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ سب ایک جمہوری ملک میں واقع نہیں ہو سکتا تھا۔

واضح طور پر ان کی قابلیت نے یہ دکھایا ہے کہ بھوک خاص طور پر تقسیم کا مسئلہ ہے۔ اور یہ ہندوستان کا بھی ایک بڑا مسئلہ ہے، اگر ہم اس بات کو ملحوظ نظر رکھیں کہ ملک کے ایک کونے میں کئی ٹن مکئی ہے لیکن یہ ملک کے دوسرے حصے میں نہیں پہنچ پاتا جہاں پر لوگ گھاس پھوس یا دوسرے اناج کھانے پر مجبور ہیں جو بونے کے مقصد سے رکھے گئے تھے، حالانکہ اس کا صحت پر بھی کافی برا اثر پڑتا ہے۔

ریاستوں کو طاقت کے استعمال کا پورا اختیار ہے لیکن ان پر بین الاقوامی قانون کو ماننے کی بھی ذمہ داری ہے

اصل میں کون حقوق انسانی کی گارنٹی دیتا ہے، کون ان کی حفاظت کرتا ہے؟ ریاستوں کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اعلیٰ عہدیداروں کو حقوق انسانی کی پریکٹس پر مامور کرے۔ حقوق انسانی کے ہر بین الاقوامی آلہ کے لیے ایک کمیٹی قائم کی گئی جسے اس کنونشن میں درج تمام حقوق کی تعمیل کی نگرانی کرنے کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ Covenant on Civil and Political Rights کے معاملے میں لائق کمیشن عدلیہ کے فیصلے بھی لے سکتا ہے کیوں کہ فرد کے مسائل کے عمل میں اسے شکایتوں کو قبول کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

آخری رپورٹ جو اس طرح کے معاملے میں نارمل ہے، کو دنیا کے سخت معنوں میں فیصلے کے طور پر نہیں دیکھا گیا ہے؛ اس کے باوجود عام طور پر ریاستیں یہ محسوس کرتی ہیں کہ انھیں اس رپورٹ کے انکشافات، یعنی نام نہاد ''نظریات'' پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ذریعے بین الاقوامی قانون کے ایک مرکزی اصول کو مخاطب کیا جاتا ہے : ریاستوں کو طاقت

کا استعمال کرنے کا اختیار ہے، وہ حکمراں ہیں؛ ٹھیک اسی طرح انھیں مکمل حکمرانی حاصل نہیں ہے کیوں کہ وہ بین الاقوامی قانون کے ماتحت ہیں۔ اسی لیے، یہاں پر زیر بحث ایک مناسبت حکمرانی ہے جو ریاستوں کے لیے اپنے علاقوں کے ساتھ درست ہے، جو کہ عوام اور اشیا کے اوپر حکومت ہے لیکن کسی بھی طرح بین الاقوامی قانون پر کوئی حکومت نہیں ہے۔

انسانی حقوق کو قومی آئین میں شامل کیا جانا چاہیے

طاہر محمود :

ڈاکٹر ماربو نے اس ضمن میں جو کچھ کہا میں اسی سلسلہ میں کچھ اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا تعلق خاص طور پر اس حقیقت سے ہے کہ ان تمام بین الاقوامی انسانی حقوق کی دستاویزات میں آلات میں کم از کم اس بات کی تلقین تو ضرور کی گئی ہے کہ ریاستیں اپنے قومی آئین میں جہاں تک ممکن ہو سکے زیادہ سے زیادہ حقوق انسانی کو شامل کریں۔

ہندوستان کو اس میں سرفرازی حاصل ہے

ہندوستان کو اس سلسلے میں سرفرازی حاصل ہے کہ وہ ایک ایسا ملک بن چکا ہے جس نے اپنے آئین میں چار بنیادی انسانی حقوق کو شامل کر رکھا ہے : زندگی کا حق، آزادی کا حق، وقار کا حق اور برابری کا حق۔ ان چاروں حقوق کی تعریف ہندوستان کے قومی آئین میں حقوق انسانی کے تحت کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں "Protection of Human Rights Act" بھی رائج ہے جسے پارلیمنٹ نے 1993 میں پاس کیا تھا اور اسی کے تحت ہمارے ملک میں قومی حقوق انسانی کمیشن کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ اگر ہندوستان کے کسی بھی گوشے میں ان انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو قومی حقوق انسانی کمیشن کو مناسب قدم اٹھانے کا پورا اختیار حاصل ہے۔ اور اگر اس کمیشن کے ان احکامات کی تعمیل ایمانداری سے نہیں کی جاتی ہے جو ان کے لیے ہیں جن کے خلاف کمیشن کو شکایت حاصل ہوئی تھی تو اس

چیز کا بھی زبردست اہتمام ہے کہ حقوق انسانی کمیشن اس قصوروار کے خلاف سپریم کورٹ میں عرضی دائر کر سکتا ہے، وہ کوئی صوبہ بھی ہو سکتا ہے، وہ کوئی مقامی حکومت ہو سکتی ہے یا کوئی دوسرا ادارہ یا شخص بھی ہو سکتا ہے۔ اور ملک کے قانون کے تحت سپریم کورٹ اس بات کے لیے پابند ہے کہ وہ اپنا فیصلہ تین ماہ کے اندر دے دے۔

محتاجی سے نجات۔ ہندوستان میں عوامی آزادی کا حصہ

ماربو :

اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی عدلیہ کے بارے میں ایک خاص بات جو بین الاقوامی سطح پر کہیں اور مشکل سے ہی مل سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ ضرورت اور بھوک سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا حق زندگی کے حق سے جڑا ہوا ہے۔ اس طرح ہندوستان بلاشبہ حقوق انسانی پر ہر ممکنہ صورت میں عمل کرتا ہے۔ پوری دنیا میں جہاں ایک طرف زندگی کے حق کو بنیادی انسانی حق کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے وہیں غذا کے حق کو کچھ شرائط کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے۔

طاہر محمود :

ہندوستانی سپریم کورٹ نے کئی بار یہ فیصلہ سنایا ہے کہ ذاتی آزادی کا حق جو ہندوستانی آئین نے ہر شہری کو عطا کیا ہے، اس میں صرف زندگی اور آزادی کا حق ہی شامل نہیں ہے بلکہ ایک پُر وقار زندگی گزارنے کا بنیادی حق بھی شامل ہے۔ اور اسی لیے محتاجی سے نجات جیسا کہ ہندوستانی آئین میں درج ہے۔

اسی لیے حقوق انسانی کی تعلیم نہایت ضروری ہے

ماربو :

یہاں پر ہمیں ایک اور سبب کا پتہ چلتا ہے کہ حقوق انسانی کی تعلیم آخر اتنی اہم کیوں ہے : حقوق انسانی کے اس قومی کمیشن اور درج بالا ہندوستانی قانونی ضابطے کے علاوہ حقوق انسانی کے

ضمن میں اور بھی ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو کافی اہمیت کی حامل ہیں لیکن ان کے بارے میں زیادہ تر لوگوں کو علم نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں پر حقوق انسانی کی تعلیم کا مقصد چیزوں کو درست کرنا ہے۔

حقوق انسانی کے معاملے میں کیا ریاستوں کی تعلیم کی بھی ضرورت ہے؟

خضر :

ایک بہت ہی آسان سوال : حقوق انسانی کے معاملے میں کسے تعلیم دی جائے؟ افراد کو، ریاستوں کو یا پھر دونوں کو؟ کیوں کہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مشرق وسطیٰ کے ایک ملک کے خلاف 50 سے 70 تجویزیں پاس کی گئی تھیں اور وہ اس کے سر پر پھول کی مانند تھے اور پوری دنیا میں ایسا کوئی بھی نہیں ہے جو یہ نہ چاہتا ہو کہ ان تجویزوں کو نافذ نہ کیا جائے۔

کیا اقوام متحدہ دوہرا معیار اپناتا ہے؟

میرا دوسرا سوال زیادہ پریکٹیکل ہوگا : کیا یہ سچ ہے کہ اقوام متحدہ دوہرے معیار کا استعمال کرتا ہے؟ یہ سب کے لیے قابل قبول کیوں ہے کہ اسرائیل کے پاس تو نیوکلیئر بم موجود ہیں لیکن ایران میں اس کے تئیں ایک معمولی ریسرچ - کیوں کہ اب تک یہ بات ثابت نہیں ہوسکی ہے کہ ایران نیوکلیائی بم بنانا چاہتا ہے (یہ ہوسکتا ہے اور نہیں بھی) - اس بات کا پروپیگنڈہ کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے کہ ایران سے پوری دنیا کو خطرہ لاحق ہے اور اسرائیل کسی کے لیے خطرہ نہیں ہے؟

عدم احترام سے جائز اور ناجائز کے درمیان اختلاف نہیں پیدا ہونا چاہیے

ماربو :

جہاں تک دوہرے معیار کا سوال ہے تو بین الاقوامی قوانین کے تمام شعبوں میں ایسا ہوتا ہے۔ میرے خیال سے ہمیں بین الاقوامی قانون کی نوعیت اور اس کی خلاف ورزیوں کی وضاحت کرنے سے نہیں رکنا چاہیے۔ عدم احترام کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ جائز اور

ناجائز کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے۔ اس کا مطلب ہوگا خود ہی کنارہ کشی اختیار کر لینا۔ یہ ہر شخص کا فریضہ ہے کہ وہ ان امور پر اپنی رائے بنائے اور اس کا جواب بھی تیار کرے۔

کیا عدم پھیلاؤ کے معاہدوں کو ایک بار پھر توڑ دینا چاہیے؟

عدم پھیلاؤ کے معاہدے کے معاملے میں برتے جانے والے دوہرے معیار کی وضاحت اس حقیقت سے کی جاسکتی ہے کہ کچھ دنوں پہلے ایک تاریخی قرار منظر عام پر آیا تھا جو ہری اسلحوں کی مزید توسیع کو ختم کر دینا چاہیے۔ دوسری عالمی جنگ کے فوراً بعد اسلحوں کی دوڑ اتنی تیز ہوگئی تھی کہ اس سے پوری دنیا کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ایک عدم پھیلاؤ کا معاہدہ عمل میں آیا جس پر کئی ممالک نے دستخط کیے۔ موجودہ حالات میں اس معاہدے کی تعمیل پر زور دینے کے بجائے کیا اس معاہدے کو توڑنا مزید خطرناک ثابت نہیں ہوگا؟

قانون اور سیاست کے درمیان واضح خط تقسیم کھینچی جانی چاہیے

مزید برآں، ہر ایک قانون کی خلاف ورزی یا اسے توڑنے کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی لیے یہاں پر قانون اور سیاست کے درمیان ایک واضح خط تقسیم کھینچی جانی چاہیے۔ لہٰذا، تھوڑی بہت تسلی کے ساتھ، مثال کے طور پر امریکہ کی ایک عدالت نے گوانتانامو کی جیل کے قیدیوں کے ساتھ سلوک کو بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کہا ہے۔ یہ صرف اسی جگہ ممکن ہے جہاں پر قانون اور سیاست کے درمیان ایک واضح خط تقسیم موجود ہو۔ اور یہ موقع آنے والے وقتوں میں قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر موجود ہے۔

حقوق انسانی گروہ اور رضا کارانہ تنظیمیں - مذاہب کے لیے ایک حقیقی چیلنج

گیبریل :

چونکہ ڈاکٹر ماربو اپنے مقالے میں عالمگیر انسانی حقوق کے کلچر کا ذکر کر چکی ہیں، لہٰذا میں

اس ضمن میں ایک تفصیل پیش کرنا چاہتا ہوں جو کہ میری نظر میں بہت اہم ہے: اس گول میز کانفرنس میں بین مذاہب مذاکرہ کرتے وقت ہمارا سامنا اقدار کے سیکولر نظام سے بھی ہوا جو کہ لگاتار ہمارے مذاکرے میں تیسرا حصہ دار ہے۔ یہ ایک بہت دلچسپ مجموعہ ہے کیوں کہ کسی بھی طرح یہ کوئی مدعا نہیں ہے کہ یہ سیکولر حقوق انسانی معیار مذہبی فرقوں کے ذریعے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ واضح الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے : یہ مدنظر رکھتے ہوئے کہ بہت سارے حقوق انسانی گروہ اور رضا کار تنظیمیں زیادہ سے زیادہ انصاف کے حق میں عالمگیر پیمانے پر مصروف ہیں کہ، میں کچھ اور نہیں بلکہ یہی تصور کرسکتا ہوں کہ یہ مذہبی فرقوں کے لیے حقیقی چیلنج ہیں، تمام شعبوں میں ان کا آپس میں مقابلہ رہتا ہے۔

انسانیت نواز مداخلت کا مسئلہ

اس کے بعد بہت سے دوسرے معاملے آتے ہیں جو حقوق انسانی کی ہمہ گیر شناخت اور ان کی بے حرمتی سے جڑے ہوئے ہیں اور طاقت کے زور پر حقوق انسانی کو کس حد تک نافذ کیا جاسکتا ہے۔ یہ تمام مسائل انسانیت نواز مداخلت کہلاتے ہیں۔ کن مقامات پر انسانی حقوق استعمال ہوتے ہیں اور کہاں پر نہیں؟ اس سیکولر حقوق انسانی مزاج کے سیاق وسباق میں ہمارا سامنا کئی سوالات سے ہوگا، اس کے علاوہ مذہبی مزاج کے سیاق وسباق سے بھی۔ لیکن یہاں پر میرے خیال سے اہم چیز یہ ہے کہ یہ حقوق انسانی مزاج ایک ایسا مزاج ہے جس کا مستقبل میں کبھی نہ کبھی مذہبی روایات سے سخت مقابلہ ہوگا۔

انسانی حقوق اور مذہبی فرقے

ماربو :

میں تیسرے حصہ دار کے خیال سے بہت خوش ہوں، جو کہ اس وقت بھی موجود ہے جب ہم بین مذاہب مذاکرہ کی میز پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کے ذریعے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ انسانی حقوق کا معاملہ طاقت کے استعمال سے متعلق ریاست کی اجارہ داری کے ایک جواب

کے طور پر سامنے آیا، اور یہ کہ انھیں مستقبل میں بھی عام طور پر اسی طرح سمجھا جانا چاہیے۔

شاید یہ اس وقت بھی سچ ہے جب ہم حقوق انسانی کی ہمہ گیریت کی بات کرتے ہیں اور ان حقوق کو خود مختار ریاست کے مدمقابل پوری وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب نہیں ہے کہ مختلف مذاہب کے ذریعے انھیں عام طور پر اور اسی طرح منظور کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک دوسرا سوال ہے - ہر حالت میں یہ خود مختار ممالک میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے حالات زندگی کے بارے میں نہایت اہم رول ادا کرتے ہیں۔

انسانیت نواز مداخلت کا سوال

جہاں تک انسانی مداخلت کا سوال ہے : سب سے پہلے ہمیں یہ کہنا ہوگا کہ یہ بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر، بین الاقوامی قانون کے مطابق حقوق انسانی کو نافذ کرنے کے مقصد سے فوجی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے اسے خود مختار ملک میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ اس وقت بھی درست ہے جب کوئی شخص اس طرح کی جائز مداخلت کے بارے میں یہ العان کردیتا ہے کہ اِس یا اُس ملک میں انسانی حقوق کی منظم طور پر خلاف ورزی کی جاتی ہے اور نسلی قتل وغارت گری وہاں پر عام بات ہے۔ اقوام متحدہ کی تازہ کوششیں یہ تجویز پیش کرتی ہیں کہ اس طرح کے حالات میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کو فعال ہوجانا چاہیے۔

تیسری نسل کے انسانی حقوق

طاہر محمود :

چونکہ ڈاکٹر ماربو اپنے مقالے میں پہلی نسل کے حقوق اور دوسری نسل کے حقوق کا ذکر کر رہی تھیں، مجھے یہ جان کر خوشی ہوگی اگر وہ اس پر کچھ روشنی ڈالیں کہ تیسری نسل کے انسانی حقوق کے بارے میں کیا کچھ معلوم ہے، جس کے بارے میں معاشرے میں زیادہ بیداری نہیں ہے لیکن جو زیادہ سے زیادہ بحث کا موضوع بنتے جارہے ہیں۔

ماربو :

پہلی نسل کے حقوق کا تعلق جہاں سول اور سیاسی حقوق، یعنی بنیادی آزادی سے ہے، جیسے اظہار رائے کی آزادی، جمہوریت، زندگی کا حق وغیرہ وہیں دوسری نسل کے حقوق اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق پر مبنی ہیں، یعنی وہ حقوق جو زندگی کی سماجی حالت پر اثر انداز ہونے چاہئیں۔ تیسری نسل کی نشاندہی بین الاقوامی ہمدردی اور باہمی تعاون سے ہوتی ہے : اس میں امن کے حقوق، تحفظ اور صاف ماحول کے حقوق شامل ہیں۔ تیسری نسل کے حقوق پر کوئی الگ دستاویز، کوئی الگ کنونشن نہیں ہے؛ لیکن انھیں ہم دوسرے دستاویزوں میں پا سکتے ہیں۔ لیکن بہت سے سوالات میں ہم لازمی بین الاقوامی قانون کی طرف پیش رفت بھی دیکھ سکتے ہیں، مثال کے طور پر بحری قانون کے معاملے میں یا پھر بین الاقوامی سمندری خطوں کے استعمال سے متعلق قانون۔

مثال کے طور پر ہمدردی کا حق

یہ خاص کر آخر الذکر شعبہ ہے جسے بین الاقوامی حکومت میں شامل کیا جانا چاہیے، خاص کر ترقی پذیر ممالک کے حوالے سے کیوں کہ اس میں لگنے والے بے شمار پیسوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے اندر ان کی کان کنی کی صلاحیت نہیں ہے۔ اسی لیے اگر امیر ممالک معدنیات کے ان ذخائر کی کان کنی کرنے کی حالت میں ہیں تو ترقی پذیر ممالک کو اس میں سے حصہ ضرور ملنا چاہیے۔ اس کے ذریعے ہم ہمدردی کے حقوق کی تعمیل کر سکتے ہیں۔ یہ بات تمام ماحولیاتی طور پر صادق آتی ہے

ہمیں محفوظ بنیاد کی ضرورت ہے نہ کہ دوہرے معیار کی

خیدیا طوف :

حقوق انسانی کی اہمیت کے بارے میں پوچھنے پر اگر ہم نظریاتی سطح سے اتر کر زیادہ عملی

سطح پر آتے ہیں، یعنی اس درجہ تک کہ زمین پر حقیقت میں کیا کچھ واقع ہو رہا ہے، سب سے پہلے میں اس ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا جو 1937 میں سوویت یونین میں نئے آئین کو نافذ کرتے وقت واقع ہوا - یہ ایک ایسا آئین تھا جو حقوق انسانی کے ایک بالکل درست نظام کی ترجمانی کرتا تھا۔ ان حقوق میں سے ایک حق تھا خفیہ انتخابات کا۔ جب اس سلسلے میں مولوتوف، اسٹالن کو وارننگ دے رہا تھا کہ اس طرح کے خفیہ انتخابات کا حق خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، تو اسٹالن نے جواب دیا تھا، ''پریشان مت ہوئیے، انتخابی نتائج کا زیادہ تر انحصار اس بات پر نہیں ہوگا کہ لوگوں کا اس حق کے تئیں کیا ردعمل تھا، اہم چیز یہ ہوگی کہ ہم ووٹوں کی گنتی کیسے کریں گے۔'' اس کا بھی بالکل یہی مطلب ہے جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے محفوظ بنیاد، نہ کہ دوہرے معیار۔ کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ انھیں دنیا کو جمہوریت کا درس دینے کے لیے بلایا گیا تھا لیکن ہمارے ملک میں جمہوریت کی اپنی فہم و فراست کے بارے میں وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔

اقوام متحدہ کا 'حقوق انسانی کمیشن' اب 'حقوق انسانی کونسل' سے تبدیل ہو چکا ہے

مثال کے طور پر نئی تشکیل شدہ ''اقوام متحدہ کی حقوق انسانی کونسل'' کو لی لے لیجئے۔ اس کونسل میں آپ کو دیگر ممالک سمیت روس، چین اور کیوبا کی بھی نمائندگی ملے گی۔ یہ وہ ممالک ہیں جو منظم طریقے سے حقوق انسانی کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اس نئی کونسل میں امریکہ کی نمائندگی نہیں ہے جو کہ دنیا میں حقوق انسانی کے لیے لڑنے والا سب سے اہم ملک ہے۔ کیوں؟ کیوں کہ یہ ہمارے لیے نہایت تعجب خیز امر ہے کہ صدر رونالڈ ریگن نے سوویت یونین کو ''شیطانی سلطنت'' کہا تھا اور صدر جارج ڈبلیو بش اب بھی اسی اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں جب وہ ایران، عراق اور شمالی کوریا کا ذکر کرتے ہیں، سلطنت کے طور پر نہیں بلکہ ''برائی کے محور'' کے طور پر۔ اب امریکہ نے درج بالا ممالک کے ساتھ شریک ہونے سے

انکار کر دیا ہے۔ اس لیے میں اپنے آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا نئی ''حقوق انسانی کونسل'' جمہوریت اور دنیا میں انسانی حقوق کے ایک اہم جنگجو کے طور پر کوئی اہم رول ادا کر پائے گی؟

طاہر محمود :

پروفیسر خید یاطوف نے جو کچھ کہا اس سے حال کی سب سے اہم پیش رفت پر روشنی پڑتی ہے : اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کمیشن کی موقوفی اور اس کی جگہ پر اقوام متحدہ کی حقوق انسانی کونسل کا قیام دنیا کے تمام ممالک، اقوام متحدہ کے 193 ارکان کو اس کونسل کے انتخاب کے لیے مدعو کیا گیا تھا جو کہ ایک 47 رکنی کونسل ہے۔ امریکہ نے شدید غم و غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس کے انتخاب کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا کیوں کہ اس سے پہلے اس نے اس کونسل کی تشکیل اور حقوق انسانی کمیشن کی تنسیخ کی مخالفت کی تھی۔ 193 ممالک میں سے 174 یعنی ایک بہت بڑی تعداد نے کے لیے ووٹ ڈالا۔ خفیہ ووٹوں کے ذریعے جن ارکان کا انتخاب اس کونسل کے لیے ہوا، وہ ہیں : پاکستان، بنگلہ دیش اور سعودی عرب بھی لیکن ایران نہیں۔

حقوق انسانی کونسل کے ارکان سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ ایک آزاد حقوق انسانی کے ادارے کی تشکیل کریں گے

ماربو :

وہ تمام ایجنڈے جن کی نگرانی حقوق انسانی کے سابق کمیشن کے ذریعے ہوتی تھی، وہ تمام اب حقوق انسانی کونسل کے دائرۂ اختیار میں آ چکے ہیں۔ سابق کمیشن کی ایک اہم بات یہ تھی کہ اس نے ماہرین کا ایک آزاد پینل اور حقوق انسانی کے فروغ اور تحفظ کے لیے ایک ذیلی کمیشن قائم کر رکھا تھا۔ آنے والا وقت ہی یہ بتائے گا کہ وہ لوگ جو اس نئی کونسل کے ارکان منتخب کیے گئے ہیں کیا وہی اس پر اپنے اپنے ملک کے نمائندہ کے طور پر حاوی رہیں گے، یا پھر بطور ماہرین کے کام کریں گے۔

اگر نئی تشکیل شدہ حقوق انسانی کونسل سابق کمیشن کی پیروی کرتی ہے تو موخر الذکر بات ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر بعض ممالک کے ذریعے جو لوگ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے لیے نامزد کیے گئے ہیں، پہلے لمحہ سے ہی ان کی تقرری بااثر ہو چکی ہے۔ انھیں آزادانہ طور پر فیصلہ لینا چاہیے۔ ورنہ ایک بار پھر حقوق انسانی کونسل ایک سیاسی مجلس ہو جائے گی جہاں پر بالکل مختلف سوچ رول ادا کرے گی، مثال کے طور پر یہ کہ کیا کسی ملک کی مذمت کی جانی چاہیے یا نہیں۔ ہم صرف یہی امید کر سکتے ہیں کہ حقوق انسانی کونسل کے ارکان ایک حقوق انسانی ادارہ کی تشکیل کریں گے، جتنی ممکن ہو سکے اتنی آزادانہ طور پر اور اپنے اپنے ملک کے لیے نمائندہ کے طور پر کام نہیں کریں گے۔

مذہبی کثرت الوجود کے تناظر میں تعلیم

عادل تھیوڈور خوری

مذہبی کثرت ایک ایسی حقیقت ہے جو تمام مذاہب کے لیے مزاحم ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کے لیے نظریاتی اور عملی مسائل پیدا کرتی ہے اور ہماری دنیا کی مستحکم تعلیم کے لیے کی جانے والی انتھک کوششوں کو چیلنج پیش کرتی ہے جو پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ آگے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مذاکرات اور باہمی تعاون پر بار بار زور ڈالنے کے باوجود بھی ناراحت کے احساس کو مٹایا نہیں جاسکتا اور موجودہ غیر یقینیت کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔

اس لیے میری پیش کش درج ذیل امور کا احاطہ کرتی ہے : 1) مذہبی لوگ کیسے مذاہب کی کثرت کے ساتھ جی سکتے ہیں، 2) سچائی اور مذاکرہ کس طرح فائدہ مند ہیں، اور 3) موزوں تعلیم کے ذریعے کس طرح کے مقاصد متعین کیے جانے چاہئیں؟

1. یقین کرنے میں مذاکرہ اور عقیدت مندی

بہت سارے افراد اپنے مذہبی عقائد کے بارے میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مذاکرہ کرنے سے خائف رہتے ہیں۔ وہ ایک ایسی حالت میں نہیں جانا چاہتے انھیں یہ تاثر دے کہ وہ اس سچائی کا متبادل تلاش کر رہے ہیں جس میں وہ پختہ یقین رکھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مذاکرہ کی حالت میں ان کے عقیدہ کی سچائی مصالحت کی شکل اختیار کر لیتا ہے حالانکہ یہ مصالحت کے لائق بالکل نہیں ہے۔

اس طرح کی غلط فہمیوں کو سنجیدگی سے لینا چاہیے اور اس کے حل کی تدبیر نکالی جانی چاہیے۔ مذاکرہ ایک پرعزم ذہنی کھلا پن اور دل کی رضامندی کا مطالبہ کرتا ہے۔ جو لوگ بھی مذاکرہ کرنا چاہتے ہیں انھیں اپنے خول سے باہر نکلنے کے لیے بالکل تیار رہنا چاہیے، یعنی پوری

طرح سے محفوظ اپنی زندگی کے دائرہ سے باہر نکلنا چاہیے، اپنی جانی پہچانی روایات کی سیکورٹی کو چھوڑ کر دوسروں کے سامنے خود کو پیش کرنا چاہیے۔ عدم اعتماد کا جذبہ جو باہری عناصر کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور جو عام طریقوں کو پریشان کرتا ہے اور جو عملی زندگی کے رہنما ضابطوں کے لیے خطرہ پیدا کرتا ہے، اور جس کا تجربہ عام طور پر کیا جاتا ہے، اسے درست کرنے کی ضرورت ہے۔

کیوں کہ ایک ایسی دنیا میں جو نفرت اور اجنبیت سے بھری ہوئی ہے، یہ ضروری ہے کہ ایک کھلا پن پیدا کیا جائے تاکہ عدم اعتماد اور غلط فہمیوں پر غلبہ حاصل کیا جاسکے اور ایک ایسی ہمدردی پیدا کی جائے جو ایک دوسرے کو سمجھنے کی خواہش پیدا کر سکے اور اس کی حمایت کر سکے۔

یہ کھلا پن عقیدہ کے اعتماد پر مبنی ہے اور جو دوسروں کو سمجھنے اور خود اپنے عقیدہ کے تئیں ایمانداری، دونوں کی ہی نشاندہی کرتا ہے۔

1.1 عقیدہ کی یقینیت :

عقیدت منداس یقینیت میں جیتے ہیں کہ خدا کے لفظ کے تئیں وہ جن چیزوں کا تصور کرتے ہیں اور جن چیزوں کا اقرار کرتے ہیں وہ سچائی پر مبنی ہے۔ یہ ان افراد کے مذہب کی تعلیم کے مطابق سچ ہے۔ لہٰذا، عقیدت مند کو یہ حق حاصل ہے، یہاں تک کہ یہ اس کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی شناخت اپنے عقیدہ کی سچائی کے مطابق کرے، اس کا اقرار کرے اور تمام چیلنجوں اور مشکلوں کے باوجود اس پر قائم رہے۔ عقیدت میں جوڑنے والے عناصر ہماری مرضی پر منحصر نہیں ہیں۔ ان پر انحصار کیا جاسکتا ہے کیوں کہ یہی وہ تمام بنیادیں ہیں جن پر پوری عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ لیکن اس قسم کی پیش رفت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معلوم اور منظورہ شدہ سچائی کی تنسیخ کی جائے۔ یہ پیش رفت سوال کے ذریعے ہوسکتی ہے، جس کا جواب دیے جانے پر عقیدت کے متعلق اچھی فہم اور بہترین ترسیل ممکن ہوسکتی ہے۔ منظور شدہ سچائی کی دولت سامنے آسکتی ہے؛ لیکن اس کا کسی طرح یہ مطلب نہیں ہے کہ سچائی کو چھوڑ دیا گیا ہے؛ یہ اس کا ابھار ہے۔

اس فطرت کو برتری اور تکبر کا اشارہ نہیں سمجھا جانا چاہیے، کسی ایسے شخص کا تکبر جو یہ سوچتا ہے

کہ وہی ایک ایسا آدمی ہے جو سچا ہے۔ یہ متحمل مزاج عقیدت مند کی فطرت ہے جس کا اس بات پر پورا یقین ہے کہ سچائی اسے عطا کی گئی ہے، سچائی اس کے سپرد کی گئی ہے، اور اسے اس سچائی میں تقویت لانے کے لیے محنت کرنی ہوگی، اسے ترقی دینی ہوگی اور اس کے اثرات کو دیکھنا ہوگا کہ اس کے پھل اسے اپنی زندگی میں اور اپنے فرقہ کے افراد کی زندگی میں مل رہے ہیں۔

یہاں پر جو کچھ کہا گیا اس کا اطلاع تمام مذاہب کے ماننے والوں پر ہوتا ہے تا کہ لوگوں کی مذہبی آزادی کا احترام کیا جا سکے، ساتھ ہی ہر ایک عقیدت مند کے حق اور اس کی ڈیوٹی کا احترام کیا جانا چاہیے اور اس کے مذہب کو پہچانا جا سکے اور اسے تسلیم کیا جا سکے۔ اس کا دوسرا قدم دوسرے افراد کی مذہبی روایات کو سمجھنے کی کوشش ہوگا۔

1.2 سمجھنے کی کوشش کرنا :

ہر عقیدت مند کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ سچائی کی مزید تلاش کے لیے اپنے ذہن و دماغ کو کھلا رکھے، دوسرے مذاہب کے معاملے میں بھی۔ اول، سمجھنے کی کوشش کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہم مذاکرہ میں شامل ہونے والے دیگر افراد کے ساتھ لاعلمی اور بدگمانی کا اظہار کریں بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے ہمیں ان کے مذہب کے بارے میں اطلاع حاصل کرنی چاہیے۔ یہ اطلاع دانشوروں کی تعلیم پر مبنی ہوتی ہے اور جس کی ابتدا اس مذہب کے ذاتی تصور کے مغز سے ہوتی ہے اور اس زندہ مغز تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے تا کہ اپنے ساتھی سے اس کی سچی شناخت کے طور پر ملا جا سکے۔

لیکن ہم ایک اندھے اخلاق کا مشورہ نہیں دیتے ہیں۔ سچائی کی باریک بینی سے تلاش، اس معاملے میں بھی، اس کی صداقت اور اس کے مقام کو نہیں کھوتی ہے بلکہ سچائی سے محبت کرنے کے لیے تنقیدی کھلا پن اور تنقیدی ہمدری کی ضرورت ہے اور مذاکرہ میں اپنے ساتھی کے احترام کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ سنجیدگی کے ساتھ اپنی ذات اور اپنے مذہب پر قائم ہے۔ تنقیدی طور طریقہ لوگوں کو سطحی مروت، دریافت کے بے جا جوش سے روکتی ہے۔

1.3 خود اپنے عقیدہ کے تئیں ایمانداری

لیکن دوسروں کے ساتھ مقابلہ صرف کھلی ذہنیت اور مذاکرہ میں اپنے ساتھی کے احترام سے ہی نہیں آتی ہے۔ بلکہ یہ مساوی طور پر خود اپنے عقیدہ اور مذہب کے تئیں ایمانداری سے بھی آتی ہے۔ اس ایمانداری میں غلط فہمی نہیں پیدا ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ ہمیں اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ان روایات اور مرکبات کو چھوڑ دیں جو خود ہماری شناخت کو قائم کرتے ہیں اور جن سے خود ہمارے مذہب کی پہچان ہے۔ اپنی شناخت کے تئیں کھلی ہوئی ایمانداری سے اس مذاکرہ کا صحیح نتیجہ نکلے گا۔ ہم اپنے مذہب کی سچائی کو جتنی گہرائی کے ساتھ قبول کریں گے، ہم دوسروں کے ساتھ مذاکرہ کرنے اور خیالات کے تبادلہ کے لیے اتنے ہی زیادہ آمادہ ہوں گے جہاں پر ہمیں اس قسم کا کوئی تاثر حاصل نہیں ہوگا کہ ہم بالکل غیر محفوظ مقام پر کھڑے ہوئے ہیں۔

اس طریقے سے مذاکرہ سچائی کی تلاش کو درکنار کر کے نہیں ہو سکتا، یعنی مجوزہ تعلیمات کی سچائی اور سچائی کے فیصلہ سے ہم کنارہ کشی نہیں اختیار کر سکتے۔ اس کے برخلاف یہ خود ہمارے اپنے عقیدہ کے تئیں ایمانداری پر منحصر ہوتا ہے جو کہ دونوں طرف ہوتا ہے۔ مذاکرہ میں شامل ہونے والے دونوں فریق اس پر کاربند ہوتے ہیں اور اپنے مذہبی عقیدوں کے بارے میں خیالات کا ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ کرتے ہیں اور اس طرح مذہبی زندگی کی آبیاری ہوتی ہے۔

2. مذہبی تجربے کے اقسام

2.1 اختلاف اور موافقت

مزید برآں اگر ہم یہ تصور کریں کہ عقیدہ کی نگہبانی اور تجربہ تاریخ کے اندر ہی ہوتا ہے، تو ہمیں اس پر بھی غور کرنا ہوگا کہ انسانی تجربہ کی سطح، یعنی ایک مخصوص قسم ضرور منظر عام پر آئے گی۔

- یہ قسم ہمیشہ یکساں طور پر متضاد نہیں ہوتی ہے۔ جہاں پر میرے اپنے مذہب کی مخصوص تعلیمات کا مفصل تضاد ہوگا، تو ایسے میں دونوں طرف سے ناموافقت یقینی ہے کیوں

کہ متضاد ہونے کی وجہ سے دونوں بیانات ایک ہی وقت سچے نہیں ہو سکتے۔

- تضاد یا صرف اختلاف کے معاملے میں صرف یہ جاننا اہم نہیں ہے کہ ساتھی کیا کہہ رہا ہے بلکہ ہمیں ان اسباب کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ایسا کیوں سوچ رہا ہے اور اس میں اس کا یقین کیوں ہے۔ بالفاظ دیگر، ہمیں دوسرے مذہب کے ماننے والے کے مطابق چلنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ اس کی پوزیشن کو ٹھیک طرح سے سمجھا جا سکے۔ یہاں پر مسئلہ راضی ہونے کا نہیں ہے بلکہ سمجھنے کا ہے کیوں کہ وہ شخص جو ہر اس چیز کو سمجھ رہا ہے جو کہا گیا اور کیوں کہا گیا ہے، وہ مذاکرہ میں شامل اپنے ساتھی کے تئیں ایک زیادہ موزوں طریقے کو اپناتا ہے۔

- اخلاف کا مطلب ہمیشہ تضاد نہیں ہوتا ہے۔ اکثر یہ صرف اختلاف ہی ہوتا ہے۔ دوسروں سے اختلاف، خود عام انسانی رشتوں کے سیاق وسباق میں، کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ خود میری شناخت پر کوئی حملہ ہو رہا ہے بلکہ یہ انسانی وجود کی ایک دوسری شکل ہو سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر، ہمارے اندر تحمل کا مادّہ ہونا چاہیے اور آئندہ پیش رفت کے لیے اعتماد کو بحال کرنا چاہیے۔

2.2 اختلاف اور اضافیت

چونکہ انسانی علم اور انسانی تجربہ سچائی اور مذہبی عمل کے شعبے میں اہم رول ادا کرتے ہیں ہم بار بار مذہبی علم اور تجربہ کی اضافیت کی بات کر سکتے ہیں۔

متعدد مذاہب کے عناصر جنھیں سچا اور پاک سمجھا جاتا ہے، ان میں سے زیادہ تر میرے مذہب کے اثر کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے عقیدہ کے صادق نتائج ہیں۔ وہ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ میرے مذہب اور دوسرے مذہبی فرقوں کے مذہبی تجربوں کے درمیان کچھ نہ کچھ اضافیت ہے۔ ایسے میں سوال یہ ہوگا : بطور عیسائی، مسلم وغیرہ میرے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ان عناصر کو خود اپنے مذہبی عقیدہ اور مذہبی عمل میں شامل کر سکوں؟

- متعدد مذاہب کے درمیان رشتوں اور بین مذہبی اقلیم کے سلسلے میں یہ مشاہدات صحیح ہیں۔ ان دونوں کے اپنے مسائل اور پریشانیاں ہیں لیکن ان کے مطالبات اور

مواقع کے کامیاب ہونے کی امید بھی ہے۔ اس سطح پر دیکھنے پر جو ابھی حتمی اور باندھنے والی سچائی کی نشاندہی نہیں کرتی کسی مذہب کے اندر ایسے کام اور دوسرے مذاہب کے ساتھ مذاکرہ کے درمیان ہم ایک متوازیت کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ 'کثرت میں وحدت' کے اصول کے متوازی، بین مذاہب مذاکرہ کے سلسلے میں ہم ایک نئے اصول کی تشکیل کر سکتے ہے، یعنی 'سمجھ اور مفاہمت کے ذریعے اثر پذیری'۔

اس ضمن میں ایک اہم مدعا رواداری کی تعلیم ہے۔ لیکن ہم یہاں پر کس رواداری کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟

3.1 صرف عملی رواداری نہیں

مذہبی کثرت پر بات کرتے ہوئے، یہاں پر مدعا صرف عملی فوائد پر نظر رکھنے والوں کی رواداری نہیں ہے جو کہ عالمی برادری میں ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں، پرامن باہمی وجود کی ضرورت کو نقطۂ آغاز کے طور پر لیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بات سچ ہے کہ ایک دنیا میں روایات کی حقیقی کثرت اور سچائی کے مذہبی دعوے ایک ایسے راستے کی تلاش کا مطالبہ کرتے ہیں جو پرامن اور باہمی وجود کے لیے مفید ہو۔ یقینی طور پر ان میں سے ایک راستہ عملی باہمی رواداری ہے، جو کہ خود اپنے مذہب کی کاملیت اور صداقت کے دعوے سے آزاد ہے۔ یہ عملی رواداری دہشت پسندانہ بنیاد پرستی کی کثرت سے چھٹکارہ حاصل کرنے اور حیات باہمی کے مسائل کو حل کرنے کے ایک ذریعہ کے طور پر مددگار ہو سکتی ہے۔

لیکن یہ عملی فطرت ہی رواداری کی واحد شکل نہیں ہے۔ یہاں پر اس سوال کا جواب دینا بھی باقی ہے کہ کیا منظور شدہ مذہبی سچائی خود اپنے مذہب کی یقینیت کو مدنظر نہ رکھتے ہوئے رواداری کا موقع فراہم کرتی ہے، جو کہ رواداری کی تمام شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے؟

3.2 رواداری صرف دوسرے مذاہب کی تاثیر کی تصدیق میں ہی نہیں

شروع سے ہی ہماری عیسائی دینیاتی روایت یہ مانتی رہی ہے کہ غیر عیسائی بھی ہمیشہ

ہمیشہ کے لیے نجات کا موقع حاصل کر سکتے ہیں۔ کیتھولک چرچ کے ذریعے اس کی دوبارہ تصدیق دوسری ویٹکن کونسل کے Dogmatic Constitution on the Church "Lumen Gentium" کے 16ویں آرٹیکل میں کی گئی۔ نجات حاصل کرنے کا یہ امکان اس بات سے جڑا ہوا ہے کہ سچ کیا ہے اور خدا میں بنیادی یقین (cf. Heb 11:6)، جو کہ عام طور پر انھیں خود ان کے مذہب کے ذریعے پہنچایا گیا ہے اور کیا اچھا ہے (cf. Ac 10:35; Rm 2:10, 1 Jn 2:29)، جس پر وہ خود اپنے مذہب کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو انھیں خدا کی مہربانی سے جوڑتی ہے اور کرائسٹ سے انھیں منسلک کرتی ہے جس کے ذریعے ''خدا نے تمام چیزوں کے ساتھ موافقت پر خوشی ظاہر کی تھی'' (Col 1:20)۔

اسی لیے اگر غیر عیسائی مذاہب نجات اور تاثیر کے لائق ہیں، تب عملی فوائد پر نظر رکھنے والوں کے لیے بھی مذاہب معاشرے میں عملی زندگی کی تشکیل کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں، ایک ایسی چیز جو شاید کھلی اور پرامن رواداری کی طرف راغب کرے۔

4. اصول کے طور پر سچائی میں رواداری مضمر ہے

چونکہ خدا سچائی کا بادشاہ ہے، اس لیے اس کی سچائی ان معنوں میں متحمل مزاج نہیں ہے کہ یہ ہماری مرضی پر منحصر ہے اور مصالحتوں اور نرم گومروت کے لیے لبرل کھوج کا موضوع بن سکتی ہے۔ لیکن چونکہ خدا تنہا سچائی کا بادشاہ ہے، اس لیے انسانی علم میں سچائی متحمل مزاج ہے اور مذہب میں عقیدہ رکھنے والے مکمل سچائی کی مکمل جانکاری کے راستے پر گامزن ہیں۔

4.1 خدا افضل و برتر ہے

وہ تحمل جس کا ہم یہاں پر ذکر کر رہے ہیں، اس کا تعلق خدا کی اصلی سچائی سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اس سچائی سے ہے جو انسانوں کے درمیان جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ اور یہ سچائی اصلی نہیں ہے بلکہ ہمیشہ نسبتی ہوتی ہے، یعنی یہ نامکمل، بالیاقت رہتی ہے اور کاملیت اور درستگی چاہتی ہے، کیوں کہ اپنی سچائی کا انکشاف کرتے وقت بھی خدا افضل و برتر رہتا ہے، یعنی انسانی

صلاحیت، ان شرائط اور انسانی استعمال سے پرے۔ پال، دی اپوسٹل بغیر کوئی غلطی کیے کہتے ہیں کہ ''ہم لوگ صرف جزوی طور پر جانتے ہیں'' (1 Cor 13:9)۔ اسی لیے پال عیسائیوں سے چاہتے ہیں کہ : ''آپ خدا کے علم میں آگے بڑھ سکتے ہیں'' (Col 1:10)۔ یہی خواہش پیٹر کے دوسرے خط میں بھی ظاہر کی گئی ہے ''لیکن ہمارے مالک اور محافظ جیسس کرائسٹ کی مہربانی اور ان کے علم میں بڑھیے'' (2 Pf 3:18, cf. 1:8)۔

4.2 علم میں اضافہ

اسی لیے عقیدت مندوں کا فرقہ کرائسٹ کی مکمل سچائی کے مکمل علم کی طرف اپنی راہ پر گامزن ہے اور اسے اس علم میں آگے ضرور بڑھنا چاہیے۔ دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ اس میں امدادی چیز میں اس طرف لگائی جانے والی توجہ ہے کہ دوسرے مذاہب میں کیا چیز صحیح اور اچھی ہے کیوں کہ ویٹیکن دوئم کے مطابق دوسرے مذاہب میں اچھائی اور سچائی کے یہ عناصر ''فضل الٰہی'' سے آتے ہیں۔ چرچ اپنا وہ کام پورا کر لیتا ہے اگر وہ کرائسٹ کی سچائی کے مکمل علم کو حاصل کرنے کے لیے خود کو آمادہ کر دے۔

یہ مکمل علم صرف وقت کے اخیر میں ہی حاصل ہوگا۔ تب تک چرچ مقدس روح کی نگرانی میں رہتا ہے جو کہ ''تمام تر سچائیوں میں'' (Jn 16:13) اس کی رہنمائی کرے گی۔

جب تک عیسائیوں کا فرقہ، یعنی چرچ اپنے راستے پر ہے وہ دوسرے مذاہب کے ساتھ تمام سچائیوں کی ملکیت کے ضدی دعوے اور ضدی عدم تحمل جیسی علامت کے ساتھ متصادم نہیں ہوگا۔ وہ ان کے ساتھ کھلے پن سے متصادم ہوگا اور خدا کی روح کی پرت در پرت سرگرمی کی تفتیش کے لیے تیار رہے گا، اس روح کی آزادی پر اعتماد کرے گا اور اس میں خدائی عمل کے ذریعے جو کچھ صحیح اور اچھا ہے اس کا احترام کرے گا، پہچانے گا، اس کی حمایت کرے گا اور اسے حاصل کرے گا۔

4.3 سچائی کے وافر ذخائر

خدا کی سچائی کو مجموعی طور پر نہ جان پانے کی انسانی کمزوری کو نہ صرف خدا کی افضلیت کے معاملے میں مذہبی سچائی کے موضوع کے طور پر تسلیم کرنا چاہیے اور اس طرح ایک موزوں تحمل کی ضرورت کے طور پر جو ان لوگوں کے رشتوں کے درمیان ہے جو خدا پر اور اس کی سچائی پر اعتقاد رکھتے ہیں، بلکہ خدا کی لامحدود سچائی کے ذخیرہ کے سلسلے میں بھی انسانی حدود کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ''اسی لیے کوئی بھی خدا کی روح کی بجائے یہ نہیں سمجھ پاتا ہے کہ اصل میں خدا کا کیا ہے'' (1 Cor 2:11)۔

خدا کی سچائی نہ صرف یہ کہ لامحدود ہے اور تمام انسانی صلاحیت سے پرے ہے تاکہ انسان واضح طور پر اسے سمجھنے کی بجائے اسے صرف اندھیرے میں ٹٹولے۔ خدا کی سچائی جو کہ انسان کے لیے قابل رسا بنائی گئی ہے وہ اپنی مشمولات میں اتنی پیچیدہ ہے کہ اسے بہتر طور پر اور تمام تفصیلات کے ساتھ جاننے کے لیے متعدد کوششوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

کیا تمام تاریخ، اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ، خدا کے صبر کا مقام نہیں ہے؟ دراصل تاریخ وہ مقام ہے جہاں پر اس کی سچائی علم کے دروازے کھولتی ہے اور افراد اور فرقوں کی زندگی کے بارے میں بتاتی ہے۔

حقیقت میں عقیدت مند حضرات کے پاس سچائی نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ سچائی پر ان کی مرضی بھی نہیں چلتی۔ حقیقت میں عقیدت مندوں کو اس بات کا موقع ملتا ہے کہ وہ سچائی کو پکڑیں اور اس سے مالا مال ہوں۔ نہایت ہتک کی صورت میں وہ خدا کے قدموں کو سنتے ہیں اور تمام لوگوں کے عقیدہ اور ان کی زندگی میں اس کے راستے کو تلاش کرتے ہیں۔ وہ یہ امید کرتے ہیں کہ خدا کی سچائی کی کرن، جس کا مشاہدہ بار بار مذہبی روایات میں کیا جا سکتا ہے، ایک ایسا مضبوط پل تعمیر کرسکتا ہے جو تمام ادیان کے پیروکاروں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہو اور انھیں ایک عظیم مذہبی اتحاد کا راستہ دکھاتا ہو۔

5. سچائی جس پر عمل کیا جاتا ہے

سچائی صرف وہی سچائی نہیں ہے جس پر ہم یقین رکھتے ہیں اور جس کی ہم تشکیل کرتے ہیں اور جس کے بارے میں بحث کرنا چاہتے ہیں بلکہ سب سے بالاتر مذہبی سچائی وہ سچائی ہے جس پر ہم عمل کرتے ہیں : ''لیکن وہ لوگ جو وہی کرتے ہیں جو سچ ہے، وہی لوگ روشنی میں آتے ہیں'' (Jn 3: 21)۔ اسی لیے یہ نہایت اہم ہے کہ خود اپنے ہی مذہب کی سچائی اور اخلاقی اقدار کو دوسروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی بنیاد کے طور پر لیا جائے اور دوسروں کے ساتھ مل کر مذہبی فرقوں کے درمیان باہمی تعاون کا منصوبہ تیار کیا جائے۔

دیگر چیزوں کے ساتھ اس کا مطلب ہے :

- دوسروں کے ساتھ غلط برتاؤ کرنے سے پرہیز کرنا،
- انسانیت سے معمور سماجی نظام کے لیے مشترکہ طور پر آواز اٹھانا اور
- خدا کی مخلوق کے طور پر تمام انسانوں کے ساتھ ہمہ گیر ہمدردی۔

6. عملی تعاون

مختلف مذاہب کے درمیان ہونے والا مذاکرہ ایسا ہونا چاہیے کہ وہ باہمی تعاون کی طرف رہنمائی کرے اور اس کی حمایت کرے۔ اس کی نوعیت صرف یہ نہیں ہے کہ مختلف شرکا ایک دوسرے کی طرف منہ کرکے بیٹھیں اور مشترک باتوں کا ذکر کریں بلکہ اس کی نوعیت یہ ہے کہ شرکا ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور ان مسائل پر غور کرتے ہیں جو ہم سبھی کے لیے تشویش ناک ہے :

- ہر شخص کو خود اپنے آپ سے اور اپنے مذہبی فرقہ سے یہ پوچھنا چاہیے کہ وہ ان مسائل کو حل کرنے میں کیا مدد کرسکتے ہیں اور وہ اس مدد کے مطالبہ کے تحت آتے ہیں؛
- ہر شخص کو اپنے ساتھی سے یہ پوچھنا چاہیے کہ وہ اور ان کا مذہب کیا مدد پہنچا سکتا ہے اور وہ اس مدد کے مطالبہ کے تحت آتے ہیں؛

- ان دونوں کو ایک ساتھ مل کر مشترکہ طور پر مدد کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔
- اور اخیر میں، مشترکہ طور پر مشترکہ امداد پہنچائیں۔

7. خلاصہ

سچائی اور تحمل، مذاکرہ اور باہمی تعاون لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے کھولیں اور انھیں ایک دوسرے کے قریب لائیں۔ انھیں ان لوگوں کو اس لائق بنانا چاہیے کہ وہ ہماری اس ایک دنیا میں تمام لوگوں کے ساتھ ہمدردی کا تجربہ کرسکیں، یعنی ہمہ گیر بھائی اور بہن کا رشتہ۔

ہمارے مختلف ثقافتی اور مذہبی نظام کے حوالے سے اس کا مطلب ہے کہ انھیں ایک ایسا راستہ تلاش کرنا ہے جو انھیں ماضی کی آپسی دشمنی سے باہر نکالے اور باہمی وجود کے ذریعے ایک ساتھ اور ایک دوسرے کے لیے زندگی بسر کرنے کی نئی شکلوں کی طرف ان کی رہنمائی کرے۔

سوالات و مداخلات

عقیدہ کا تجربہ اور بیان باہم مربوط ہیں

شبستری :

پروفیسر خوری نے اپنے مقالے میں عقیدہ کو یقینیت سے جوڑا۔ اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ عقیدت منداپنے عقیدہ پر اس طرح کبھی سوال نہیں کرسکتا جس طرح وہ اسے سمجھتا ہے اور اسی طرح اس کی تشکیل کرتا ہے؟ یہ مسئلہ اس لیے کھڑا ہوتا ہے کیوں کہ ایک عقیدت مند کے ذریعے اس کی وضاحت کیے بغیر عقیدہ کا کوئی تجربہ موجود نہیں ہوتا۔ بہرحال، اگر عقیدہ کے تجربہ اور اس کی وضاحت کو باہم مربوط کردیا جائے تو تمام دانش ورانہ چیلنجز، تمام سوالات اور موضوعاتی غیر یقینیت اس عقیدہ کا حصہ بن سکتی ہے۔ ساتھ ہی اس کا اثر اس کے مشمولات، عقیدہ کی زبان پر بھی ضرور ہونا چاہیے تاکہ ہوسکتا ہے کہ بعض دفعہ ہم اپنے عقیدہ کا اظہار کرنے کے ذاتی طریقے کے بارے میں غیر یقینیت کا شکار ہوں۔ لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک عقیدت منداپنے منطقی شکوک کے بغیر کیا ایک عقیدت مند رہ سکتا رہ سکتی ہے۔

یہ سوالات ہمیں سچائی کے علم کی طرف متحرک کرسکتے ہیں

خوری :

میرے خیال سے ہمیں اس سوال کے دو گوشوں کے درمیان تفریق پیدا کرنی ہوگی: ایک طرف عقیدہ کے مشمولات جس کی گارنٹی عقیدت مندوں کو خدا کی حکمرانی اور اس کے لفظ کے ذریعے دی جاتی ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت کہ مختلف اسباب کی بنا پر ہم عقیدہ کے ان مشمولات کو مخاطب کرکے بعض سوال کرسکتے ہیں تاکہ چیزوں کو سیدھے طور پر حاصل

کیا جا سکے، مشکلوں کو دور کیا جا سکے اور اپنی فہم و فراست کو فروغ کیا دیا جا سکے اور اس میں گہرائی پیدا کی جا سکے۔ عقیدہ کے مشمولات پر ہمیشہ سوال اٹھایا جاتا رہے گا کیوں کہ اس کے بغیر ہم سچائی کے علم کے طرف پیش رفت نہیں کر سکتے۔ اس سیاق و سباق میں، بعض محفوظات اور شکوک پیدا ہو سکتے ہیں کہ کیا ہم نے اپنے عقیدہ کو بہتر طریقے سے سمجھ لیا ہے یا پھر اس میں بعض ترمیموں اور اصلاحات کی ضرورت ہے۔ یہ مسائل کوئی ضروری نہیں ہے کہ عقیدت مندوں کے خدا میں یقین کے جذبہ کو کوئی ٹھیس پہنچائیں گے یا پھر ان چیزوں کا انکار کریں گے جو پہلے سے ہی عقیدے کے معاملے میں اس کی سمجھ میں آ چکی ہیں۔ اس کے برعکس، اس کا یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے اپنی پیٹھ موڑ لیں، بلکہ اس سے خدا کی طرف مزید رغبت پیدا ہو سکتی ہے اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ خدا سے مدد چاہے گا، جیسا کہ قرآن میں سورۃ 20 کی عبارت 114 میں کہا گیا ہے کہ ''اے میرے خدا! علم کی طرف میری رہنمائی کر۔''

ماضی کے بوجھ سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لیے ہمیں کئی سوالات کی ضرورت ہے

خضر :

مذاکرہ کے عظیم مذہبی اور سماجی فلسفی مارٹن بوبر ہیں؛ میں یہاں پر صرف ان کی بنیادی کتاب کے بارے میں یاد دلاتا ہوں، یعنی "I and Thou" (1923)۔ ان کی یہ رائے تھی کہ جب تک آپ خود کو کسی سوال کے تحت نہیں رکھیں گے، تب تک آپ مذاکرہ کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ لیکن کیا عقیدت مند اس طریقے سے اپنے آپ کو سوال کے ماتحت سمجھ سکتا ہے؟ میں سب سے پہلے عیسائیت کی طرف سے اس سوال کا جواب دوں گا، ہمیں اپنی چرچ کی تاریخ کو سوال کے ماتحت سمجھنا ہوگا۔ ہم اس بات کو ضرور مانیں گے کہ چرچ کی بعض پوزیشن میں ترمیم کی جا سکتی ہے یا اسے دوبارہ لکھا جا سکتا ہے، وغیرہ۔ اگر ہم اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں

گے تو کیا ہم یہ سوال کرنا نہیں شروع کریں گے کہ یہ تمام کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں جن چیزوں کا اعلان کیا گیا ہے یا جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ اب بھی ضروری ہیں اور آج بھی مددگار ہیں؟ اگر میں صرف یہ سوچوں کہ رومن اور آرتھوڈاکس چرچوں کے درمیان یہ تمام تنازعات — کیا یہ تمام تنازعات اب بھی ضروری ہیں؟ اور ماضی میں بھی، کیا ان کی اصل بنیاد موجود تھی؟ کیا صدیوں تک یہ خطرناک اور خونیں غلط فہمیوں پر مبنی نہیں تھی؟ پندرہ صدیوں سے زیادہ Council of Chalcedon (451) سے الگ رہنے کے بعد ہم یہ شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے زیادہ تر وقت ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی کرنے پر صرف کر دیا۔ تب کچھ نہ کچھ واقعی سوال کے ماتحت ہے۔

چیزوں کی وضاحت اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے

اس لیے مباحثہ کا پہلا مقصد ہمیشہ چیزوں کی وضاحت کرنا ہوگا۔ میں ممکنہ طور پر ایک مسلمان کے ساتھ مباحثہ کرنے پر تیار نہیں ہو سکتا اگر میں سمجھوں کہ مجھے اسلام کے بارے میں تفصیلی علم ہے۔ انھیں اپنے آپ کو بھی بیان کرنا ہوگا۔ قرآن کے ایک قاری کے طور پر، میں اپنے آپ سے یا یہاں پر اپنے کسی مسلم دوست سے سوال کر سکتا ہوں کہ کیا وہ واقعی اس میں یا اس میں یقین کرتے ہیں جس کے بارے میں کوئی بھی ایذا برداشت کر سکتے ہیں۔ یہی مسلمانوں کے لیے بھی صحیح ہے جو خود بھی اچھے روحانی لوگ ہیں، جب وہ ہم عیسائیوں سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ہم ان چیزوں کو ماننے کے لیے واقعی عام ذہن کے لوگ ہیں جنہیں سمجھنا مشکل ہے۔ اس لیے یہ چیزوں کو واضح کرنے کا سب سے پہلا قدم ہوگا تا کہ غلط فہمیوں کو دور کیا جائے اور دوسروں کو بیوقوف نہ سمجھا جائے یہ اس میں یا اس میں یقین رکھتے ہیں۔

ایک دوسرے کے قریب آنے کے لیے ایک تعلیمی عمل ضروری ہے

ایک مثال کے طور پر میں یہ سوال اٹھانا چاہتا ہوں کہ قرآن کی نظر میں دراصل کون لوگ

عیسائی ہیں۔ کیا وہ نصاریٰ (cf. Quran 2,62.111.113) ہیں؟ اس اصطلاح کی بنیاد کہاں پڑی؟ کیا اس وقت کے عرب کے ہیبریو کی طرف سے؟ کیا نصاریٰ عیسائی ہیں یا عیسائی نہیں ہیں؟ بعض دفعہ قرآن ان لوگوں کے خلاف بات کرتا ہے۔ لہٰذا یہ نہایت اہم ہے کہ ہم ایک ساتھ مل کر اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں - پہلے تو مسلمان کیوں کہ یہ ان کی مقدس کتاب ہے، لیکن اس کے بعد ہم عیسائی بھی، جو میری طرح اس کتاب کو پڑھتے ہیں - حقیقت میں یہ لوگ کون ہیں، اور قرآن کے ذریعے کن لوگوں کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے۔ تعلیمی عمل کی یہ صرف ایک مثال ہے جو کہ ایک سنجیدہ مذاکرہ کے لیے ضروری ہے جس کا مقصد لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا ہے۔

خدا کی پکار پر انسانوں کا لبیک کہنا علم نہیں ہے بلکہ عبادت ہے

بشتیہ :

عقیدت مندوں کے لیے، خدا ہمیشہ وہ ہے جو پہل کرتا ہے، اور ہم انسان وہ ہیں جو اس کے ذریعے پکارے جاتے ہیں۔ خدا کی اس پکار کے بارے میں ہماری بنیادی تشکیل علم نہیں ہے، بلکہ عبادت ہے، جس میں خاموش ہونے کا وقت بھی شامل ہے۔ یہ عبادت کئی مختلف شکلیں اختیار کر سکتی ہے : شکریہ ادا کرنا، اپیل کرنا، تعریفی کلمات، شکایت، تلاش، اور کشتی بھی، جیسا کہ یعقوب (Jacob) نے کیا (cf. Gn 32:23-33)۔ ہمارے عقیدہ کا یہ کھلا پن ہمیشہ اس حقیقت سے واسطہ رکھے گا کہ عقیدے کی تمام چیزوں میں، پہل خدا کی طرف سے ہوگی۔ وہ ایک بادشاہ ہے، ہمارے عقیدہ کا بادشاہ بھی۔ اسی لیے، عقیدت مند کے طور پر، ہم وہ لوگ نہیں ہیں جو جانتے ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو دعا کرتے ہیں، ''ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جس پر تو نے اپنی مہربانی نازل کی'' (قرآن 1,6 f) کیوں کہ اس کے خیالات ہمارے خیالات نہیں ہیں نہ ہی اس کے راستے ہمارے راستے ہیں (cf. Is 55:8; Mt 16:23)۔ عقیدت مندوں کے لیے اس کا مطلب ہے اسے ہمیشہ اس میں چلنے کو کہا جاتا ہے

جو کہ گمان سے پرے ہے، تاکہ وہ سوالات جو تنقیدی ہیں اور بعض دفعہ شکوک وشبہات والے سوالات ہوتے ہیں، وہ پیدا ہوں اور ان کا جواب دیا جا سکے، چاہے خدا یہ یا وہ چاہتا ہے اور خدا کی سچائی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس گذارش میں، ''ہمیں سیدھا راستہ دکھا''، پورا انسانی وجود موجود ہے، کوئی بھی انسان اس سے خارج نہیں ہے، اس میں رات اور دن، روشنی اور اندھیرا، پیدائش اور موت، تمام چیزیں شامل ہیں۔

ہمارے عقیدہ کے لیے تاریخی طور پر مشروط نوعیت

ماربو :

میں پروفیسر خوری کی اس بات کے لیے کافی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے یہ تین اسباب بتائے کہ ہمیں کیوں اپنے عقیدہ کے مشمولات کے بارے میں تین سوالات کرنے چاہئیں : اول، وضاحت کی کمی کو پورا کرنے کے لیے، دوئم، پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے اور سوئم، مزید ترقی کے لیے مواقع پیدا کرنے کے لیے۔ اور مجھے تشویش ہے کہ کیا یہ ہمیں ہمارے راستے پر آگے لے جا سکتا ہے اگر ہم اس حقیقت کے بارے میں زیادہ باشعور ہو جائیں کہ انفرادی عقیدت کس حد تک اپنی ذاتی فطرت میں متعدد تاریخی حقائق سے مشروط ہے، جیسے پیدائش، تعلیم اور بعض دفعہ کوئی معمولی اتفاق۔ بالغ ہونے کے ناطے ہم یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم کون ہیں اور ہم کیا ہیں، اس کے لیے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ پھر یہ اس کو ملحوظ نظر رکھنے میں مددگار کیوں نہیں ہو سکتا کہ ہم عیسائی ہیں اور مسلم نہیں ہیں یا پھر ہم مسلم ہیں اور عیسائی نہیں ہیں؟

عقیدہ سب سے پہلے اس فرقہ سے آتا ہے جس میں ہم پیدا ہوئے ہیں

خوری :

مذہبی تعلیم میں پہلے اقدامات سب سے پہلے اس فرقہ میں اٹھائے جاتے ہیں جس میں

انسان پیدا ہوا تھا۔ وہاں پر کس چیز کی تشکیل ہوئی اور بچپن کے ایام میں اس میں مزید ترقی ہوئی، ان کی بازیافت اس وقت ضرور ہونی چاہیے جب ہم بڑے ہو جائیں، تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ عقیدہ کے عمل کو ذاتی ارادہ کے عمل کے طور پر محسوس کر سکیں، خدا کے لفظ کے تئیں اپنی خواہش اور منطق کے ذریعے لگن — اس میں سوال اٹھانے کی وہ لیاقت بھی شامل ہے جو ہم اسکول میں مذہبی تعلیم کے دوران مزید علم کے لیے اٹھاتے ہیں، اس فرقے کے ذریعے جس میں ہم زندگی جی رہے ہیں، مذہبی خطابات کے ذریعے، وغیرہ۔ ظاہر ہے اس میں بعض دوسری چیزیں بھی شامل ہیں جو عقیدہ کو سمجھنے کے لیے اور عقیدے کو پختہ بنانے کے لیے ضروری ہیں، جیسے ادب، تعلیم بالغاں وغیرہ۔

اتفاق اور ذاتی ذمہ داری کا امتزاج

ماربو :

کیا وسیع سطح پر عقیدہ کا تعلق اتفاق سے نہیں جس کی شروعات اس فیملی سے ہوتی ہے جس میں ہم پیدا ہوئے؟

خوری :

درحقیقت، عقیدے کی شروعات، ہماری زندگی میں دیگر چیزوں کی طرح، تاریخی حالات کے مکمل نظام سے مشروط ہے۔ ان تمام چیزوں کے ساتھ بعض تاریخی شرائط کے تحت ہماری زندگی میں کیا رونما ہونا چاہیے، وہ سب مختلف طریقے سے واقع ہوسکتا ہے۔ اس کا سامنا ہمیں اپنی پوری زندگی میں کرنا ہے اور اسے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے ہمیں اس اتفاق کو اپنے ذاتی ارادہ میں شامل کر لینا چاہیے۔

ایک عقیدت مند وہ ہے جو خدا کی تلاش میں ہے

شبستری :

کچھ عرصے سے میں اپنے آپ سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا یہ زیادہ موزوں ہوگا کہ عقیدہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے 'یقینیت' کا لفظ استعمال نہ کیا جائے۔ شاید ہمیں یہ کہنا

چاہیے کہ ہم اپنی زندگی میں ہمیشہ یقینیت کی تلاش میں سرگرداں ہیں، لیکن شاید اسے حاصل کرنے کے لائق نہیں ہیں۔ اس حالت میں، عقیدے کو یقینیت حاصل کرنے کی ایک کوشش کے طور پر سمجھنا چاہیے کیوں کہ ہم غیر یقینیت کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ ہم سچائی کو محسوس نہ کر لیں۔ یقین شاید ایسی چیز ہے جہاں پر صرف کچھ لوگ ہی پہنچ سکتے ہیں۔ جب عقیدہ کی تشریح کی جاتی ہے، تو ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ ایک عقیدت مند وہ ہے جو خدا کی تلاش میں ہے۔ جس طرح عقیدہ میں یقین کو تلاش کرنا مشکل ہے اسی طرح اسے تلاش کرنے والا بننا آسان ہے۔ دوسری چیزوں کی طرح ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ہم تاریخ کے ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جہاں یقین گم ہو چکا ہے : سائنس، فلسفہ، سیاست وغیرہ کے میدانوں میں۔ اس لیے موجودہ وقت اور زمانے میں انسان ایک ایسا آدمی بن جاتا ہے جو اپنے طریقے سے سوچتا ہے اور خدا میں اپنے طریقے سے یقین رکھتا ہے۔

ہم خدا کی تلاش میں کیوں سرگرداں رہتے ہیں؟

خوری :

جب کوئی شخص خدا کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے تو اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ لیکن انسانی یقین میں ہم متعدد درجات کی نشاندہی کر سکتے ہیں — یہاں اور وہاں پر مکمل یقین موجود ہوسکتا ہے، ایک بہت مضبوط یا کم مضبوط یقین وغیرہ۔ لیکن ایک ابتدائی یقین ضرور ہونا چاہیے کیوں کہ اس کے بغیر انسان، موجود دور کے متضاد حالات کے تحت خدا کی تلاش میں نہیں نکل سکتا۔

ریگستان میں ایک سیاہ رات — کیا ہم وہاں سے نکل پائیں گے؟

شبستری :

ایسے بہت سے عظیم صوفیائے کرام ہیں جو اپنے تجربہ کا موازنہ ریگستان کی اس ایک اندھیری رات سے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں جس میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ

وہاں سے بھاگنا بھی چاہتے ہیں جہاں پر وہ ہیں۔ خاص کر حافظ (شیرازی) نے اس قسم کی بات کی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ اس ریگستان سے باہر جانے کا راستہ کدھر ہے - یہ رات ہے جس کی وجہ سے چاروں طرف سیاہ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ بعض دفعہ وہ اپنی اس حالت کی مثال اتھاہ سمندر میں ایک ٹوٹی ہوئی کشتی سے دیتے ہیں جس کو مسلسل بھنور سے ڈوبنے کا خطرہ لاحق ہے۔ ایسی حالت میں آدمی خدا سے مدد مانگتا ہے - لیکن اسے Feuerbach کی معنوں میں نہیں سمجھنا چاہیے - اور اسے کھوجنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس قسم کی تلاش ناکامی کے تحت بھی ہوسکتی ہے - ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی پیاسا آدمی پانی کی تلاش کررہا ہے لیکن اسے اس بات کا کوئی بھروسہ نہیں ہے کہ پانی وقت پر مل ہی جائے گا۔

.....اور بے کسی کی حالت میں بھی وہ خدا پر ہی بھروسہ کرتے ہیں

خوری :

میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ صوفی سنت اسلام میں اور عیسائیت میں، اور دوسرے مذاہب میں بھی اسی قسم کے تجربہ کی باتیں کرتے ہیں کہ وہ ایک اندھیری سرنگ میں ہیں۔ اندھیرے میں وہ ٹٹول رہے ہیں، وہ ایسا محسوس کررہے ہیں کہ انھیں چھوڑ دیا گیا ہے، خدا نے انھیں قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی وہ خدا ہی کی طرف دیکھتے ہیں جو انھیں ان کی بے کسی کی حالت سے بچا سکتا ہے۔ اور اس طرح وہ بے کسی کی حالت سے خدا کے ساتھ ٹکراؤ کی حالت میں منتقلی کا تجربہ کرتے ہیں۔ ان کی یہ امید و یقین کہ سرنگ کے دوسری طرف خدائی روشنی موجود ہے، یہ صوفی سنت زندگی بسر کرنے میں مصروف ہیں۔

مذہبی تعلیم کے معاملے میں ہمیں ان لوگوں کے ساتھ مذاکرہ کے لیے تیار کرنا چاہیے جن کے ساتھ ہم زندگی گزار رہے ہیں

بیلاربی :

مجھے خوشی ہوگی اور پروفیسر خوری اب بھی مزید تفصیل کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ ان کے

بیش قیمتی مقالہ میں 'عقیدت مندوں کا فرقہ' لفظ سے کیا مراد ہے۔ اس پیش کش کے درمیان میں مذاہب کے مابین مذاکرہ کا بیان تھا۔ لیکن ایسے دوسرے فرقے بھی موجود ہیں اور ان میں سے بہت لوگ یقین نہیں رکھتے۔ کیا باہمی تعاون اور مذاکرہ کے ذریعے ہم تمام لوگوں کو آپسی تجربے کو بانٹنے کے لیے تیار رہنا چاہیے، اس کے بعد یہ مذاکرہ تمام لوگوں کے ساتھ ہونا چاہیے نہ کہ صرف ان لوگوں کے ساتھ جو عقیدت مند ہیں یا یقین رکھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر : اگر ہماری دنیا میں مذاکرہ کی ضرورت پڑتی ہے، تو حقیقت میں تعلیم کو اس لائق ہونا چاہیے کہ وہ ہمیں مذاکرہ کی طرف مائل کرے، مذہبی فرقوں، ثقافتوں اور تہذیبوں کے درمیان مذاکرہ کی طرف مائل کرے۔

خوری :

اس اجلاس کے ڈھانچے میں مجھے مذہبی تعلیم کے بارے میں بولنا تھا، اور اسی وجہ سے مجھے مذہبی فرقوں کو ان کا یہ وعدہ یاد دلانا تھا کہ وہ مذاکرہ کریں اور مذاکرہ کی روح کے ساتھ اپنے پیروکاروں کو تعلیم دیں۔ دوسری جانب، ایک بار جب یہ بنیاد پڑ جاتی ہے تاکہ لوگ یہ محسوس کرنے لگیں کہ مذاکرہ کافی مثبت ہے اور اگر ہم عمومی طور پر لوگوں کے درمیان مثبت رشتوں کو قائم کرنے میں سنجیدگی کے ساتھ دلچسپی لینے لگتے ہیں تو پھر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ مذاکرہ میں میرا ساتھی ایک عقیدت مند ہے یا 'نیم عقیدت مند' یا پھر غیر عقیدت مند۔ اگر مذاکرہ کے لیے کوئی موقع میسر ہوتا ہے تو تمام مذہبی تعلیم کو سبھی لوگوں کے ساتھ مذاکرہ کرنے کے لائق ہونا چاہیے۔ اسی لیے ہم یہ نہیں چاہتے کہ اس مذاکرہ کو اپنے ساتھی عقیدت مندوں یا دیگر مذاہب کے ماننے والوں تک ہی محدود کردیا جائے، بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ مذاکرہ ان تمام لوگوں کے ساتھ ہو جن کے ساتھ ہم زندگی بسر کررہے ہیں۔ عقیدت مندوں کی مذاکرہ اور تعاون کی خواہش سے کسی کو بھی خارج نہیں کیا جانا چاہیے، اور اس طرح جیسا کہ میں نے پہلے کہا، مذاکرہ کو تمام لوگوں کے ساتھ تمام لوگوں کی ہمدردی کے اظہار کے طور پر ہونا چاہیے۔

آپ عقیدہ کو سچائی سے الگ نہیں کر سکتے

صالحہ ایس محمود :

پروفیسر خوری کی پیش کش نے یہاں پر بیٹھے تمام لوگوں کے لیے کئی قسم کے مواد فراہم کیے ہیں، اور میں نے یہ تاثر حاصل کیا ہے کہ مذاکرہ کا مرکزی نقطہ عقیدہ اور سچائی ہے۔ پروفیسر شبستری کے تبصرہ پر عمل کرتے ہوئے ہمیں عقیدہ کو سچائی سے نہیں جوڑنا چاہیے۔ لیکن ہم یہ کیسے جانیں گے کہ سچائی کیا ہے اور یقین کیا ہے؟ عقیدہ یقین نہیں ہے، بلکہ عقیدہ ہم کو سچائی کا یقین دلاتا ہے۔ درحقیقت سچائی اپنے آپ میں جو کچھ ہے، دوسروں کے نظریہ سے اب بھی سوال اٹھائے جانے کے لائق ہے۔ اگر یہ وہ عقیدہ ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ یہ سچائی ہے، تو آپ عقیدہ اور یقین کو سچائی سے الگ نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ سچائی کو براہ راست اس مخصوص عقیدہ سے جوڑا جا سکتا ہے، سچائی شاید وہ سچائی نہیں ہو سکتی جس کے بارے میں سبھی مانتے ہیں کہ یہ سچائی ہے۔ بلکہ سچائی کا وجود عقیدہ اور یقین سے عمل میں آتا ہے۔ یقین ہماری رہنمائی عقیدہ کی طرف اور سچائی کی طرف کرتا ہے۔

مذاکرے سے مراد مذاکرہ ہی نہ کہ کھچ اور

مارٹن بوبر کے کہنے کے مطابق کہ ہم مذاکرہ کے لیے صرف اس وقت آتے ہیں جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہم سوال کے ماتحت ہیں، یہ اکثر ہوتا ہے کہ ہم مذاکرہ کے لیے جاتے ہیں کیوں کہ دوسرا شخص سوال کے ماتحت ہے۔ کیا مذاکرہ ہمارے سامنے یہ چیلنج نہیں پیش کرتا کہ ہم یہ یا وہ نہ کریں بلکہ صرف مذاکرہ ہیں؟

وہ صرف خدا کی تلاش میں نہیں ہیں بلکہ انھوں نے خدا کو پالیا ہے

اور پروفیسر شبستری کے اس بیان کے حوالے سے کہ عقیدت مند وہ حضرات ہیں جو خدا کی تلاش میں ہیں : کیا عقیدت مند وہ نہیں ہیں جنھوں نے خدا کو پالیا ہے؟ میرے خیال

سے وہ صرف خدا کی تلاش میں نہیں ہیں بلکہ وہ کم از کم اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ انھوں نے خدا کو پالیا ہے۔ اس لیے 'یقین' اور 'سچائی' براہ راست ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

خواہش کرنا اور پانا — وہ اصول جن میں چولی دامن کا ساتھ ہے

بشتیہ :

کیا تجربہ ہمیں یہ نہیں سکھاتا کہ ہم خدا کو پانے کی خواہش اس حد تک کریں کہ ہم نے اسے پالیا ہے؟ عمل میں، کیا اس سیاق وسباق میں 'پانے' اور 'کھوجنے' کے دونوں اصول اس نظریہ میں نہیں تبدیل ہوتے کہ ایک دوسرے کو خارج مت کرو، بلکہ ایک دوسرے کو پکارو؟ یہ حقیقت کہ مجھے خدا کی ضرورت ہے، کیا یہ ٹھیک اسی وقت ایک ایسی شرط نہیں ہے کہ میں نے پہلے سے ہی خدا کو پالیا ہے، یا پھر زیادہ صحیح طور پر یہ کہ اس نے مجھے پالیا ہے اور مجھے راستہ دکھا دیا ہے؟ میرے خیال سے خواہش کرنا اور پالینا شاید دونوں ہمارے عقیدہ کے دلکش عناصر ہیں جو ایک دوسرے کو پکارتے ہیں، یہ شاید قول محال ہو لیکن جس کا تعلق حقیقت سے ہے۔

محبت کے قول محال پر

کیا ہم اپنے بین ذاتی رشتوں میں ذہنی تناؤ کے اس حیرت انگیز میدان کا آئینہ نہیں تلاش کر سکتے؟ میں نے جتنا دوسرے کو پایا ہے اتنا ہی میں اس کی طرف سے پکارا جاتا ہوں۔ اور میں دوسرے کی جتنی زیادہ آرزو کرتا ہوں مجھے اتنا ہی یقین ہو سکتا ہے کہ میں نے اسے پہلے ہی پالیا ہے۔ آرزو کرنے میں میں پاتا ہوں، اور پانے میں ایک بار پھر آرزو کرنے والا بن جاتا ہوں۔ بائبل کا "Song of Songs" محبت کے اس حیرت انگیز اور دلکش قول محال سے بھرا ہوا ہے۔

ہم صرف خدا کو پانا نہیں چاہتے بلکہ ہم اس کی رضا بھی چاہتے ہیں

صالحہ ایس محمود :

اگر ہم خدا کی آرزی کے بارے میں بات کریں تو ہمیں خدا کو خوش کرنے کے بارے میں نہیں بھولنا چاہیے۔ یہ واقعی ایک اہم چیز ہے۔ یقین رکھنے والے کا خاص مقصد خدا کو پانا اور اسے خوش کرنا ہے۔ ہم نے اسے پالیا ہے لیکن ہمیں مزید کی ضرورت ہے، ہم اسے خوش کرنا چاہتے ہیں۔ یہی فرمانبرداری کا تقاضا ہے۔

مذاکرہ کا راستہ – یہ ایک لمبا راستہ ہے اور اس کے لیے صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے

خوری :

یہ حقیقت کہ متعدد مذہبی فرقوں کے عقیدت مند مختلف قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں، اس میں صرف یہ نقطہ بچتا ہے کہ مذاکرہ کے لیے رضامندی سے فرار۔ ہمیں اس کثرت کو برداشت کرنا ہوگا اور یہ صبر و تحمل کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہاں سے دوسرے نتائج نکلتے ہیں : ان غلط فہمیوں کا ازالہ جو وقت اور زمانے کی تبدیلیوں اور صدیوں کے گزرنے کے بعد جمع ہوگئی ہیں، موجودہ مشترک باتوں کی توضیح، بعید اختلافات کی بالکل درست تعریف وغیرہ۔ راستہ اب بھی کافی طویل ہے اور اس میں صبر و تحمل کی ضرورت ہے۔

آخری لفظ ہمارے پاس نہیں ہے بلکہ خدا کے پاس ہے

بائبل تاریخ پر خدا کے صبر کے وقت کے طور پر نظر ڈالتا ہے۔ مثال کے طور پر پال، ''اس کی بے انتہا مہربانی اور تحمل و برداشت'' (Rm 2:4; cf. 15:5) کے بارے میں بات کرتا ہے۔ اور پیٹر کا دوسرا خط کہتا ہے کہ ''خدا اپنے وعدے کے بارے میں آہستہ رو نہیں ہے

[……] بلکہ وہ آپ کے ساتھ متحمل ہے، یہ نہیں چاہتا کہ کوئی برباد ہو، بلکہ چاہتا ہے کہ تمام لوگ نادم ہوں'' (3:9)۔ اگر تاریخ کے مختلف ادوار میں ایک دوسرے کے قریب آنا ممکن ہو سکا تو واقعی یہ ایک کمال تھا؛ اس حد تک کہ یہ ناممکن ہے، ہمیں اس حالت کو برداشت کرنا چاہیے۔ آخری لفظ ہمارے پاس نہیں ہے بلکہ خدا کے پاس ہے، جس کے پاس ہمیں اس لفظ کو چھوڑ دینا چاہیے۔

خدا اکیلے ہی کامل ہے، لیکن سچائی کا دعویٰ ناگزیر ہے

گیبریل :

کاملیت کے دعوے اور سچائی کے دعوے کے درمیان امتیاز کرنے کی ذمہ داری کے بارے میں اب بھی ایک لفظ۔ متضاد حالات کے تحت جس طرح کاملیت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ صرف خدا ہی کامل ہے، اسی طرح سچائی کا دعویٰ بھی ناگزیر ہے جس کا تعلق تضادات اور ناقص تکمیل سے نہیں ہے اور اسی طرح ہمارے وجود کے تمام گناہ۔

صالحہ ایس محمود :

معنوی طور پر ''سچائی کے مکمل دعوے'' اور ''مکمل سچائی کے دعوے'' کے درمیان فرق ہے۔

گیبریل :

لفظ 'کامل' کے ساتھ میرا مسئلہ امکانی انسانی حالات سے جڑا ہوا ہے۔

بنیاد پرستی پر قابو پانے کے لیے تعلیم

ناصرہ اقبال

ہم تمام لوگوں کے تعلیم کے حق اور مواقع کی برابری پر بحث کر چکے ہیں۔ اس کو حقوق انسانی کے عالمگیر اعلامیہ اور متعدد بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعے اور ساتھ ہی اقوام متحدہ کے ارکان ممالک کے آئین کے ذریعے گارنٹی عطا کی گئی ہے۔ لیکن زیادہ معاملوں میں یہ اب بھی ایک ادھورا خواب ہے حالانکہ آٹھ Millennium Delvelopment Goals تمام تعلیم کے حق کی بنیاد ہیں۔ تعلیم فراہم کرنے کی ذمہ داری رکن ممالک پر عائد ہوتی ہے، لیکن تعلیم کی نوعیت اور اس کے مشمولات کا تعین کون کرے گا؟ کیا مذہبی تعلیم کو اختیاری ہونا چاہیے یا لازمی؟ کیا پرائیویٹ اسکولوں کو بھی حکومت کے ذریعے چلائے جانے والے اور مالی امداد عطا کیے جانے والے اسکولوں کے مشترکہ نصاب کو اپنے یہاں نافذ کرنے کے لیے کہا جاسکتا ہے؟ کیا اس مشترک نصاب، جسے تمام مختلف جغرافیائی اور نظریاتی حلقوں میں قبول کیا جانا ہے، کو تیار کرتے وقت یہ ممکن ہے کہ مختلف مذاہب کے اندر موجود مختلف عقیدوں اور طبقوں کے کے بیچ مطابقت پیدا کی جاسکے؟

غلط تصورات پر مبنی خیالات، اور غلط مذہبی تعلیم تمام مذاہب میں لوگوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کر رہی ہیں جو دنیا کی اس باہمی رواداری کے جذبے کو برباد کر رہے ہیں جو زمانوں سے پرامن طریقے سے مختلف عقائد اور خیالات کے ساتھ اس کرۂ ارض پر رہنے والے افراد میں پائی جاتی ہے۔ اس پس منظر میں ہمیں بڑی احتیاط کے ساتھ یہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ ہم کس قسم کی دنیا اور کس طرح کے ممالک کی خواہش رکھتے ہیں اور کس طرح ہم رہنما اصول بنا سکتے ہیں اور کیسے انہیں نافذ کر سکتے ہیں۔ آج ہم اپنے وجود کے دوراہے پر کھڑے ہیں۔ کیا ہم مزید ایک دوسرے

سے دور ہوتے چلے جائیں یا پھر ممتاز افراد کے طور پر ایک دوسرے سے قریب ہوں اور اپنی مشترک اقدار کو ایک دوسرے سے بانٹیں جو ہمیں ایک انسانی فیملی کے طور پر متحد کرے۔

بنیاد پرستی لازمی طور پر بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ جدید دنیا کے آغاز تک یہ نسبتاً یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے لیے آسان تھا کہ وہ اپنی اپنی مذہبی کتابوں کے الفاظ کو قبول کریں، انہیں سچ سمجھیں اور انہیں خدا کے ذریعے اتاری گئی کتابیں سمجھیں۔ اب صورتحال مختلف ہے۔ مخصوص نظریوں کی بنیاد پر نئے آزاد ممالک کے وجود، جن کے پاس اپنا علم اور اطلاعات کا ذخیرہ ہے، نے ان لوگوں کی سوچ میں ایک زبردست تبدیلی پیدا کی ہے جو اس تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں اپنے پختہ اعتقادوں پر قائم تھے۔ تمام بنیاد پرستوں میں جو چیز مشترک ہے وہ مخصوص اعتقادوں کی یکسانیت نہیں ہے بلکہ سوچنے کا ایک انداز نیا ہے۔ وہ اس بات میں پختہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کے پاس کامل سچائی کا علم ہے جس کے وہ خدا کی طرف سے نگہبان بنائے گئے ہیں۔ وہ مجاہد بن جاتے ہیں اور سچائی کا اس طرح دفاع کرنے اور اسے پھیلانے لگتے ہیں جیسا وہ اسے دیکھتے ہیں۔ ایک ایسے طریقے سے ان کے مذہبی اعتقادوں کی تشریح کرنے کا عمل جو کہ بدلتے ہوئے ثقافتی منظرنامے کے لیے اہم ہے، اس نے اسی عقیدے کے بہت سے مختلف گروہوں اور مسلکوں کو جنم دیا ہے۔ اس کی وجہ سے بنیاد پرستی کا جدید شدت پسند مذہبی چہرہ سامنے آیا ہے۔

بنیاد پرستی عدم رواداری کو جنم دیتی ہے کیوں کہ یہ لوگوں کو پختہ طور پر اس بات کا یقین دلا دیتی ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر، جو خاص کر ان سے متعلق ہو، خدا کی منشا اور اس کی مرضی کو جانتے ہیں۔ مذہبی بنیاد پرستی مخصوص عقائد اور عمل کا پابند بناتی ہے اور ان چیزوں کو ہمیشہ کے لیے کامل اور متعین سمجھتی ہے۔ وہ رواداری کو اخلاقی کمزوری کی ایک شکل سمجھتے ہیں، یعنی ایک غیر تصدیق شدہ مصالحت جو غلطیوں اور برائیوں پر ٹکی ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے میں عدم رواداری، فوری طور پر مذہبی جنون کو جنم دیتی ہے۔ مذہبی جنون میں مبتلا افراد منطق و دلیل کو نہیں مانتے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے ہیں، کیوں کہ

اس مقصد کو وہ اپنا مقصد نہیں مانتے بلکہ فرمانِ خداوندی سمجھتے ہیں۔

یہ چیز تمام عقائد کی بنیادی تعلیمات کے بالکل برعکس ہے کیوں کہ ہر مذہب اور عقیدہ رواداری اور دوسروں کے عقائد کا احترام کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ عیسائیت اور اسلام دونوں کی یہ تاریخ رہی ہے کہ انھوں نے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو کیسے ڈھالا ہے۔ ان دونوں مذاہب کی ایک زندہ اور سلامت روایت ہے۔ اس کے برخلاف آج کے بنیاد پرست مذہبی تخلیقیت کا گلا گھونٹ رہے ہیں اور ان کے عقیدہ کو غلط سمجھ رہے ہیں جو صحیح راستے پر گامزن ہیں اور نئے علم سے پیدا ہونے والے چیلنجوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

اس بنیاد پرستی کی آبیاری اکثر قومی ریاستوں یا قومی ریاستوں، مفاد پرست لوگوں کے ذریعے کی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے اتحاد کو برقرار رکھ سکیں اور اپنی خود ساختہ سچائیوں کے خیالات کو فروغ دے سکیں اور اپنے پیروکاروں کو یہ سمجھا سکیں کہ وہ تمام دوسرے ممالک سے اعلیٰ و برتر ہیں۔ ہٹلر نے اپنی خود ساختہ بنیاد پرستی کی تبلیغ کی جسے اس کے پیروکاروں نے آنکھ موند کر قبول کیا، ٹھیک اسی طرح جیسے آج امریکہ میں نئے قدامت پسندوں کی بنیاد پرستی کو قبول کیا جاتا ہے جو اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ ان میں سے بہتوں نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ وہ جہاد کر رہے ہیں اور یہ کہ انھوں نے یہ جنگ جیت لی ہے کیوں کہ ان کا خدا ان لوگوں کے خدا سے طاقت ور ہے جن کے بارے میں وہ یہ سوچتے ہیں کہ انھوں نے ان کو زیر کر دیا ہے۔

بعض ریاستیں مذہب کا استعمال لوگوں کو تعلیم سے مستفید ہونے سے روکنے کے لیے کرتی ہیں۔ بعض کم ترقی یافتہ ریاستوں میں تعلیمی کی حمایت نہیں کی جاتی کیوں کہ یہ ذہن کو آزادی عطا کرتی ہے اور لوگوں کو اپنے بارے میں سوچنے کے لائق بناتی ہے اور عوام پر حکمراں طبقے کی باگ ڈور کو ڈھیلا کرتی ہے۔ دوسری جانب طاقت ور اور ترقی یافتہ ریاستیں اپنی مذہبی اور فلسفیانہ دستاویزوں کا استعمال اپنے شہریوں کو یہ باور کرانے کے لیے کرتی ہیں کہ وہ ان مذہبی، ثقافتی یا نسلی گروہوں کو اپنا مطیع ضرور بنائیں جو ان کے سوچنے کے طریقوں سے موافقت نہیں کرتے، حالانکہ اس طرح کے خیالات کا اصل مقصد مذہبی سے زیادہ اقتصادی ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ

سے 'تہذیبوں کا ٹکراؤ' پیدا ہو رہا ہے، جیسا کہ سیموئیل ہنٹنگٹن نے نظریہ قائم کیا تھا۔

ہم ایک منظور شدہ شعور کی شکل کیسے حاصل کر سکتے ہیں جو تمام افراد کو اس بات کی اجازت دیتا ہو کہ وہ ایک میز پر بیٹھیں اور پوری طرح کھلی ذہنیت کے ساتھ متعدد مسائل پر مذاکرہ کریں اس نقطہ تک کہ جہاں پر متعدد امور پر مختلف آرا کی وکالت کرنا ممکن ہو سکے؟ آج حکومت کی جمہوری شکل کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے وہ گونا گونی اور رنگارنگی کا احترام کرتی ہے اور درحقیقت ایسے بہت سے ممالک ہیں جنھوں نے اپنے یہاں جمہوری نظام کو قائم کیا ہے۔ لیکن جمہوریت کے معنی کو صرف یہیں تک محدود نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد آزادانہ انتخابات کرانا ہے۔ جمہوریت وہ ہے جس کی ضرورت ہمیں رات دن اپنے گھر، اسکول، اپنی فیملی، روزگار کی اپنی دنیا اور معاشرے کی ہر سطح پر پڑتی ہے۔ جدید جمہوری سول سوسائٹی تب تک مضبوط تنازعات سے آزاد خوشحال سوسائٹی نہیں بن سکتی جب تک کہ مذہبی کثرت الوجود کو مثبت طرز زندگی کے طور پر قبول نہ کیا جائے۔ یہ بیداری گھر پر بچوں کے ذہن میں پیدا کرنی ہوگی اور پوری دنیا میں تعلیمی اداروں کے ذریعے اس کی تبلیغ کرنی ہوگی۔

صرف وہی ممالک ترقی کر سکتے ہیں جو اپنے منصوبوں میں تعلیم کو ترجیح دیتے ہیں۔ تعلیم سوچنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اور ایک شخص اور معاشرے میں بہتری لاتی ہے۔ 'انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز' کے مطابق :

'تعلیم کو علم کی تمام ترسیل اور اقدار کی تشکیل کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، کیوں کہ یہ سوشلائزیشن کی مترادف ہے۔'

ناخواندگی اور بنیادی انسانی اقدار کے بارے میں لاعلمی کو تمام لوگوں کی کم تر معیار زندگی کے لیے ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا، لیکن یہ حقیقی طور پر فرد واحد کی ترقی اور سماجی حصہ داری کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ کسی بھی معاشرے کی ترقی، چاہے وہ روحانی ہو، مادی ہو، سماجی ہو یا اقتصادی، اس کا انحصار اس تعلیم پر ہے جو اسکولوں میں بچوں کو دی جاتی ہے۔

جمہوری شہریت کے بارے میں تعلیم کا فوکس اس بات پر ہوتا ہے کہ طلبا کو یہ بتایا جائے

کہ جمہوریت کیا ہے، انسانی حقوق کی کیا اہمیت ہے، تصادم کیا ہے اور اسے کیسے حل کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی تعلیم اسکول اور کمیونٹی کے امور اور معاملات میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لینے اور خدمت اور باہمی ربط کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے۔ عمل کے ذریعے ہی وہ تمام علم اور سمجھ بوجھ، مہارت اور تبحر عملی حاصل ہوتا ہے جو جمہوری ملک کا شہری ہونے کے ناطے اپنے رول اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے، یہ حقوق انسانی کا تحفظ کرتا ہے اور اسے فروغ دیتا ہے اور امن کے ساتھ تنازعات کو حل کرنا سکھاتا ہے۔

آج ہماری سماجی زندگی بہت زیادہ پیچیدہ ہوگئی ہے اور پچھلی نسلوں کے مقابلے ہمیں مزید سماجی و اقتصادی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ صورت حال اب مزید لبرل تعلیم کا مطالبہ کر رہی ہے جو تمام بڑے مذاہب اور سماجی اصولوں کے بارے میں بنیادی علم فراہم کرتی ہو اور جو دوسروں کے عقیدوں اور طور طریقوں کا احترام کرنا سکھاتی ہو۔ سماجی مسائل کو کم کرنے میں تعلیم ایک اہم رول ادا کرتی ہے، مذہبی، ثقافتی اور نسلی تنازعات کو ختم کرتی ہے اور یہ انسانی ترقی کو فروغ دیتی ہے۔

ہمیں ایک ایسا منظم تعلیمی پروگرام بنانے پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے جو سائنس، ٹکنالوجی اور اخلاقی اقدار پر مساوی طور پر زور دیتا ہو تاکہ اس قسم کی سماجی ترقی کو یقینی بنایا جا سکے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے بھی لوگ مذہب کے بارے میں جاننے کے لیے مصدق، عملی اور حقیقی ماخذ کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔ تمام تہذیبوں اور عقائد کے مشترک مثبت پہلوؤں کے بارے میں اطلاعاتی پروگراموں کے ذریعے میڈیا ایک اہم کام انجام دے سکتا ہے اور ایک ایسا منچ تیار کر سکتا ہے جہاں پر لوگ مباحثہ کے لیے زیادہ سے زیادہ مسائل کو اٹھائیں اور اپنے تضادات کو مٹانے کے لیے اپنی روزمرہ زندگی کے عملی کاموں کے بارے میں مشورہ دے سکیں۔ لیکن ایک معاشرہ میں کسی شخص کی ذاتی ہم آہنگی اور سماجی ترقی زیادہ تر خواندگی کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔

تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان کا ایک مقدس فریضہ ہے، چاہے اس کے لیے اسے چین ہی

کیوں نہ جانا پڑے۔ مسلم معاشروں میں، مساجد کمیونٹی سنٹر کا کام کرتے ہیں اور ان کا استعمال روایتی طور پر عبادت، تعلیم، سماجی، اخلاقی اور اقتصادی پیش رفت کے لیے کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ چھوٹے سے چھوٹے گاؤں یا کمیونٹی میں اپنی ایک مسجد ہوتی ہے۔ امام کے ذریعے جمعہ میں دیا جانے والا خطبہ جو کہ مختلف ادوار اور معاشرے کے مختلف طبقوں پر مبنی ہوتا ہے، وہ مجمع کے ذہن پر اثر ڈالتا ہے، جس میں اکثر عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ یہ سامع کو تعلیم دینے کا ایک بہترین موقع ہوتا ہے۔ خطبہ کا معیار امام کی دانشوری اور تعلیمی صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے۔ مسجدوں کے امام عام طور پر سیکولر موضوعات کے بارے میں لاعلم ہوتے ہیں اور قرآنی آیات کو حفظ کر لیتے ہیں مگر اس کے فلسفیانہ پہلوؤں کے بارے میں محدود علم رکھتے ہیں۔ زیادہ تر عبادت گزار قرآنی تعلیمات کو امام کے نظریہ سے ہی دیکھتے ہیں۔ بہت سی مسجدوں کے ساتھ مدرسے بھی جڑے ہوتے ہیں جن کی قیادت امام کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور جہاں پر کمیونٹی کے بچے بنیادی مذہبی اور ابتدائی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

بنیاد پرستی کی بیڑیاں زیادہ تر اماموں کے ذہنوں کو قید کر لیتی ہیں۔ وہ تقلید (آنکھ بند کر کے مذہبی ماہرین کے روایتی بیانات کی تصدیق کرنا) کے اصول پر پوری طرح قائم رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں کہتا ہے : ''آج ہم نے تمہارے لیے اس دین کو مکمل کر دیا'' (سورۃ 5,4)۔ قرآن کی تعلیمات رہتی دنیا تک کے لیے ہے، مسلمانوں کو اجتہاد (کچھ نیا دریافت کرنے کے لیے جدوجہد) کا اصول اپنانا چاہیے جو کہ اسلام کے سماجی ڈھانچے کی سب سے اہم تحریک ہے۔

عیسائی معاشروں میں بھی، شاید کم تر درجے تک، گرجا گھر اپنے یہاں آنے والے لوگوں کے ذہنوں اور ان کے اقدار کو فروغ دینے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ پریسٹ (Priest) کا دنیا کے تئیں نظریہ ہی اہل کلیسا کے نظریوں اور آرا کی تشکیل کرتا ہے۔ بہت سارے بچے سنڈے اسکول جاتے ہیں جہاں وہ مذہبی اور اخلاقی اعتقادوں کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ گرجا گھر (کلیسا) اور مسجد عام طور پر ملک کے کنٹرول سے باہر ہوتے ہیں۔ لیکن

حکومت ان کے اوپر نگرانی رکھ سکتی ہیں اور جہاں پر ضرورت محسوس ہو، وہاں تعلیم کے طریقوں اوران تعلیمی مشمولات کو درست کر سکتی ہے جن کی تعلیم کلیساؤں میں دی جاتی ہے۔ حکومتوں کو یہ بات یقینی بنانی چاہیے کہ معیاری تعلیم تک امیر وغریب سب کی رسائی ہو اور کلیساؤں، مسجدوں اور دیگر مذہبی اداروں کو سیاست سے دور رکھا جائے۔ ہمیں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ مذہبی اداروں اور سیکولر تعلیم کے مراکز کے استادوں کے درمیان قریبی ربط اور علم اور مہارتوں کی تقسیم ہو۔ مذہبی اور سیکولر، دونوں اداروں کے اساتذہ کے پاس بنیادی تعلیمی صلاحیت ہونی چاہیے اور انھیں ان معیاروں پر پورا اترنا چاہیے جسے بعض مرکزی اداروں کے ذریعے اوران کی اتفاق رائے سے قائم کیا گیا ہے۔

ایسے فیصلے لینے کی ذمہ داری جس کا مقصد مذہبی، روحانی اور سیکولر روایات کے درمیان مذاکرات کو فروغ دینا ہو، اسے انفرادی طور پر، فیملی اور کمیونٹی کی سطح پر قبول کیا جانا چاہیے۔ مختلف ریاستوں کی حکومتوں کو یہ بھی آگاہ کیا جانا چاہیے کہ رواداری اور باہم دوستی کو فروغ دینے سے اچھی انتظامیہ عمل میں آئے گی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم اپنے مشترکہ عقیدوں پر زور دیں۔ ہم تمام لوگ ایک خدا میں یقین رکھتے ہیں جو کہ وہی خدا ہے جس سے ہم نے اخلاقی قانون حاصل کیا ہے۔ بائبل اور قرآن میں خدا کا ایک ہی پیغام ہے کہ ہم خدا کی عبادت کریں، اپنے والدین کا احترام کریں، اور قتل وغارت گری، چوری، زنا اور جھوٹی شہادت کے بارے میں دونوں کتابوں میں ایک ہی حکم ہے۔

ہمیں اس بات کے لیے کمربستہ ہو جانا چاہیے کہ ہم اپنے معاشرے میں مذہبی امن قائم کریں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی کوششیں کریں۔ پہلا مسئلہ جس کا ذکر کیا گیا وہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ غالب عدم مساوات، غربت اور محرومی کا احساس اور تصادم ہے۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ہمیں بیداری پیدا کرنی ہوگی اور تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا تاکہ نابرابری کو کم کر کے اس دنیا میں عزت ووقار کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی ہم ایک راہ نکال سکیں۔ مختلف ممالک کو اپنے تعلیمی نصاب میں ان عناصر کو شامل کرنا چاہیے جن کا تعلق مشترکہ مسائل سے

ہے اور ان عناصر کو شامل کرنا چاہیے جو اس بات کی وضاحت کر کے ان تضادات کو ختم کر سکتے ہیں کہ مذہب کے تمام ماننے والوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مشترکہ تعلق کیا ہے۔ پوری توجہ رواداری اور دوستی کے عناصر اور خیر خواہی کو فروغ دینے کے لیے ہونی چاہیے۔

اسکولوں اور تعلیمی مراکز کے نصابوں میں سے شعوری طور پر اس تمام مواد کو نکال دینا چاہیے جو تاریخی بدگمانی کو ظاہر کرتے ہوں اور جو آج کے دور میں فرضی داستانیں بن چکی ہیں۔ تاریخ کو بھولے بغیر آدمی کو ان مثبت چیزوں کی طرف دیکھنا چاہیے جو ماضی میں واقع ہوئیں جس میں صدیوں سے عیسائیوں اور مسلمانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارنا بھی شامل ہے۔ مثبت تاریخ پر اس توجہ کے ساتھ ساتھ اسکولی کتابوں میں بھی بعض مثبت اقدام اٹھانے کی ضرورت ہے جس سے یہ بنیاد باہمی امداد کے ذریعے ایک مشترکہ پیش رفت کی عمارت میں تبدیل ہو سکے۔ تمام اسکولی بچوں کو اپنے اپنے مذاہب کی پیروی کرنے کی اجازت دی جانی چاہیے؛ ان کی مذہبی اور ثقافتی روایات کو اسکول کے نصاب کی اضافی سرگرمیوں میں شامل کیا جانا چاہیے تاکہ اس کثرت کے احترام کا جذبہ پیدا کیا جا سکے۔

والدین اور استادوں کو چاہیے کہ وہ طلبا کے اندر سوچ پیدا کریں اور انہیں صحیح راہ دکھائیں۔ تمام اسکولی بچوں کو بڑے مذاہب کے اصولوں اور مشترکہ روایات سے واقف کرایا جانا چاہیے اور ان خصوصیات اور توقعات اور اقدار سے بھی واقف کرانا چاہیے جو ان کے اندر باہم موجود ہیں۔ طلبا کی کردار سازی پر زور دینے سے انھیں اچھا انسان اور ذمہ دار شہری بنایا جا سکتا ہے۔ استادوں کو رول ماڈل کے طور پر کام کرنا چاہیے۔ تعلیم نظریہ پر مبنی ہونی چاہیے اور طلبا کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے کہ وہ سوال پوچھیں، اپنے ذہن میں آنے والی باتوں کو کھلے طور پر، آزادی کے ساتھ اور مثبت طریقے سے بیان کریں۔ ان کے خیالات کو سنا جانا چاہیے، اس پر بحث ہونی چاہیے، اس کا تجزیہ کیا جانا چاہیے اور اسے قبول کیا جانا چاہیے۔ ٹریننگ دینے کے لیے بچوں کی انفرادی صلاحیت کو انھیں سمجھنا چاہیے تاکہ انھیں معاشرہ کا پیداواری رکن بنایا جا سکے۔ پیشہ ورانہ اور مہارت والی تعلیم کے نصاب میں رواداری اور اخلاقی اصولوں کو شامل کیا جانا چاہیے۔

جمہوریت کا مطلب ہے سوچ اور اظہار رائے کی آزادی اور اس بات کی آزادی کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے احسن طریقے سے کر سکے۔

انسانی برتاؤ کے بارے میں عیسائیت، اسلام اور تمام بڑے مذاہب کی مشترکہ تعلیمات کو ہم مجموعی طور پر یوں پیش کر سکتے ہیں :

سچے، سنجیدہ اور سیدھی بات کرنے والا بنو، جھوٹ مت بولو یا ریاکاری مت کرو۔

ایماندار بنو، نہ کہ بداطوار و بے ایمان۔

متحمل مزاج، شریف، نرم گو بنو، نہ کہ تیز آواز میں بات کرنے والا اور ڈینگیں ہانکنے والا۔

اعتدال پسند، دوراندیش اور رحم دل بنو، دوسروں کے ساتھ سختی مت برتو۔

روادار، رحم دل اور معاف کرنے والا بنو، دوسروں کے ساتھ رواداری سے کام لو، ان کی بے عزتی مت کرو اور اظہار خفگی سے گریز کرو۔

سخی بنو، خدا نے جو کچھ دیا ہے اس پر قانع رہو اور اس میں سے دوسروں کو بھی دو، خود غرض اور لالچی مت بنو۔

خوش رہو، رجائیت پسند بنو اور ہمیشہ چاق و چوبند رہو، نہ کہ ترش رو، خشک مزاج یا قنوطیت پسند۔

خود اعتماد بنو اور خدا کے رحم پر یقین رکھو، شکوک و شبہات میں مبتلا نہ ہو اور نہ ہی ناامیدی کا شکار رہو۔

اپنے کاموں کے بارے میں سرگرم اور چوکس رہو، غافل مت ہو۔

خدا کی بے شمار مہربانیوں کا شکریہ ادا کرو۔

عالم کاری کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی اس دنیا میں، جہاں متعدد اور متفرق بین الاقوامی جماعتیں قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر شہریوں کے لیے عالمی معیاروں کو پیش کر رہی ہیں، ریاست شہریوں کے حقوق، فرائض اور ذمہ داریوں کے نفاذ کے لیے مرکزی

انتظامی اور نفاذی ایجنٹ بن جاتی ہے۔ بین الاقوامی ایجنسیاں شہریوں کے اعمال کی نگرانی کے لیے اضافی ذمہ داریاں قبول کر رہی ہیں اور جواب دہی کے اقدامات کی پہل کر رہی ہیں۔ مختلف کنونشنوں کی توثیق اور حکومتوں کے ذریعے انھیں نافذ کرنے کی وجہ سے تعلیم کو جدید شہریت سے جوڑنے میں زبردست کامیابی ملی ہے۔ کسی بھی ملک میں تعلیم کو بہت سے شہریت سے جڑے دشوار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کا حل نکالنا پڑتا ہے اور اس دنیا کے ساتھ ساتھ بھی قدم بڑھانا ہوتا ہے جو کہ بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔ وقت کی ضرورت یہ ہے کہ صرف تعلیم یافتہ افراد پیدا کرنے کی بجائے 'آگاہ اور ذمہ دار شہری پیدا کیے جائیں۔ اس طرح کی تعلیم مساوات کو بڑھاوا دیتی ہے اور دوسروں کے نظریات اور اعتقادات کا احترام کرنا سکھاتی ہے۔ یہ ناانصافی اور عدم رواداری کا جواب ہے اور یہ بنیاد پرستی پر قابو پانے میں ہماری مدد کرتی ہے۔

رواداری صرف ایک خواہشمندانہ اصول ہی نہیں ہے، بلکہ اس کی امن و آشتی کے لیے کی ضرورت ہے اور تمام افراد کی اقتصادی اور سماجی ترقی کے لیے بھی ضروری ہے، "Declaration of Principles on Tolerance" کا آرٹیکل 4 درج ذیل دعویٰ کرتا ہے :

''1- عدم رواداری کو روکنے کا سب سے بااثر ذریعہ تعلیم ہے۔ رواداری کی تعلیم کا پہلا قدم یہ ہے کہ لوگوں کو یہ سکھایا جائے کہ ان کے مشترکہ حقوق اور آزادیاں کیا ہیں، تاکہ ان کا احترام کیا جا سکے، اور دوسروں کے حقوق اور آزادیوں کو تحفظ فراہم کرنے کا جذبہ پیدا کیا جا سکے۔

2- رواداری کے لیے تعلیم کو فوری طور پر نہایت ضروری سمجھا جانا چاہیے؛ اسی لیے ایسی سلسلہ وار اور منطقی رواداری کے تعلیمی طریقوں کو فروغ دینے کی ضرورت ہے جو عدم رواداری کے ثقافتی، سماجی، اقتصادی، سیاسی اور مذہبی ماخذ کو مخاطب کر سکیں گے جو کہ تشدد اور علیحدگی کا منبع ہیں۔

تعلیمی منصوبے اور پروگرام ایسے ہونے چاہئیں جو افراد کے ساتھ نسلی، سماجی، ثقافتی، مذہبی اور لسانی گروہوں اور ممالک کے درمیان فہم و فراست، ہمدردی اور رواداری کے فروغ

میں مدد پہنچائیں۔

3- رواداری کی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان اثرات کا مقابلہ کر سکے جو خوف اور دوسروں کی علیحدگی کا سبب بنتے ہیں اور اسے نوجوانوں کے اندر آزادانہ طور پر فیصلہ لینے، گہرائی کے ساتھ سوچنے اور اخلاقی دلیلوں کا سہارا لینے کی صلاحیت پیدا کرنے میں مدد کرنی چاہیے۔

4 - ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم سوشل سائنس ریسرچ اور رواداری، حقوق انسانی اور عدم تشدد کے لیے تعلیم اور انھیں نافذ کرنے والے پروگراموں کی حمایت کریں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم ٹیچر ٹریننگ، نصاب، نصابی کتابوں اور اسباق کے مواد، اور دیگر تعلیمی مواد جس میں تعلیمی ٹیکنالوجی بھی شامل ہیں، میں بہتری لانے کی طرف اپنی توجہ مرکوز کریں گے، اس نظریہ کے تحت کہ ایسے ذمہ دار شہری پیدا کیے جاسکیں جو دوسری ثقافتوں کے لیے کھلا ذہن رکھتے ہوں، آزادی کی قدر و قیمت کو پہچاننے والے اسے سراہنے والے، انسانی وقار اور زور نگارنگی کا احترام کرنے والے ہوں جو تصادم کو روک سکیں اور ان کا پرامن حل نکال سکیں۔"

تمام ممالک کو چاہیے کہ وہ اپنے منصوبوں میں رواداری کے ان اصولوں کو شامل کرلیں اور اپنے شہریوں کے اندر انھیں داخل کریں تاکہ ایک مستحکم اور پاکیزہ عالمی معاشرہ وجود میں آسکے۔ عملی طور پر مزید حل ڈھونڈنے کی ضرورت ہے تاکہ ایک ایسا مخلوط معاشرہ وجود میں آسکے جو کہ تیسرے ملینیم میں مذہبی، ذاتی، ثقافتی اور نسلی کثرت الوجود کو اپنے اندر سمو سکے، اس لیڈرشپ کی حمایت پر زور دے کے ساتھ جو کثرت الوجود کا احترام اور انتظام کرنے کے ذریعے اتحاد کو فروغ دے۔ اب ہمیں یہ چننا ہے کہ ہم اس دنیا کو منظور کریں جو تصادم کا اکھاڑہ بن چکی ہے، یا پھر ہم اس دنیا کے لیے اپنے ذہن کو کھولیں جس کے پاس پرامن، ترقی پذیر اور تابناک دنیاوی نظام کا نیا اور انسانی نظریہ ہے۔ ہمیں دوسرا راستہ اختیار کرنے کی دعوت دینی چاہیئے، صرف اپنی بقا کے لیے نہیں بلکہ ایک ایسی مجموعی کوشش کے طور پر جس سے ہم اس افق کے متلاشی نہیں جس میں ایک بہتر دنیا کے لامحدود پرکشش امکانات موجود ہوں۔

سوالات و مداخلات

اصل مسئلہ بنیاد پرستی ہے یا دہشت گردی؟

خضر :

اصل مسئلہ : کیا بنیاد پرستی ہے یا دہشت گردی؟ میرے علم کے مطابق، ہمارے پاس دہشت گردی کی نہ تو قانونی تعریف ہے اور نہ ہی فلسفیانہ تعریف۔ میں یہ تصور کرسکتا ہوں کہ ایسے بہت سے عقیدت مند موجود ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ چونکہ ان کے پاس آسمانی کتاب ہے اس لیے ان کا مذہب مکمل ہے۔ اور اپنی الہامی کتاب کی کاملیت کے اس نظریہ پر مبنی ہونے کی وجہ سے وہ لازمی طور پر اس بات کا اشارہ دیتے ہیں کہ دوسرے مذاہب میں بعض چھوٹی یا بڑی خامیاں ہیں۔ ورنہ مذاکرہ کا کوئی مطلب نہیں ہوگا کیوں کہ اگر آپ یہ سمجھنے لگیں کہ تمام لوگ سچائی پر عمل پیرا ہیں تو پھر مذاکرہ کا کوئی مطلب نہیں ہوگا۔

میں یہ نہیں سوچتا کہ ہم اس رائے پر اتفاق کرسکتے ہیں کہ تمام لوگ درست ہیں کیوں کہ ہم سبھی، یہودی یا عیسائی یا مسلم، کا وحی میں برابر حصہ ہے۔ مثال کے طور پر، چونکہ یہودی نہ صرف Old Testament کی طرف رجوع کرتے ہیں بلکہ Talmud پر بھی انحصار کرتے ہیں، جو کہ بعد میں آیا اور جو کہ وحی بالکل نہیں ہے، اس لیے اس رائے کو برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔ ہمیں اپنے مذہب اور محبت میں اعتقاد کے درمیان امتیاز قائم کرنا ہوگا۔ اعتقاد کا مطلب ہوتا ہے محبت اور وہ تمام شاندار اقدار، جن کا ذکر محترمہ اقبال نے کیا۔ اس لیے میرا تھیسس ہوگا : مذاہب کے درمیان امن اس عقیدہ کے ساتھ رہتا ہے کہ آپ کی کمیونٹی نے وحی کو مکمل تسلیم کرلیا ہے۔

اقبال :

پہلا سوال یہ تھا کہ کیا ہم بنیاد پرستی پر مذاکرہ کررہے ہیں یا پھر دہشت گردی پر؟ بنیاد پرستی

کا یہ ماننا ہے کہ صرف آپ کا نقطۂ نظر ہی درست ہے، جب کہ دہشت گردی کا یہ سوچنا ہے کہ دوسرے کے نقطۂ نظر کو بالکل بھی قبول نہیں کیا جاسکتا اور زور زبردستی کے ذریعے اپنے نقطۂ نظر کو دوسروں پر تھوپا جانا چاہیے۔ بعض دفعہ دہشت گردی ردعمل کے طور پر رونما ہوتی ہے۔ ایک آدمی کا دہشت گرد دوسرے آدمی کا مجاہد آزادی ہوسکتا ہے۔ لیکن بنیاد پرستی ہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کی وجہ سے دہشت گردی کا عروج ہو رہا ہے۔

''ہم نے تم میں سے ہر ایک کو ایک قانون اور کھلا راستہ دکھایا ہے''

دوسرا سوال عیسائی نقطۂ نظر کے مطابق ہے کہ ان کی وحی مکمل ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہر عقیدے کے ساتھ : جو لوگ بعد میں آئے وہ کسی نہ کسی طرح قابل قبول نہیں ہیں، جب کہ جو لوگ پہلے آئے وہ قابل قبول ہیں، کیوں کہ ان کا ذکر آپ کی مذہبی کتاب میں ہے اور اسی لیے وہ آپ کے عقیدہ کی روایت کا حصہ بن جاتے ہیں۔

میرے عقیدے – اور میرے خیال سے یہ تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے یا ہونا چاہیے – جس کا بیان بڑے آسان الفاظ میں قرآن میں ہے، ''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک قانون اور ایک کھلا راستہ دکھایا ہے۔ اگر خدا چاہتا تو وہ تم کو ایک واحد شخص بنا سکتا تھا، لیکن (اس کا پلان ہے) اس نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری جانچ کرنا : لہٰذا ایک نسل میں تمام خوبیوں کو تلاش کرو'' (سورۃ 5,51)۔ اور وہ اخیر میں اس بات کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس نے اپنا کام بہتر ڈھنگ سے انجام دیا۔

اس لیے، میں اپنی حد تک اپنے عقیدے کو رکھنے میں کوئی پریشانی محسوس نہیں کرتی اور نہ ہی مجھے یہ یقین کرنے میں کوئی دشواری ہے کہ آپ کا عقیدہ آپ کے لیے درست ہے۔ یہ صرف ایک خدا میں یقین رکھنے والے مذاہب کے لیے ہی صحیح محسوس نہیں ہوتا – اگر کوئی کسی دوسری چیز میں یقین رکھتا ہے تو ایسا عقیدہ رکھنا اس آدمی پر منحصر ہے کیوں کہ خدا نے اس آدمی کی تخلیق کی ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ دلیل پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور میرے خیال سے ہمیں ایسا کرنا بھی چاہیے۔ لیکن اگر ہماری پیدائش ایک عقیدے میں ہوئی

ہے، تو ہمیں یہ قبول کرنے کا حق حاصل ہے کہ ہمارا عقیدہ درست ہے؛ ساتھ ہی ہمیں یہ یقین کرنے کا بھی حق حاصل ہے کہ دوسروں کا عقیدہ ان کے لیے درست ہے۔ مجھے اس بات میں یقین رکھنے پر خوشی ہے کہ کوئی بھی شخص سچائی تک پہنچ سکتا ہے چاہے وہ کوئی بھی راستہ اختیار کرے۔ ایسے معاشرے میں زندگی گزارنا آسان ہوگا جہاں تمام لوگوں کے عقیدے کو قبول کیا جاتا ہے۔ لہٰذا، محبت کے ساتھ اپنے ذاتی مذہب پر اعتقاد رکھنے میں کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔

بنیاد پرستی – موجودہ دور میں ایک طاقت ور سیاسی تحریک

خیدیا طوف :

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بنیاد پرستی صرف ایک راستہ ہے؛ دراصل یہ ایک طاقت ور سیاسی تحریک ہے۔ ہم دو مین اسٹریم کا مشاہدہ کرسکتے ہیں : ایک سعودی عرب کے وہابیوں کی ہے اور دوسری افغانستان کے اسماعیلیوں کی۔ 1970 کے اخیر تک، بنیاد پرستی ایک بااثر طاقت نہیں بن سکی تھی۔ افغانستان پر روسی حملہ اور امریکہ کا ویت نام میں ہار کا بدلہ لینا، ان دونوں سپر پاور کی اس وقت کی آپسی جنگ نے اس تحریک کو فروغ دیا۔ اسی لیے میں یہ سوچتا ہوں کہ موجودہ دور اور زمانے میں بنیاد پرستی ایک خطرناک نظریاتی اور سیاسی تحریک بن چکی ہے۔

مختلف طاقتوں کے ذریعے اپنے سیاسی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے اس کا استعمال کیا جاتا ہے

اقبال :

میں نے پہلے ہی بیان کیا کہ بنیاد پرستی کا استعمال مختلف طاقتوں کے ذریعے اپنے سیاسی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے کیا جارہا ہے۔ تعلیم کے کاموں میں سے ایک، جس کا مقصد بنیاد پرستی پر قابو پانا ہے، یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اس قسم کے پروپیگنڈوں میں گرفتار ہونے کے خطرہ سے آگاہ کرے، جس کا ایک خفیہ ایجنڈا ہے اور وہ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنے صحیح

راستے پر گامزن ہے۔

کیا بنیاد پرستوں سے بات چیت ممکن ہے؟

خوری :

میں بنیاد پرستی کی مذہبی شکل کی طرف واپس جانا چاہتا ہوں، جس پر قابو پانے اور اس سے احتراز کرنے میں تعلیم کو ہماری مدد کرنی چاہیے؛ یہی اس کا مقصد ہے۔ لیکن انسانی عمل اور زندگی میں بھی بنیاد پرستی پائی جاتی ہے۔ اسی لیے، میرا سوال، جو ایک طویل عرصے سے میرے ذہن میں گھوم رہا ہے، درج ذیل ہے : کیا بنیاد پرستوں سے گفتگو ممکن ہے یا نہیں؟ اگر یہ ممکن ہے تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیسے اور کس طریقے سے۔ میرے ذہن میں صرف ایک خیال ہے : بنیاد پرست وہ عقیدت مند ہیں جو صرف اپنے عقیدہ کے اصول کو درست مانتے ہیں۔ دوسری جانب، اگر ہم درستگی کی بات کریں، تو یہ ہر ایک عقیدت مند کے لیے واضح ہونا چاہیے کہ صرف خدا ہی درست اور کامل ہے اور کوئی دوسرا شخص درستگی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا مجھے تشویش ہے کہ کیا یہ بنیاد پرستوں کے ساتھ گفتگو کرنے کا طریقہ بن سکتا ہے یا پھر ان کے ساتھ اس سے ٹکراؤ پیدا ہوگا۔

اقبال :

میرے پاس حالانکہ بہت محدود تجربہ ہے، لیکن میں نے پایا ہے کہ بہت سارے لوگ بنیاد پرستانہ سوچ اس لیے نہیں رکھتے کیوں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس ایک بیمار ذہن ہے یا کوئی وائرس آڑے آرہا ہے۔

ماضی قریب میں ایک دن مجھے پاکستانی حکومت کے پاپولیشن پلاننگ ڈویژن کے ذریعے مختلف مسجدوں کے 70 یا 80 اماموں اور مدرسہ کے استادوں سے بات کرنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ میں تھوڑی خوفزدہ تھی کیوں کہ، جیسا کہ پہلے کہا گیا، انھیں یہ یقین ہو سکتا تھا کہ ان کے پاس کامل سچائی ہے۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا کیا وہ اسے سنیں گے؟ لیکن اس کے بعد میں نے

سوچا کہ اگر میں وہاں نہیں گئی تو اس کا مطلب ہوگا کہ میں نے خود اپنے نظریہ کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے کوشش کرنی چاہیے اور ان کے ساتھ بات کرنی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی انسان ہیں اور تمام انسانوں سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور وہ یہ یقین نہیں رکھ سکتے کہ کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی۔ اور میں نے اپنی مشترکہ بنیادوں اور جس قسم کی اچھائی کی تبلیغ کی جارہی ہے، ان پر بات کرنا شروع کیا؛ یہ ان لوگوں تک پہنچ رہا تھا جن کے پاس گزر بسر کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، کیوں کہ وہ لوگ بھی اپنے بچوں کو کھانا، لباس اور مکان مہیا کرا رہے ہیں جن کے پاس آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے، اور وہ ان کی تعلیم وغیرہ کا بھی انتظام کر رہے ہیں۔ اور میں نے انھیں دیکھا کہ وہ ان دلائل کے تئیں پوری طرح کھلا ذہن رکھتے ہیں۔ شاید ہم بھی اس طرح بنیاد پرست ہیں کہ ہم یہ سوچتے ہیں کہ دوسرے لوگ، جن کے پاس الگ نقطۂ نظر ہے، وہ بات کرنے کے لائق نہیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ گفتگو کے لائق ہیں۔ دو یا تین گھنٹوں کے اس وقفہ کے دوران میں نے اس مجلس میں کوئی درشتی یا کسی قسم کی پریشانی محسوس نہیں کی۔ وہ صرف خیالات ونظریات کا تبادلہ کرنا چاہتے تھے۔ اور جب وہ وہاں سے رخصت ہو رہے تھے تو ان کی خواہش تھی کہ ہماری ملاقات دوبارہ ہو۔

بہت سے ممالک میں بدحال سیاسی اور اقتصادی حالات کے سبب ایسا ہوا

شبستری :

مذہبی بنیاد پرستی صرف حال کا مسئلہ ہے، جو کہ شاید گزشتہ 30 یا 40 سال سے پنپ رہا ہے۔ ہم بہت آسانی سے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اپنی روایتی زندگی جینا چاہتے ہیں اور مذہبی عمل پر قائم رہنا چاہتے ہیں - جیسا کہ ان کے والدین اور دادا پردادا نے پہلے کیا۔ لیکن اس حالیہ مذہبی بنیاد پرستی کو بنیاد پرستی کی دوسری قسم، جو کہ سیاسی تحریک ہے، سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

9/11 کے بعد بنیاد پرستی اور دہشت گردی پر ہونے والی تحقیق یہ ظاہر کرتی ہے کہ ماضی

کی اس روایت کا دہرایا جانا عام طور پر مختلف ممالک کی بدتر سیاسی اور اقتصادی حالت کی وجہ سے ہوا ہے جہاں پر بدقسمتی سے، اقتصادیات اور سیاسیات کے میدان میں جدید اصلاحی تحریکوں کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔ اسی وجہ سے ان ممالک میں بہت سے لوگ اپنے ماضی کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں، اور وہ اس طریقے سے احتجاج کرتے ہیں۔ ان کے ممالک میں نا موافق، غیر انسانی اقتصادی اور سیاسی حالات انھیں اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں دکھا پا رہے ہیں، اسی لیے کسی نہ کسی طریقے سے وہ ماضی کو واپس لانا چاہتے ہیں۔ اور امام حضرات ان کے اس نظریہ کی حمایت بھی کر سکتے ہیں۔

یہ بات سچ ہے کہ ہم ان بدتر حالات کا کچھ حد تک ازالہ تعلیم اور اس قسم کے دوسرے اقدامات کے ذریعے کر سکتے ہیں۔ لیکن ان ممالک کی مجموعی اقتصادی اور سیاسی حالت کو بدلنے کے لیے ایک مستحکم حل کی ضرورت ہے جس سے اس پریشانی کو دور کیا جا سکے۔ بالفاظ دیگر، تعلیم اس میں مدد کر سکتی ہے، لیکن یہ اتنی طاقت ور نہیں ہو سکتی کہ وہ مذکورہ بالا مسائل کو پوری طرح ختم کر سکے۔

دوسرا نقطہ، جو ذکر کرنے کے قابل ہے، وہ یہ کہ ان میں سے بہت سے لوگ جو دہشت گرد بن جاتے ہیں، وہ زندگی کا کوئی بھی مذہبی طریقہ نہیں جانتے۔ ان کی سوانح عمری اس بات کو واضح طور پر ظاہر کرتی ہے۔

ایک مذہبی جنگ — دراصل سماجی و اقتصادی تصادم کا الجھاؤ

اقبال :

میں اماموں کا ذکر تعلیم یافتہ افراد کے ایک زمرے کے طور پر کر رہی تھی، ان میں سے تمام تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ اور میں اس بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ بنیاد پرستی اور دہشت گردی کا سوال مذہبی سے زیادہ سماجی و اقتصادی ہے۔ لیکن میں یہ دیکھ سکتی ہوں کہ لوگ اپنے ماضی کی طرف کیوں لوٹ رہے ہیں یا وہ لوگ جو مذہبی نہیں ہیں، وہ کیوں دہشت گرد بن گئے ہیں : وہ شتر مرغ کی مانند ہیں جو اپنے سامنے پیدا ہونے والے حالات کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے

ریت میں اپنی گردن چھپانے میں لگے ہوئے ہیں۔ انھیں اس بات کا احساس ہے کہ انھیں محروم کر دیا گیا اور اس کے لیے وہ دوسرے لوگوں کو ذمہ دار مان رہے ہیں۔ جو چیز ہمیں ظاہری طور پر مذہبی جنگ دکھائی دیتی ہے وہ دراصل سماجی و اقتصادی تصادم کا الجھاؤ ہے۔

جس چیز کی ضرورت ہے، وہ ہے ایک دوسرے کے ساتھ باہم سرگرم رشتہ

بلا شبہ، ہماری دنیا میں آج بھی عدم مساوات سے نبرد آزما ہے۔ ان میں سے ایک جوہری ٹیکنالوجی کے سوال میں ظاہر ہے : ایک ملک کو اس کا حق حاصل ہے اور دوسرے ملک کو اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ لیکن A اور B میں فرق کیا ہے؟ وہ ملک جسے یہ حق نہیں دیا گیا ہے، کیا وہ ان دوسرے ممالک کے خلاف مخاصمت محسوس کرے گا جس نے اس سے یہ حق چھینا ہے؟ اس کا نتیجہ ردعمل کے طور پر سامنے آئے گا۔ اور میرے خیال سے اس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ باہم سرگرم رشتہ رکھیں، یعنی دوسروں کو نیچا کرنے کی بجائے ان کی اس بات میں حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کرنا کہ وہ بھی برابری کے درجے میں آجائیں۔

اس صورت حال پر قابو پانے کے لیے تعلیم کا رول

ماربو :

سماجی و اقتصادی اختلافات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تصادم کے بارے میں ہم نے جو کچھ کہا، اس سلسلے میں ہمیں اس صورت حال پر قابو پانے کے لیے تعلیم کے رول پر خاص توجہ دینی ہوگی۔ یہاں پر ایک بار پھر رسائی کی صحیح تقسیم نہایت اہمیت کی حامل ہے — جیسا کہ میرے مقالے میں غذا تک رسائی کے معاملے میں تھیم تیار کیا گیا تھا۔ تمام لوگوں کی تعلیم تک رسائی کو کیسے نافذ کیا جا سکتا ہے؟ جیسا کہ میں دیکھتا ہوں، یہ صرف پیسہ کا سوال نہیں ہے۔ بعض دفعہ یہ روایت کا مسئلہ بھی ہوتا ہے کہ تعلیم تک مساوی طور پر عورتوں کی رسائی نہیں ہوتی۔ ہم اس صورت حال میں بہتری کیسے لا سکتے ہیں؟ متعدد اسباب کی بنا پر، یہاں تک کہ

مغربی ممالک میں بھی، لڑکیوں کو بارہا مناسب تعلیم سے دور رکھا جاتا ہے۔ مذہبی خیالات کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔

ادراک میں تبدیلی آرہی ہے

اقبال :

واقعی، یہ مضبوطی کے ساتھ مذہب سے جڑا ہوا ہے۔ کیا اب تک انسان نے اس حقیقت کا فائدہ اٹھایا ہے کہ عورتیں جسمانی طور پر کمزور ہوتی ہیں؟ میرے خیال سے ملینیم کے اس موڑ پر لوگوں کے ادراک میں تبدیلی آرہی ہے۔ خود میرے ملک میں بھی کسی زمانے میں ایسی صورت حال تھی کہ عورتیں بری طرح سے دبی کچلی تھیں، لیکن اب میں مثبت سوچ رکھتی ہوں۔ فی الحال ہمارے ملک کی پارلیمنٹ میں 20 فیصد اور علاقائی حکومت میں 30 فیصد عورتوں کی نمائندگی ہے۔ عورتوں نے اپنے پڑوس میں رہنے والی عورتوں کی مدد کرنے کے لیے سب کچھ کیا ہے۔ جہاں کہیں بھی ترسیل ممکن ہے، تعلیم کا انتظام کیا جارہا ہے۔

قبائلی علاقے اپنے قانون کو نافذ کرسکتے ہیں

صالحہ ایس محمود :

سب سے پہلے میں پروفیسر خید یاطوف کی بار بار دی جانے والی وارننگ کہ بنیاد پرستی اور مخصوص تحریکوں، جیسے افغانستان میں طالبان وغیرہ، پر ایک تبصرہ کرنا چاہوں گی۔ میں اس حقیقت کو یاد کرنا چاہتی ہوں کہ وسطی ایشیا کے بہت سے ممالک، جیسے افغانستان، بلوچستان قبائلی علاقے ہیں، جہاں پر کوئی بھی سول قانون نافذ نہیں ہوسکتا، اس کے برخلاف وہ لوگ خود اپنا قانون نافذ کرتے ہیں۔ لہٰذا وہاں پر جو کچھ ہورہا ہے وہ بہت ہی انوکھا ہے۔ ایک یہودی پروفیسر، جو 'اسرائیل کے گم شدہ قبائلیوں' کی تلاش کررہے تھے، انھوں نے کہا کہ انھیں یہ قبائلی افغانستان اور بلوچستان میں ملے۔ انھوں نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ اصلی افغانی افغانستان میں روایتی یہودی قانون کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں، وہ اسرائیل کے گم شدہ قبائلیوں کی اولاد ہیں۔

ہر جگہ 'دوسروں' کے لیے وہی نفرت

بنیاد پرستی کسی نہ کسی طرح تمام مختلف عقائد موجود ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں دوسرے مذاہب کے مطالعہ میں دلچسپی ہوتی ہے، کیوں کہ خود ان کے مذہبی فرقے کا تجربہ انھیں یہ بتاتا ہے کہ جس کیڑے کو بنیاد پرستی کہا جاتا ہے، اس سے وہ کس حد تک متاثر ہیں۔ پروٹیسٹینٹ یہ جانتے ہیں کہ کیتھولکس کو اخیر میں دوزخ میں جانا ہوگا اور اسی طرح کیتھولکس پروٹیسٹینٹ کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ہر جگہ 'دوسروں' کے لیے یہی نفرت اور تحقیر ہے۔

پیشہ ورانہ تعلیم اکثر بنیادی اقدار سے غفلت برتتی ہے

دوسرا نقطہ، جس کا میں ذکر کرنا چاہتی ہوں، اس کا تعلق ہمارے تعلیمی نظام سے ہے۔ وہ تمام خوبیاں جن کا ذکر محترمہ اقبال کے مقالہ میں ہوا، واقعی وہ تمام نوجوانوں میں ہونی چاہئیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام میں، ہم اس بات کے لیے وقت نہیں نکالتے یا اس کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان خوبیوں کی تعلیم دیں کہ شادی کرنے کے بعد آپ اپنی ذمہ داریوں کو کیسے قبول کریں گے، خاندانی زندگی کو کیسے قائم کریں وغیرہ۔ اسی طرح ہمیں کبھی بھی یہ نہیں سکھایا گیا کہ اچھا شہری کیسے بننا ہے، ہم صرف یہ یا وہ بننے کے بارے میں تصور کر لیتے ہیں، لیکن ان خوبیوں کو سیکھنے کے لیے ہم کبھی بھی اسکول نہیں جاتے۔ ہم اپنے تعلیمی نظام میں جس بات پر سب سے زیادہ توجہ دیتے ہیں وہ یہ کہ انھیں ایک بہتر سے بہتر تاجر عورت بنانے کے لیے ٹریننگ دیں، بہتر سے بہتر ڈیزائنر وغیرہ بنائیں۔ اسکول پیشہ ورانہ ٹریننگ کے مرکز بنتے جارہے ہیں؛ ہم صرف اچھے تجارتی لوگ پیدا کررہے ہیں، لیکن ہم بنیادی اقدار اور اصولوں کی اندیکھی کررہے ہیں جو ہمیں ایک اچھا شہری بناتے ہیں۔

کچھ منظم قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے

اقبال :

یہ سچ ہے کہ ہمیں استادوں کو منظم تعلیم دینے کے لیے ٹریننگ دینی چاہیے اور صرف یہ

نہیں کہ وہ نوجوان لوگوں کو اچھا پیشہ ور اور اچھا تاجر بننے کی تعلیم دیں۔ ان کی زندگی میں ذاتی دلچسپی پر زیادہ زور نہیں دینا چاہیے؛ وہ جس پیشہ کو بھی اختیار کر رہے ہیں اس میں پیشہ ورانہ اخلاقیات اور انسانیت کو شامل کیا جانا چاہیے۔ 'تیل کے بدلے غذا' کے پروگرام کے نتائج کو ہی دیکھ لیجیے، اس نے دہشت گردی کو جنم نہیں دیا ہے تو کسے جنم دیا ہے؟ آپ کا بچہ مر رہا ہے کیوں کہ آپ کے پاس کوئی دوا نہیں ہے، کسی قسم کی طبی سہولیات موجود نہیں؛ آپ کو صرف کھانا دیا جا رہا ہے، اور آپ کے سب سے قیمتی اقتصادی اثاثہ کو آپ سے چھینا جا رہا ہے۔ کوئی دوسرا شخص صرف اسلحوں کے بل بوتے پر آپ پر حکومت کر رہا ہے۔ ہم تمام لوگ اکٹھے کیوں نہیں ہو سکتے اور کچھ ایسا طریقہ ایجاد نہیں کر سکتے جس کو تمام ممالک اپنے استادوں کی ٹریننگ میں استعمال کر سکیں، تاکہ وہ استاد اس لائق ہو پائیں کہ وہ بچوں کو وہی بنیادی اخلاقیاتی کثرتی نظریہ سکھا پائیں؟

عورتوں کا کم تر مقام عام طور پر مذہب کی وجہ سے رونما ہوتا ہے

طاہر محمود :

میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں اس کا اطلاق یکساں طور پر دنیا کے بیشتر ممالک پر ہوتا ہے اور خاص کر مشرقی ممالک پر۔ اگر میں نے اسے صحیح طور پر سمجھا ہے تو یہ پہلے بھی کہا گیا تھا کہ تعلیم کے میدان میں عورتوں کا کم تر مقام مذہب سے جڑا ہوا نہیں ہے۔ میں اس کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتا : اس کا مذہب کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے، یہاں تک کہ یہ مذہب کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

مذہبی مبلغین مسجد کے امام کی طرح ہی، وہ لوگ ہیں جو یہ پریشانیاں کھڑی کرتے ہیں، جنھوں نے صورت حال کو سنگین بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم پاکستان کی طرف دیکھیں تو اس کی شروعات فاطمہ جناح جیسی بڑی لیڈروں سے ہوئی، جنھیں وجود میں آنے والے اس نئے ملک کے ذریعے مادرِ پاکستان کا درجہ دیا گیا۔ اور اسی ملک میں آج مختار مائی کا معاملہ ہمارے سامنے ہے۔ اس خاتون کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی وجہ سے پوری دنیا میں اس ملک کو

ذلیل ہونا پڑا۔ لیکن ساتھ ہی پاکستان میں حقوق انسانی کے سرگرم کارکن بھی موجود ہیں۔ یہ زیادہ تر معاشروں پر صادق آتا ہے، ہندوستان کے لیے بھی یہ سچ ہے، جہاں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ مذہب اور اس قسم کی سماجی تحقیر میں کوئی رشتہ نہیں ہے، میں ذاتی طور پر اس سے اتفاق نہیں کرتا۔

خود ساختہ ترجمان بڑی پریشانیاں کھڑی کرتے ہیں

کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ یہ خود ساختہ ترجمان – جنھیں لوگ اپنے اپنے انداز میں مذہبی لیڈر کہہ سکتے ہیں – اپنے پیروکاروں کو جمعہ کے خطاب میں یہ کہتے رہتے ہیں کہ ''یہاں دیکھو، تمہارا مذہب ہی سچا مذہب ہے، اور دوسرے تمام مذاہب باطل ہیں۔ تم انھیں برداشت کر سکتے ہو، لیکن جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو انھیں اپنے برابر مت سمجھو۔ اور اس سچے مذہب میں بعض مخصوص خاصیتیں ہیں، ان میں سے ایک خاصیت یہ ہے کہ عورتیں مردوں کے برابر نہیں ہو سکتیں، اور اس میں عورتوں کے لیے حتمی طور پر کوئی جگہ نہیں ہے۔'' اس کا اظہار عمل سے بھی ہوتا ہے، عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت نہیں ہے؛ اگر وہ مسجد میں جاتی ہیں تو انھیں ایک الگ گوشے میں عبادت کرنی پڑتی ہے۔ حال ہی میں کچھ عورتوں نے صرف اپنے لیے مسجد تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے۔

میرے خیال سے ہمیں اس بارے میں کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح سے جمعہ کا خطبہ اس زبان میں دیا جاتا ہے جسے شاید بہت سے لوگ نہیں سمجھتے، لیکن جو بہت انوکھا طریقہ بن چکا ہے، جس طرح سے امام حضرات مدرسوں میں طلبا کو اسلامی مذہب کے بارے میں پڑھا رہے ہیں، اس دعوے کے ساتھ کہ اسلام ایک کامل مذہب ہے، قرآن کی ان آیات کے ساتھ کہ مرد اپنی بیویوں کی پٹائی کر سکتے ہیں (cf. Quran 4,34) – ان تمام چیزوں کو روکنا ہوگا۔

عورتوں کو اپنے ان حقوق کو بحال کرنا ہوگا جو درحقیقت اسلام نے انھیں اس وقت عطا کیے جب دوسرے مذاہب اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اگر ہم ان حقوق پر

نظر ڈالیں جو پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو دیے، وہ اپنے دور سے 1000 سال آگے تھے۔ لیکن وہ 1000 سال گزر چکے ہیں اور آج بھی مسلم خواتین کی زبوں حالی سب کے سامنے ہے اور اس کا 'کریڈٹ' صرف اماموں کو جاتا ہے۔

اقبال :

یہ مذہب کا قصور نہیں ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ امام حضرات ناخواندہ ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ مذہب کیا ہے، وہ خود ساختہ ہیں : کسی نے بھی انھیں یہ حق نہیں دیا ہے، انھوں نے یہ حق خود اپنے آپ ہی حاصل کر لیا ہے۔

لیکن نجات کی صورت بھی ہے - مختار مائی کا واقعہ

لیکن نجات کی بھی صورت موجود ہے، مثال کے طور پر مختار مائی (یا مختارن [بی بی]) کی کہانی۔ یہ وہ عورت ہے جس کی اجتماعی عصمت دری جرگہ (پٹھانوں کی قبائلی اسمبلی) کے حکم سے کی گئی - جو کہ پوری طرح غیر مذہبی، غیر اسلامی، اسلام کے ذریعے ممنوع ہے۔ اس معاملے میں اس جگہ کی مسجد، جہاں پر مختار مائی رہتی تھیں، کے امام کے ذریعے فرقے کے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ ''ہمیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا یہ وہی ہے جس کی تعلیم ہمیں مذہب دیتا ہے، کہ جرگہ نے یہ حکم دے دیا کہ اس عورت کی اجتماعی عصمت دری ہونی چاہیے؟ کیا ہم کھڑے ہو کر یہ سب تماشہ دیکھتے رہیں گے؟'' اس پورے معاملے کی خبر پاکستان کے صدر کو معلوم ہوئی اور چیف جسٹس کو بھی اور پھر اس معاملے میں کوکار روائی شروع ہوئی۔

مختار مائی، حقوق نسواں کی ایک علامت

مختار مائی اب حقوق نسواں کی ایک علامت بن چکی ہیں۔ ان کے ساتھ جو کچھ زیادتی ہوئی وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ ہر جگہ جاتی ہیں اور اپنے ملک کی عورتوں کے بارے میں باتیں کرتی ہیں؛ انھوں نے چندہ جمع کر کے اپنی ہی کمیونٹی میں ایک اسکول لڑکیوں کے لیے اور ایک اسکول لڑکوں کے لیے بنوایا ہے، اور ان کے پاس ان لوگوں کے بچے ہیں

جنھوں نے انھیں یہ سزا دی تھی، یہ بچے ان کے اسکول میں آتے ہیں کیوں کہ وہ یہ محسوس کرتی ہیں کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ سب تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہوا۔ انھوں نے اب ایک ہائی اسکول کھول دیا ہے اور اب وہ ایک کالج بھی کھولنے جا رہی ہیں۔ اس کہانی سے ہم نجات کی بہت سی شکلیں دیکھتے ہیں، تشدد کے خلاف ردعمل ایک امام کی طرف سے ہوا اور آج ذلت کا شکار مختار مائی فروغ تعلیم کے جدوجہد کر رہی ہیں۔

لہٰذا وہ ایک رول ماڈل ہیں۔ اپنے ابھرنے کی قوت سے وہ اس حالت پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ ہم اپنے آپ کو اماموں کے حوالے نہیں کر سکتے بلکہ ہمیں انھیں ٹھیک کرنا ہوگا۔ اور میں جہاں کہیں بھی جاتی ہوں جزوی طور پر اسی کی وکالت کرتی ہوں، یعنی تمام مساجد اور مدارس کو قانون وضابطہ کے تحت لانا چاہیے اور ان میں سیکولر اسکولوں کی طرح نصاب کو نافذ کیا جانا چاہیے۔ یہ ہندوستان میں زیادہ مشکل ہو سکتا ہے کیوں کہ وہاں پر اکثریت کا عقیدہ یہ نہیں ہے۔ لیکن مجھے کوئی ایسی دلیل سمجھ میں نہیں آتی کہ پاکستان میں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ اماموں کو تعلیم یافتہ بنایا جائے اور ان کے اندر مذہب کی بنیادی فہم وفراست پیدا کی جائے اور پورے نصاب کی تجویز بھی پیش کی جائے۔ میں نے وفاق المدارس کا رکن بننے کی بھی کوشش کی ہے۔

دوسرے سوال کی وضاحت کرنا بھی باقی ہے : پاکستان میں لڑکیوں کے مدرسے بھی ہیں۔ آپ کو ایسے مدرسے ملک کے ہر کونے میں ملیں گے۔ لیکن جب میں وہاں گئی تو مجھے یہ دیکھ کر کافی حیرانی ہوئی کہ انھیں کیا پڑھایا جا رہا ہے : دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ انھیں حضرت محمدؐ کی بکریوں کے نام یاد کرنے پڑتے ہیں اور ان کی گایوں کے نام بھی۔ لہٰذا میں نے پوچھا کہ اس کے ساتھ یہ نوجوان لڑکیاں کیا کریں گی؟ میں ان لڑکیوں کو سلائی مشین دینا چاہتی ہوں تا کہ وہ یہ سیکھ سکیں کہ سلائی کیسے کی جاتی ہے؛ میں چاہتی ہوں کہ انھیں نرسنگ وفرسٹ ایڈ وغیرہ کی ٹریننگ دی جائے، میں یہی سب کرنے کی کوشش کر رہی ہوں : وفاق المدارس کے ساتھ بات کرنا چاہتی ہوں۔

گول میز کے شرکاء

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر عائشہ بیلا ربی

فیکلٹی سائنسی علوم، رباط، مراقش

سابق سکریٹری آف اسٹیٹ حکومت مراقش، رباط، مراقش

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر اندریاس بشتیہ

ناظم اعلی، ادارہ دینیات ومذاہب، سینٹ گیبریل، موڈلنگ، آسٹریا

۳۔ پروفیسر ڈاکٹر انگیبورگ گیبریل

شعبۂ اخلاقیات وسماجیات، ادارہ کیتھولک دینیات، جامعہ ویانا، آسٹریا

۴۔ بیگم ناصرہ اقبال

رکن عدالت ومعلم قانون، لاہور، پاکستان

۵۔ پروفیسر ڈاکٹر گوگا ابرار وش خیدیاطوف

جامعہ عالمی معاشیات وحکمت عملی، تاشقند ازبکستان

۶۔ فضیلت مآب عروس البلادی جارج خضر

اسقف اعظم، یونانی قدیمی سقفہ برائے بعلوز ور بوترز (جبل لبنان) برومانا، لبنان

۷۔ پروفیسر ڈاکٹر عادل تھیوڈورخوری

شعبۂ کیتھولک دینیات، جامعہ منستر، منستر، جرمنی

۸۔ پروفیسر ڈاکٹر صالحہ محمود

جامعہ سلطان عبدالعزیز

ناظم اعلیٰ ومدیر خاص، ادارہ امور مسلم اقلیات، جدہ، سعودی عرب

۹۔ پروفیسر ڈاکٹر طاہر محمود

صدر، ادارہ عالیہ علوم قانون، دانش گاہ ایمیٹی، نئی دہلی، ہندوستان

سابق صدر، قومی اقلیتی کمیشن ورکن قومی حقوق انسانی کمیشن حکومت ہند

۱۰۔ ڈاکٹر ارمگارڈ مار بو

ادارہ قانون وبین الاقوامی روابط، جامعہ ویانا، آسٹریا

۱۱۔ پروفیسر ڈاکٹر رچرڈ پوٹز

شعبۂ قانون ومذاہب، ادارہ قانون، جامعہ ویانا، آسٹریا

۱۲۔ محمد مجتہد شبستری

سینٹر فار گریٹ اسلامک اینسائکلو پیڈیا، تہران یونیورسٹی، ایران